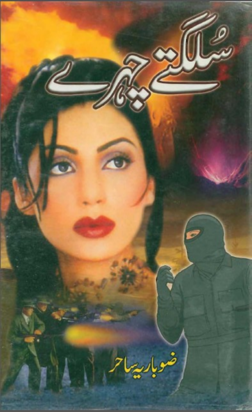
سلگتے چہرے
ضوباریہ ساحر

سلگتے چہرے

ضوباریہ ساحر

پبلیکیشنز
کمرہ نمبر 4 فرسٹ فلور راجپوت مارکیٹ
اردو بازار لاہور Ph:7311985
Aftabpublication@hotmail.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر : آفتاب ہاشمی
مصنف : ضوباریہ ساحر
قانونی مشیر : محمد اسلم شیخ ایڈووکیٹ ہائیکورٹ
قیمت : =/150 روپے

اسٹاکسٹ

الفیصل ناشران وتاجران کتب غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
روبی پبلی کیشنز راجپوت مارکیٹ اردو بازار لاہور
مجید بک ڈپو اردو بازار لاہور امین پور بازار فیصل آباد
المصطفیٰ پلازہ راولپنڈی
صابر اکیڈمی اینڈ بکسٹال
چوک میو ہسپتال نسبت روڈ لاہور
شائلہ بک ایجنسی
چوہدری پارک، دربار بابا بجلی شاہ سٹریٹ نوبہ ٹیک سنگھ
خزینہ علم وادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور
حق پبلیکشنز
2-A سید پلازہ چیٹر جی روڈ، اردو بازار لاہور

انتساب:-

محبت کی اس تکون کے نام
جس سے میری زندگی مشروط ہے۔
ماں ' شریک زندگی ' گڑیا۔

جسم کو جھلسا دینے والے لو کے تھپیڑے اسے سخت اذیت میں مبتلا کیے دے رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا۔ شاہِ خاور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس نے اپنی بوسیدہ چادر کے پلو سے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑی فائل کو بائیں ہاتھ میں منتقل کیا۔

"کب تک؟ آخر کب تک ایسا چلے گا؟" اس کا ذہن یہ سوچ کر کراہ اٹھا تھا۔ ہر روز ماں کی منتظر نظریں اسے چوکھٹ کے اس پار نظر آتی تھیں اور اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ یہ دہلیز پار کرنے سے پہلے اس دنیا کا آخری کنارہ، آخری سرحد ہی عبور کر جائے۔ بسا اوقات زندگی عجیب عجیب کھیل کھیلتی ہے لیکن کیا جو کچھ ہو رہا تھا یہ سب ضروری تھا۔ پرس میں موجود پانچ روپے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ اس کی ٹانگیں مسلسل چلنے کی باعث شل ہو چکی تھیں۔ سواری لینا چاہتی تھی لیکن کرائے کے پیسے نہ ہونے کے باعث پیدل ہی گھر تک کا راستہ طے کرنا تھا۔ بھوک کی شدت سے آنتوں میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ اس کا وجود دہائی دے رہا تھا لیکن صرف ایک چیز تھی جو اسے چلتے رہنے پر اکسا رہی تھی اس کا حوصلہ، اس کا عزم۔ اپنے گھر کی طرف جانے والی گلی میں قدم رکھتے ہی ہمیشہ کی طرح کوڑے کے ڈھیروں اور گندی نالیوں نے اسے خوش آمدید کہا اور وہ حسبِ معمول گردن نیہوڑائے اردگرد کے ماحول کو تمسخر نظر انداز کرتی ہوئی گلی کے کونے سے پچھلی ہوئی تیسرے دروازے پر آ کر رک گئی۔ دستک دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ نیم وا دروازے کا پٹ کھولتی صحن میں آ گئی۔ صحن کسی بیوہ کی مانگ کی طرح اجڑا ہوا تھا۔ گھر بھر پر عجیب سا سوگ طاری تھا اور یہ سوگ تو جیسے اس گھر کے بھاگوں میں لکھ دیا گیا تھا۔

وہ مختصر سا صحن عبور کر کے اکلوتے کمرے میں داخل ہوئی۔ حسبِ معمول دروازے کے بائیں جانب بچھی چارپائی پر اماں سر منہ لپیٹے پڑی تھیں۔ شاید اپنی بیٹی کی آج بھی ناکام واپسی کا یقین تھا انہیں۔ گڈو اور ماہین کمرے کے وسط میں بیٹھے نہ جانے کون کون سے کاٹھ کباڑ اکٹھے کیے کھیل رہے تھے۔ راحین اور شاہین دروازے کے سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھیں شاید سکول کا کام کر رہی تھیں۔

کمرے میں پانچ نفوس کی موجودگی میں بھی مثل مرگ خاموشی طاری تھی۔ سب سے پہلے سات سالہ ماہین کی نظر اس پر پڑی۔

"نور آپی آ گئیں۔ نور آپی آ گئیں۔" ماہین بھاگ کر اس سے آ لپٹی۔ اس نے دھیرے سے اس کے گال تھپتھپائے۔ آگے بڑھتے ہوئے قدرے نڈھال سے انداز میں سلام کر کے اس نے فائل میز پر رکھی اور خود چارپائی پر جیسے ڈھے سی گئی۔

"شاہین۔ اٹھو بہن کو روٹی لا کر دو۔" اماں نے چہرے پر سے دوپٹہ ہٹا کر نہیں دیکھا۔ یوں ہی چہرہ ڈھکے ڈھکے بولیں۔

"اچھا اماں" شاہین نے ہاتھ میں پکڑی کاپی ایک طرف رکھی اور اٹھنے لگی۔

"رہنے دو شاہین۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔ جب بھوک لگے گی تو میں خود نکال لوں گی۔" اور نور نے شاہین کو اٹھنے سے منع کیا اور پھر خود خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ صحن میں لگے ہوئے نل سے ہاتھ منہ دھوئے۔ وہ لاکھ چاہتی تھی کہ اردگرد کے ماحول کو اپنے حواسوں پر طاری نہ ہونے دے لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ پچھلا ایک سال اذیت کا دہکتا مرحلہ تھا جس پر چلتے چلتے اس کی روح بھی آبلہ زدہ ہو چکی تھی۔ اسے اپنی ذات کی کوئی فکر کوئی چنتا نہیں تھی لیکن ابو جی نے قبل از وقت جو ذمہ داری اس کے ناتواں کندھوں پر ڈال دی تھی۔ وہ خود کو اس ذمہ داری کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔ ابھی تو وہ خود فرمائشیں کیا کرتی تھی اور اب تین بہنوں اور ایک بھائی کا مستقبل اس سے قربانی کا طلب کر رہا تھا۔ اسے اپنی خواہشات کا خون کر کے اپنے سے منسلک افراد کو خوشیاں دینی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی اس تن تنہا یہ بوجھ نہیں سہار سکتی۔ پچھلے وقتوں میں آٹھ مرلے پر تیار کیا یہ مکان نہیں ابو جی کے رخصت ہونے کے بعد بے اماں بے سائباں ہونے سے تو بچا گیا تھا لیکن دیگر ضروریات کے عفریت منہ پھاڑے جب سامنے آ کھڑے ہوئے تو اماں کی پریشانی دیدنی تھی۔ دھیرے دھیرے جمع پونجی روزمرہ اخراجات کی نذر ہو گئی اور آخر کار دو دکانوں کا کرایہ اور پنشن کے چند روپے تھے جو انتہائی بنیادی ضروریات کے لیے بھی بمشکل ہی پورے ہو پاتے تھے۔ اماں پرانی وضع داریاں نبھانے کی قائل تھیں۔ سو اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی اچھی تعلیم اور اچھے مستقبل کی خاطر ماہ نور کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ کر جب اس نے عملی میدان میں قدم رکھا تو اسے علم ہوا کہ زندگی کا مشکل ترین دور تو اب شروع ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

رات اپنے پورے جوبن پر تھی اس نے صحن میں بچھی چارپائیوں پر محو استراحت نفوس کی

جانب دیکھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ابو جی! زندگی آپ کے بغیر اس قدر کٹھن ہو گی یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا بلکہ آپ کی جدائی کا سانحہ ہی ہمیں بے موت مار گیا۔ زندگی کا یہ پل صراط کس طرح عبور ہو گا؟ ابھی تو ابتداء ہے۔ میں ان ننھی منی آنکھوں میں سجے خوابوں کی امین بن گئی ہوں۔ آج پتہ چلا کہ ماں باپ کی آنکھوں کی نیند بیٹیوں کی پیدائش کے بعد مسافر کیوں ہو جاتی ہے۔ ابو جی میرے حق میں دعا کیجئے کہ پروردگار مجھے اس امتحان میں سرخرو کرے۔"

"ماہ نور" اماں نے کروٹ بدلی تو آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے اسے چارپائی پر یوں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے دیکھا تو پکار لیا لیکن ماہ نور خیالات کی یلغار کے زیر اثر تھی سو اماں کی نحیف سی آواز نہ سن پائی۔

"نور بیٹا ... کیا بات ہے؟ تم سوئیں نہیں" اب کہ اماں قدرے اونچی آواز میں بولی تھیں۔ ماہ نور نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔

"اماں ... نیند نہیں آ رہی۔" لہجے میں تردد اور بے بسی کے ملے جلے تاثر نے اماں کو بھی افسردہ کر دیا۔

"بیٹا چاروں قل پڑھ کر اپنے اوپر پھونکو اور دائیں کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرو۔ آ جائے گی نیند۔" وہ اماں کی بات پر پھیکا سا مسکرا کر رہ گئی۔

"میری بھولی اماں ... میں خود غرض نہیں، پریشان ہوں۔ اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھا تو سکتی ہوں لیکن سوچتی ہوں کہ اگر نااہل ثابت ہوئی تو کیا ہو گا؟" وہ سوچ رہی تھی۔ سحری کا تارہ آسمان پر نمودار ہو چکا تھا جب دھیرے دھیرے اس کی پلکوں پر نیند کے موتی چمکے۔ پھر اس کی آنکھ بچوں کی ہڑبونگ سے کھلی۔ سب اسکول کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور اماں رسوئی میں ناشتے کی تیاری میں مگن تھیں۔ اس نے چارپائی اٹھا کر برآمدے میں بچھائی اور منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ دوپٹے سے منہ خشک کرتے ہوئے وہ رسوئی کی جانب آ رہی تھی جب اس کے کانوں میں گڈو کی بسورتی ہوئی آواز آئی۔

"اماں ... میں نے گھی والی روٹی نہیں لینی ہے اور مجھے لنچ کے لیے چپس بنا کر دیں۔"

"کہاں سے ... گھی تو کل کا ختم ہوا پڑا ہے۔ مہینے کے آخری دن ہیں بیٹا دو چار دن اور صبر کر لو اور چپس کے لیے آلو بھی نہیں ہیں گھر میں۔"

"تو پھر میں آج سکول ہی نہیں جاتا۔" وہ پاؤں پٹختا ہوا رسوئی سے باہر نکلا۔

"کیا بات ہے گڈو؟ کیوں ناراض ہو رہے ہو؟" ماہ نور نے آگے بڑھ کر گڈو کا بازو تھاما۔

"جب ابو جی زندہ تھے تو ہر روز گھی والے پراٹھے پکتے تھے۔ میں لنچ میں ہر روز چپس، فرنچ

ٹوسٹ اور کیا کیا لے کر جاتا تھا اور اب کئی کئی دن پراٹھوں کی شکل دیکھنے کو نہیں ملتی اور لنچ تو دور کی بات جیب خرچ تک نہیں ملتا۔'' وہ گڈو کی معصوم شکایات سن رہی تھی اور دل تھا کہ خون کے آنسو رو رہا تھا۔

''بیٹا...... آزمائش کے دن ہیں۔ کچھ برداشت اور صبر کی عادت ڈالنی پڑے گی۔ میں جانتی ہوں تم آزمائش، صبر اور برداشت کے مفہوم سے ناآشنا ہو لیکن بیٹا زندگی میں آنے والی ہر تبدیلی کو سہنا پڑتا ہے۔'' ماہ نور جانتی تھی کہ یہ باتیں نو سالہ گڈو کے ذہن پر سے گزر رہی تھیں لیکن وہ ایسے الفاظ نہیں جانتی تھی جن سے اس معصوم کو سمجھایا جائے کہ جب ناز اٹھانے والے نہ رہیں تو اپنا مقام بھول جانا پڑتا ہے۔

''میں کچھ نہیں جانتا...... بس میں سکول نہیں جاؤں گا۔'' گڈو کی ایک ہی رٹ تھی۔

''دیکھو گڈو تم پڑھو گے نہیں تو بڑے آدمی کیسے بنو گے۔ میرے منے سے بھائی ہم بہنوں کا اور اماں کا تم واحد سہارا ہو۔ تم پڑھ لکھ کر کسی اونچے مقام پر پہنچو یہ ہم سب کا مشترکہ خواب ہے۔ وعدہ رہا کل سے گھی والے پراٹھے پکیں گے اور تمہیں لنچ بھی ملے گا تاکہ ریسس آور میں تمہیں اپنے دوستوں کے سامنے کسی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن گڈو آئندہ یہ مت کہنا کہ میں نے سکول نہیں جانا۔ اب اچھے بچوں کی طرح ناشتہ کرو اور سکول جاؤ شاباش۔''

ماہ نور کی باتیں کسی حد تک گڈو کی سمجھ میں آ گئیں۔ وہ واپس رسوئی میں گیا۔ ٹھنڈی چائے کا پیالہ ایک ہاتھ میں لیا اور خشک روٹی کے چند لقموں کے ساتھ ختم کر کے سکول جانے کے لیے اٹھ گیا۔

ماہ نور بھی اماں کے قریب پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''ماہ نور بیٹا یہ سب تو بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔'' اماں نے چھابے میں روٹی رکھ کر اس کی طرف بڑھائی اور پیالے میں چائے ڈالتے ہوئے بولیں۔

''اماں...... کل میرے کالج کی ایک دوست افشاں ملی تھی اس کی کسی جاننے والی کا بوتیک ہے انہیں سیلز گرل کی ضرورت ہے۔ آج وہاں جا کر دیکھتی ہوں شاید کام بن جائے۔''

''بیٹا تمہارے ابو زندہ ہوتے تو یہ دن کبھی نہ دیکھنے پڑتے۔ آج تک ہمارے خاندان میں کسی لڑکی نے نوکری نہیں کی۔ تمہارا یوں گھر سے جانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' اماں کی اسے آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ ایک طرف تو وہ موجودہ حالات سے شدید پریشان تھیں دوسری طرف اس کا گھر سے قدم باہر نکالنا بھی انہیں شاق گزر رہا تھا۔ وہ ماں کے احساسات کو سمجھتی تھی اگر خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچتی تو انہیں حق بجانب سمجھتی تھی۔ ایک ماں کی جوان بیٹی تلاش معاش میں سارا سارا دن سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتی پھرے یہ وہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔

''اماں...... بوتیک قدرے محفوظ جگہ ہے اور یوں بھی اس میں عورتوں کا ہی سارا عمل دخل ہوتا ہے آپ بس دعا کریں۔''

اس نے ایک نظر ماں کے متردد چہرے کو دیکھا اور ایک تسلی آمیز مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اماں آپ مجھے بیٹی سمجھنا چھوڑ دیں۔ یوں سوچیں کہ آپ نے ایک نہیں دو بیٹوں کو جنم دیا ہے اور پریشان مت ہوا کریں۔ بس دعا کریں کہ جو ذمہ داری خدا نے میرے سپرد کی ہے میں وہ پوری کر سکوں۔''

''اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا اور میری دعائیں کس کے لیے ہیں۔'' اماں نے دھیرے سے اس کی صبیح پیشانی چوم لی۔ اب جو بھی تھا اسے کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا تھا۔ وہ نہ تو لوگوں میں اپنا بھرم کھو دینا چاہتی تھی اور نہ ہی اپنے بہن بھائیوں کو خاروخس کی طرح حالات کے دھاوے پر بہنے کے لیے اکیلا چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھیں روشن کل کے سپنے دیکھ رہی تھیں جب اس کے سب گھر والے ایک مطمئن اور شاد زندگی گزار رہے ہوں گے۔ اس کا اکلوتا بھائی کسی اونچی پوسٹ پر ہو گا اور وہ فخر سے سب کو بتا سکے گی کہ دیکھو میری کوشش اور محنت رنگ لائی اور آج میں نے وہ سب پا لیا جس کا کبھی خواب دیکھا تھا لیکن اس خواب کی حقیقت پانے کے لیے ایک جہد مسلسل کرنا تھی اسے۔ ناشتہ کر کے دوسرے کمرے میں تیار ہونے چلی گئی۔ راہین خود سکول کے لیے تیار ہونے کے بعد ماہین کو تیاری میں مدد دے رہی تھی۔

''شاہین کہاں ہے؟'' ماہ نور نے کمرے پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپی وہ تو سکول چلی گئی۔'' راہین اب ماہین کا بیگ چیک کر رہی تھی۔

''تم دونوں ساتھ کیوں نہیں جاتیں؟''

''آپی دراصل شاہین کے بورڈ کے ایگزام ہونے والے ہیں اس لیے اسمبلی سے پہلے ان کی میتھ کی ٹیچر ان کا ایکسٹرا پیریڈ لیتی ہیں۔ اس لیے شاہین کو جلدی جانا پڑتا ہے۔ ویسے بھی میں اکیلی نہیں ہوتی ماہین اور گڈو میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں آدھے راستے تک۔'' راہین نے ماہین کو بیگ پکڑایا اور خود بھی اپنا بیگ اٹھا کر سکول جانے کے لیے کمرے سے نکل گئی۔ ماہ نور نے گھڑی کی جانب نظر دوڑائی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اسے پیراڈائز بوتیک پہنچنا تھا۔ اس نے پرس کا جائزہ لیا جو بانجھ عورت کی گود کی طرح خالی پڑا تھا۔

''اماں...... کچھ پیسے ہوں گے؟'' ماہ نور نے کمرے میں داخل ہوتی اماں سے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یعنی آج پھر طویل راستے میرے پاؤں کے منتظر ہیں۔" اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر ہینڈ بیگ اٹھا کر چادر اوڑھی۔ گھر سے باہر نکل کر جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی تو ہمیشہ کی طرح چاچا سراج کی پرچون کی دکان کھلی تھی۔ تھڑے پر موجود شخصیت کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ناگواری کا ایک رنگ اس کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس شخص کو ٹکٹکی پر لٹکا دیتی جو اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے ایسے گھورتا تھا جیسے آنکھوں سے ہی نگلنا چاہتا ہو۔ وہ اس محلے کی واحد شخصیت تھا جس کے بظاہر نظر آنے والے حلیے سے لوگ خوف اور کراہت محسوس کرتے تھے۔ وہ تھا بھی ایسا اونچا لمبا، چوڑے شانے، بے ڈھنگے اور کرخت ہاتھ پاؤں، چہرے پر اگی ہوئی بے ہنگم داڑھی مونچھیں۔ سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں غیر معمولی بڑی اور موٹی آنکھیں جن میں ہر وقت سرخی سی چھائی رہتی تھی۔ جیسے وہ کئی راتوں سے سویا نہ ہو یا پھر بہت دیر تک روتا رہا ہو اور اس کی یہی آنکھیں ماہ نور کو زہر کی طرح لگتی تھیں۔ آج تک اس نے کسی کو کچھ نہیں کہا تھا لیکن خدا معلوم محلے بھر کو وہ کیوں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ صرف ایک چاچا سراج تھا جس سے اس کی کچھ دعا سلام تھی۔ سو وہ اپنی فراغت کے وقت کبھی کبھی وہاں آ بیٹھتا تھا اور اس وقت بھی وہ تھڑے پر بیٹھا تھا اور سامنے چائے والے کے کھوکھے سے ایک پیالہ چائے اور چند پاپے لے کر ناشتہ کرنے میں مصروف تھا کہ ماہ نور کو آتا دیکھ کر ناشتہ چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ ماہ نور کنی کترا کر تیزی سے وہاں سے گزرتی چلی گئی۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل مسافت کے بعد وہ اپنی منزل کے سامنے کھڑی تھی۔ بڑی سی گلاس وال کے عقب میں بے انتہا خوبصورت ملبوسات میں ملفوف سٹیچوز نظر آ رہے تھے۔ بوتیک کیا تھی ایک نگار خانہ تھا۔ قیمتی سے قیمتی ملبوسات اپنی چھب دکھا کر گاہکوں کی آنکھوں کو گرما رہے تھے۔ گلاس ڈور کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو اندر ایک نئی ہی دنیا آباد تھی۔ ادھر سے ادھر آتی جاتی خوبصورت تراش خراش کے لباسوں میں ملبوس خوبصورت 'سیلز گرل' کاؤنٹر پر کھڑی حسین لڑکی کی استقبالی کاروباری مسکراہٹ۔ ہر چیز میں ایک تصنع 'ایک بناوٹ تھی۔ لیکن ایسی بناوٹ جو بری نہیں لگ رہی تھی بلکہ ماحول کا حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کاؤنٹر کی جانب بڑھی۔ کاؤنٹر گرل نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ اس کا ظاہری حلیہ کسی بھی طرح وہاں آنے والی کسٹمر خواتین سے میچ نہیں کر رہا تھا۔ بوسیدہ سی چادر اوڑھے ایک کم قیمت لباس میں اس کی شخصیت کا سارا حسن و سحر گویا مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔

"جی فرمائیے....." کاؤنٹر گرل کے چہرے پر سے کاروباری مسکراہٹ کی جگہ اب سنجیدگی تھی۔

"مجھے مسز نظامانی سے ملنا ہے۔" اس نے اپنی پیشانی پر پسینے کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ اے۔ سی کی کولنگ نے کسی حد تک گرمی کے احساس کو تو کم کر دیا تھا لیکن موجودہ

ماحول اسے جانے کیوں عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

"کس سلسلے میں؟" ایک نیا سوال۔

"انہوں نے مجھے یہاں جاب کے سلسلے میں بلوایا ہے۔"

"او کے جسٹ اے منٹ۔" اس نے انٹرکام پر مسز نظامانی کو اس کی آمد کی اطلاع دی اور گرین سگنل ملنے پر اسے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اندر جانے کی گویا اجازت دی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے پسینہ پونچھا اور اس دروازے کی سمت چل پڑی جس کی نشاندہی کاؤنٹر گرل نے کی تھی لیکن چلتے ہوئے مسلسل اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اردگرد موجود تمام لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ شاید اس قدر مہنگے بوتیک میں اس کا ہونا از خود ایک عجیب وغریب واقعہ تھا۔

"مے آئی کم ان میڈم؟" اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے قدرے ہچکچا کر پوچھا۔

نیم تاریک کمرے میں اے۔ سی کی وجہ سے ایک معتدل اور دل خوش کن خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے جلتے ہوئے مساموں کو عجیب طرح کی فرحت کا احساس ہوا۔ کمرے کا ماحول بھی انتہائی خوشگوار تھا، کمرے کے وسط میں دبیز و عریض مخملی اور اس کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر موجود شخصیت دونوں ہی متاثر کن تھیں۔ گہرے فیروزی رنگ کی کالے بارڈر کی ساڑھی، سلیولیس بلاؤز میں سے جھانکتے ہوئے کندنی بازو، شانوں تک لہراتے سنہرے بال، دودھیا' رنگت ہلکی بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور دلچسپی کا عنصر۔ مجموعی اعتبار سے وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ عمر نہ زیادہ تھی نہ کم لیکن ماہ نور کا خیال یہی تھا کہ وہ اپنی عمر سے کم از کم بھی چھ سات سال کم ہی لگ رہی تھی۔

"یس کم ان..." اس نے مصروفیت ترک کرتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور گہری نظروں سے ماہ نور کا جائزہ لیا۔ ماہ نور آگے بڑھی اور اس کی اجازت لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ایکچوئلی میڈم مجھے افشاں نے آپ کے بوتیک کے بارے میں بتایا تھا کہ یہاں سیلز گرل کی ضرورت ہے۔"

"اوہ تو آپ افشاں کے توسط سے آئی ہیں۔ دیکھئے یہاں جاب کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ جاب دینے سے پہلے آپ کو بتانا مناسب سمجھوں گی۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ کو ہمارے ساتھ کانٹریکٹ کرنا ہو گا کہ آپ کتنی مدت کے لیے جاب کریں گی۔ دوسری بات 'بغیر کسی معقول وجہ کے آپ جاب نہیں چھوڑ سکتیں۔ تیسری بات آپ کو یہاں کے ماحول کے حساب سے اپنی پرسنالٹی گروم کرنا ہو گی۔ اچھا لباس، اچھا انداز اور اعتماد آپ کی شخصیت کا خاصا ہونے چاہئیں۔"

"میڈم مجھے جاب کی اشد ضرورت ہے۔ آپ میرے ڈاکومنٹس دیکھ لیں میں نے باقاعدہ ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کا کورس بھی کیا ہوا ہے۔ کچھ حالات ایسے رہے کہ گریجویشن کے بعد میں اپنی تعلیم

جاری نہیں رکھ سکی لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی۔"

"ویسے ہمیں سیلز گرل کی ضرورت تو ہے اور آپ کی کوالیفیکیشن بھی سوٹ ایبل ہے۔ فی الحال تو ہم آپ کو تین دن کے ٹرائل پر رکھیں گے اگر آپ کی کارکردگی قابل قبول رہی تو مستقل ہو جائیں گی۔ اس کے بعد آپ کو کانٹریکٹ سائن کرنا پڑے گا۔"

"تھینک یو میڈم ..... تھینک یو ویری مچ۔" ماہ نور کو امید کی ایک کرن نظر آئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ مکمل طور پر اس کی روشنی سے استفادہ کرے۔

"مس مریم کچھ دیر کے لیے آفس میں آئیں۔" میڈم رانیا نے انٹرکام پر کسی لڑکی کو بلایا تھا اور کچھ ہی دیر میں آفس کا دروازہ کھول کر ایک انتہائی خوبصورت اور طرحدار لڑکی اندر داخل ہوئی۔ جدید تراش خراش کے لباس میں خوبصورت میک اپ سے مزین چہرے کے ساتھ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"یس میڈم۔" وہ قدرے مسکراتے ہوئے کچھ مؤدب سے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

"مس مریم یہ ہیں مس ماہ نور انہیں راحت کی جگہ اپائنٹ کیا گیا ہے۔ فی الحال یہ ٹرائل پر ہیں آپ انہیں ان کا کام سمجھا دیں اور ان پر چیک رکھیں مجھے تین دن بعد مکمل رپورٹ چاہیے۔"

"او کے میڈم..... آیئے مس ماہ نور۔" اس نے پہلے میڈم کو پھر ماہ نور کو مخاطب کیا۔

ماہ نور اس کے ساتھ ہی آفس سے باہر نکل گئی۔ وسیع و عریض ہال میں جابجا موونگ گرلز پر نت نئے رنگوں اور ڈیزائنوں کے ملبوسات لٹک رہے تھے۔ ایسے ملبوسات جنہیں صرف دیکھنا اور دیکھ کر سراہنا ہی ماہ نور جیسی لڑکیوں کا مقدر ہوتا ہے لیکن ماہ نور عجیب بے نیاز سی لڑکی تھی۔ وہ اپنے ہمیشہ کے بااعتماد اور پرتمکنت انداز میں مریم کے پیچھے پیچھے کاؤنٹر سے منسلک ایک آفس میں داخل ہوئی۔ میڈم کے آفس کے مقابلے میں یہ آفس دگنا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تین چار ٹیبل پڑے تھے جن کے اردگرد پڑی کرسیوں پر چند لڑکیاں بیٹھی مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ مریم ایک ٹیبل کے قریب رکھی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی گھوم کر خود ریوالونگ چیئر کی طرف بڑھی۔

"دیکھو ماہ نور! پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں انتہائی دوستانہ انداز میں کام ہوتا ہے۔ صرف ایک چیز پر کمپرومائز نہیں ہوتا اور وہ ہے کام کی کوالٹی۔ یہاں بوتیک کے اندر کپڑوں کی ڈیزائنگ کلیکشن اور سیونگ کی جاتی ہے جبکہ کڑھائی اور دیگر ہینڈ ایمبرائیڈری کے لیے شہر کے نواح میں موجود سلائی سکولوں اور گھریلو سطح پر کام کرنے والی کاریگر عورتوں سے رابطہ کیا جاتا ہے۔ ہم انہیں ان کے کام کے مناسب دام بھی دیتے ہیں اور مارکیٹ میں جو فیشن ان ہوتے ہیں اس کے سلسلے میں باقاعدہ انہیں

شارٹ کورس بھی کرواتے ہیں۔ تمہارا کام قدرے مشکل نوعیت کا ہوگا۔"

"مس مریم...... میں ہر مشکل کام کرنے کو تیار ہوں میں محنت سے جی نہیں چراتی۔"

"ایک اور بات ماہ نور! یہاں میڈم رانیا کے علاوہ سب یکساں عہدہ رکھتی ہیں۔ ہم سب ان کی سب کو آرڈینیٹس ہیں لیکن ایک دوسرے کے لیے برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ماحول تمہیں بالکل بھی اجنبی نہیں لگے گا۔ سو یہاں آپ جناب کا تکلف بھی نہیں چلے گا۔ میں تمہیں تمہارا کام سمجھا دوں۔ تم ایزائے فیلڈ ورکر منتخب ہوئی ہو۔ یعنی تمہیں ان کاریگر عورتوں سے ملنا پڑے گا انہیں کام کے سلسلے میں انسٹرکشنز دینی ہوں گی۔ نیا کام ان کے حوالے کرنا اور ان سے ایمبرائیڈری کیے ہوئے کپڑے کلیکٹ کرنا ہوں گے۔ ہفتے میں کم از کم تین بار تمہیں فیلڈ پر جانا ہوگا جبکہ باقی کے چار دن میں سے دو دن تمہارا آف ہوگا اور دو دن بوتیک کے دیگر کاموں کے سلسلے میں تمہیں آنا ہوگا۔" مریم نے انتہائی مفصل انداز میں اسے اس کا کام سمجھا دیا۔

"اور ہاں آخری بات تنخواہ آپ کو ماہانہ نہیں بلکہ ہفتہ وار ملا کرے گی۔ ہر ویک اینڈ پر تمہیں پندرہ سو روپے دیا جائے گا اس لحاظ سے ماہانہ تمہاری تنخواہ چھ ہزار روپے کے قریب ہوگی۔"

"مس مریم..... سوری مریم! کام اتنا مشکل نہیں اور پھر جب ایک بندہ گھر سے کچھ کرنے کا تہیہ کر کے نکلتا ہے تو پھر کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی۔ میری کوشش ہوگی کہ میں اپنی کارکردگی سے اپنا آپ منوا لوں۔"

"او کے ماہ نور..... وش یو بیسٹ آف لک۔" مریم نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"مریم..... ڈیوٹی آورز کیا ہوں گے؟"

"صبح ساڑھے آٹھ بجے سے شام چار بجے تک۔ بعض اوقات اگر بوتیک پر زیادہ کام ہو اور چار بجے کے بعد بھی ورکرز کو رکنا پڑے تو پھر فی گھنٹہ کے حساب سے انہیں اضافی پے منٹ کی جاتی ہے۔"

ماہ نور نے مریم کو ہاتھ ملایا اور بوتیک سے باہر آگئی۔ قسمت کو شاید اس پر ترس آ گیا تھا اسے ہر لحاظ سے یہ ایک کمفرٹیبل جاب لگی تھی۔ اب شاید حالات سدھر جائیں اس کی آنکھیں سنہرے خواب دیکھنے لگیں۔ گھر جانے کے لیے جونہی اس نے گلی کا موڑ کاٹا، چاچا سراج کی دکان پر بیٹھی شخصیت کو دیکھ کر ناگواری کی ایک شدید لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نفرت تھی اسے ان سرخ آنکھوں سے جن کی سرخی اسے دیکھ کر مزید بڑھ جاتی تھی۔ ایک پاؤں گلی کے فرش پر اور دوسرا دکان کے تھڑے پر دھرے وہ بڑے انہماک سے چاچے سراج کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ یکدم اس نے پلٹ کر ماہ نور کے چہرے پر اپنی گہری سرخی مائل آنکھیں گاڑ دیں۔ ماہ نور نے ناگواری سے اپنی چادر کھینچ کر چہرے کے آگے کی اور تیز تیز قدموں سے چاچے سراج کی دکان کے پاس سے گزرتی چلی

گئی۔ وہ اس روز کے معمول سے تنگ آ چکی تھی لیکن افسوس وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ پتہ نہیں محلے بھر میں کوئی ایسا مائی کا لال نہیں تھا جو اسے سیدھا کر سکتا۔ اسے اب تک یہ نہیں پتہ تھا کہ آخر اس شخص کا اس محلے میں قیام کا مقصد کیا ہے۔ وہ تن تنہا چھڑا چھانٹ تھا۔ پچھلے پانچ سال سے وہ اس محلے میں قیام پذیر تھا۔ نہ کسی سے ملتا جلتا۔ عجیب اسرار میں ملفوف شخصیت کا مالک تھا وہ۔ ماہ نور گھر کے دروازے پر پہنچی تو گھر سے نکلتی خالہ پروین سے ٹکراؤ ہو گیا۔

''آ ئے ہائے...... کیا پھول جیسی بچی اور نصیب دیکھو بخت جلوں کے۔ ایسے لعل تپتی دوپہر دں میں سڑکوں، گلیوں میں رل رہے ہیں۔ ہائے بچی بھلا کہاں سے آ رہی ہو؟'' بی جمالو خالہ پروین نے بظاہر ہمدردی لیکن بہ باطن طنزیہ نگاہوں سے بغور اس کو جانچتے ہوئے پوچھا۔

''وہ خالہ...... ایک جگہ نوکری کی امید بنی ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟'' ماہ نور کو محلے کی یہ دوسری شخصیت تھی جو اچھی نہیں لگتی تھی۔ خالہ پروین پورے محلے کا انسائیکلوپیڈیا تھیں۔ کون سی لڑکی کا ٹانکا کس لڑکے کے ساتھ فٹ ہے' کس عورت کو اس کا شوہر مارتا ہے؟ کس عورت کا شوہر دوسری عورت کے چکر میں ہے' حتیٰ کہ بچوں تک کی تفصیل سے آ گاہ رہتی تھیں۔ ماہ نور جانتی تھی کہ اب محلے بھر میں خبریں پھیلے گی گویا خشک جھاڑیوں کو تیلی دکھا دی جائے۔ وہ ان کی ذہنیت سے بھی اچھی طرح واقف تھی اس لیے اس نے مزید دروازے پر کھڑے ہو کر تماشا بننے سے بہتر یہی سمجھا کہ خالہ سے رخصت لی جائے۔

''اچھا خالہ...... پھر کبھی آ یئے گا ناں۔''

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں بچی آ ؤں گی۔'' خالہ نے مصنوعی پیار سے ماہ نور کے سر پر ہاتھ پھیرا اور شٹل کاک برقع اوڑھنے کی بجائے ایک کندھے پر ڈالے پان چباتی سامنے والوں کے گھر کی طرف چل پڑیں۔ ماہ نور بھی ایک گہری سانس لے کر گھر کے اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی مختصر سے برآمدے میں چارپائی بچھائے اماں جانے کیا سینے پرونے میں لگی تھیں۔

''اسلام علیکم اماں!'' اماں نے عینک کے اوپر سے ایک نظر اس کے دمکتے ہوئے چہرے پر ڈالی۔ امید پوری ہو جانے کے بعد کیسی روشنی سی پھیل گئی تھی اس کے پاکیزہ چہرے پر۔

''وعلیکم السلام۔'' اماں کے جواب دینے تک وہ مختصر سا صحن عبور کرتی ہوئی ان کے تخت کے قریب پہنچ چکی تھی۔ فائل ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے آ گے بڑھ کر اماں کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے ان کا جھریوں بھرا چہرہ چوم لیا۔

''بس میں نے جان لیا۔ اللہ میری بچی کو زندگی کی ہر کامیابی عطا کرے۔'' اماں نے مسکراتے ہوئے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

''اماں اس قدر اچھی نوکری کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بالکل محفوظ ماحول، معیاری جاب اور بہترین تنخواہ۔ اماں اب سمجھیں ہماری مشکلات کے دن کٹ گئے۔'' اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی محسوس کی جا سکتی تھی۔ اماں کی آدھی کلفت تو اس کے اطمینان سے ہی ختم ہو گئی تھی۔

''چلو اچھا ہوا۔ تمہاری آرزو پوری ہوئی۔ اچھا ایسا کرو تم چادر وغیرہ اتارو۔ میں تازہ روٹی بنا کر لاتی ہوں۔'' اماں مشین ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''نہیں اماں مجھے بھوک نہیں ہے۔ شاہین ماہین وغیرہ آ گئیں؟'' ماہ نور کمرے کی جانب بڑھتے ہوئی بولی۔

''ماہین اور راہین تو واپس آ گئی ہیں البتہ شاہین بتا رہی تھی کہ اس کی کسی دوست کی سالگرہ ہے وہ سکول سے اس کے گھر چلی جائے گی۔''

''اچھا۔'' ماہ نور مختصراً کہتی ہوئی چارپائی پر نیم دراز ہو گئی۔ عرصے بعد اسے اس کی محنت کا ثمر ملا تھا۔ سو اتنے بہت سارے دنوں کی تھکان اس کے وجود پر نیند بن کر مسلط ہو گئی۔ بوجھل آنکھوں میں روشن کل کے سپنے لیے جانے کب وہ نیند کی دیوی سے ہم آغوش ہو گئی۔

شام ڈھلے اس کی آنکھ کھلی' گھر میں ایک جامد سناٹا تھا۔ ایک ایسا سکوت جو اس کے گھر میں صرف ابا کے مرنے کے بعد گھر بھر پر طاری ہوا تھا لیکن پھر غم روزگار نے ہر غم کا رنگ پھیکا کر دیا تھا۔ وہ حیران حیران سی کمرے سے باہر نکلی۔ اماں رسوئی میں پیڑھی پر بیٹھی شاید رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ ماہین اور گڈو صحن میں بچھی چارپائی پر یوں سہمے بیٹھے تھے جیسے ابھی ابھی اماں سے خاطر تواضع کروا کے بیٹھے ہوں جبکہ راہین اماں کے پاس بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔

''اماں کیا بات ہے؟ اس قدر خاموشی۔ کیا ہوا ہے؟'' وہ رسوئی کے دروازے پر کھڑی اماں سے پوچھ رہی تھی۔

''آپی مغرب کی اذانیں ہونے کو ہیں لیکن شاہین ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔'' راہین نے کہا تو ماہ نور بھی ایک لمحے کو پریشان ہو گئی لیکن اماں کا متفکر چہرہ دیکھ کر اس نے چہرے سے پریشانی ہویدا نہیں ہونے دی۔

''ارے تو ایسا کیا ہو گیا۔ لڑکیاں لڑکیاں اکٹھی ہوتی ہیں تو باتوں میں وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلا ہو گا۔ ابھی آ جائے گی اور یہ ماہین اور گڈو دونوں کیوں ڈرے بیٹھے ہیں؟''

''دونوں اماں سے پٹائی کروا کر سکون لے رہے ہیں۔'' راہین کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

''کیوں؟''

''مستقل اماں کو تنگ کیے جا رہے تھے' باہر آئس کریم والا آیا تھا۔ اماں کے پاس پیسے نہیں تھے دونوں نے رونا شروع کر دیا تو اماں نے جوتا اٹھا کر اچھی خاصی مرمت کر دی۔ تب سے خاموش بیٹھے ہیں۔''

''ارے اماں! آپ بھی کمال کرتی ہیں اتنی سی بات کے لیے بچوں کی دھنائی کر دی۔ میرے پرس میں کل اور آج کے کرائے کے پیسے پڑے تھے۔ نکال کے دے دیتے تھے۔''

''ارے بہت فضول خرچ ہو گئے ہیں۔ بالکل ہی ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں۔ اب دوسری کو ہی دیکھ لو کہاں صبح کی نکلی ہوئی مغرب کی اذانیں ہونے کو ہیں مگر کم بخت کا کہیں کچھ پتہ نہیں۔ یا اللہ! سر کا سائیں لینا تھا تو اتنی بیٹیاں کیوں دے دیں؟ باہر نکلیں تو کوؤں کا ڈر اندر ہیں تو چوہوں کا۔ کہاں جاؤں۔ میرے تو بھاگ ہی سیاہ ہیں۔''

''اماں..... اماں ایسا مت کہیں اوپر والا ناراض ہوگا۔'' ماہ نور نے آگے بڑھ کر اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اماں ہمارا کیا لے رہی ہیں رزق دینے والا نصیب لکھنے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔ اپنے نصیبوں کا لے رہی ہیں۔''

''ارے یہی تو دکھ ہے۔ اللہ نے میری بچیوں کی قسمت کیسی لکھی ہے۔ بچپن میں ہی باپ کے سائے سے محروم کر دیا، بھائی ہے تو وہ کسی قابل نہیں۔ چار پہاڑ جیسی جوان بیٹیاں' خود سوچو جب تم چاروں اکٹھی بیٹھی ہوتی ہو تو کیا ایک جیسی نہیں لگتیں۔ پھر میں کیسے نہ پریشان ہوں۔ اوپر سے زمانہ دیکھو کیسا جا رہا ہے۔ سگے رشتوں پر بھی کوئی اعتبار نہیں ایسے میں میرا پریشان ہونا بنتا ہے یا نہیں۔''

اماں غلط نہیں کہہ رہی تھیں یہ تو وہ بھی جانتی تھی۔

پچھلے ایک سال میں ہی اسے تجربہ ہو گیا تھا کہ دنیا، معاشرہ حتیٰ کہ سب کچھ صرف اور صرف مرد کا ہے، عورت کا کوئی وجود نہیں۔ وہ تو محض پرزوں کی مانند ہیں۔ جہاں جہاں ضروری ہوا فٹ کر لیا گیا۔ کام ہونے پر بے کار سمجھ کر پھینک دیا۔

''اماں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن یوں پریشان ہونے سے بھی کبھی مسائل حل ہوئے ہیں۔'' وہ کسے سمجھا رہی تھی؟ ایک ماں کو..... وہ ماں جو حوادث زمانہ کے تھپیڑے کھا چکی تھی۔ دنیا کے ستر رنگ اور ہر رنگ کے ستر ستر پہلوؤں سے آشنا تھی وہ۔ سو طفل تسلیاں اسے کیا مرعوب کر پاتیں۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو ماہ نور نے رسوئی میں سے باہر جھانکا۔ گلی والے دروازے کے اندر یقیناً شاہین ہی داخل ہو رہی تھی لیکن یہ وہ شاہین تو نہیں تھی جو صبح گھر سے سکول جانے کے لیے نکلی تھی۔ جسم پر یونیفارم کی بجائے کسی سہیلی کا مانگا ہوا سوٹ سجائے آنکھوں میں مٹا مٹا کاجل' ہونٹوں پر پھیلی پھیلی

پھیکی پڑتی لپ اسٹک اور خوبصورت لمبے بالوں کے الجھے ہوئے لچھے ماں کے خدشات پر مہر تصدیق ثبت کر رہے تھے۔

''شاہین.....'' ماہ نور کے چہرے پر پھیلے تردد کے سائے دیکھ کر ماں نے بھی سر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر جیسے دل تھام کر رہ گئیں۔ شاہین اب صحن کے وسط میں کھڑی تھی۔ لرزتی ٹانگوں پر کھڑا ہونا اس کے لیے دوبھر ہوتا جا رہا تھا۔

''اماں باہر..... باہر لیاقت.....'' بے جان ہوتا ہوا وجود لیے وہ وہیں صحن میں چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ اماں تیزی سے دروازے کی جانب بڑھیں۔ پردے کی اوٹ سے باہر جھانکا۔ باہر محلے بھر کا ناپسندیدہ شخص کھڑا ان کا منتظر تھا۔ اس نے اماں کو اوٹ سے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''ماں جی..... آپ اکیلی ہیں اور زمانہ بہت خراب۔ شاہین بہن کو تو میں کسی نہ کسی طرح بچا لایا ہوں لیکن ہمیشہ ایسے اتفاقات نہیں ہوتے۔ اس لیے براہ کرم بچیوں پر ذرا سختی کی نگاہ کریں۔''

ہمیشہ کے سلے ہوئے لب ہلے تو نہایت شستہ اور سلجھا ہوا لہجہ سامنے آیا۔

''تمہارا بہت شکریہ بیٹا..... تم نے ہماری لاج رکھ لی۔ بہت بڑا احسان ہے تمہارا۔'' بے بس اماں کی آنکھیں آنسو چھلکا رہی تھیں۔

''نہیں ماں جی..... اس میں شکریہ ادا کرنے والی کوئی بات نہیں' شاہین میری بہن ہے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو میرا رویہ مختلف نہ ہوتا اور آپ براہ کرم روئیں مت۔ میرا مقصد آپ کا دل دکھانا ہرگز نہیں تھا۔ میں نے یہ محض اس لیے کہا تھا تاکہ آئندہ آپ محتاط رہیں۔ اچھا اب مجھے اجازت دیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے پلٹ گیا۔

اماں کے پیچھے کھڑی ماہ نور کے منجمد ہوتے حواس نے اس کے وجود کو گویا پتھرا دیا تھا۔ وہ جو ان کی نظر میں زمانے بھر کا ملعون تھا۔ آج کتنا بڑا احسان کر گیا تھا۔ یہ وہی تھا جس کی سرخ آنکھوں میں اسے زمانے بھر کی خباثت نظر آتی تھی۔ من من بھر کے پاؤں اٹھانا اس کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اماں کی شکوہ کناں نظروں کا سامنا کرنے کی ہمت وہ خود میں نہیں پا رہی تھی۔ اماں کا رویہ بھی ناقابل فہم ہی تھا انہوں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی نہ ہی شاہین سے کوئی باز پرس کی۔ بس نہایت خاموشی سے سب کی طرف دیکھا اور کمرے میں جا کر منہ سر لپیٹ کر لیٹ گئیں۔ ماہ نور جانتی تھی کہ وہ اس وقت کسی سے کوئی بات نہیں کریں گی۔

آج ان کا مان ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی بیٹی نے ان کا اونچا سر جھکا دیا تھا۔ وہ جنہوں نے غربت میں بھی کبھی خدا سے گلہ نہیں کیا تھا۔ آج دنیا بھر سے شاکی ہو گئی تھیں۔ ماہ نور دھیرے دھیرے چلتی صحن میں شاہین کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ شاہین کے چہرے پر گہری شرمندگی کے تاثرات

ثبت تھے، آنکھیں ندامت سے جھکی ہوئی زمین میں گڑی جارہی تھیں۔

''شاہین'' ماہ نور نے اسے پکار تو لیا تھا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ کیا پوچھے اور کس طرح استفسار کرے کہ جو کچھ تھا آنکھوں کے سامنے تھا۔ پوشیدہ تو کچھ نہیں رہا تھا۔

''جی آپی'' مری مری آواز جیسے سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے آئی ہو۔

''یہ سب''

''آپی مجھے معاف کردیں آپی مجھ سے غلطی ہوگئی۔'' یکدم ہی شاہین ماہ نور سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماہ نور جو شدید دکھ اور غصے کی کیفیت میں تھی، معلوم نہیں کیوں اس کا سارا غصہ جیسے ہوا ہوگیا۔ اپنی بہن کے پاکیزہ اُجلے چہرے کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا مگر بولی کچھ نہیں ۔بس تسلی آمیز انداز میں بازو اس کی کمر کے گرد حائل کردیئے۔

''آپی وہ تو بہت اچھا تھا۔ سارے لڑکوں سے مختلف اُس نے آج تک میرے ساتھ کوئی بڑی بات تک نہیں کی پھر پھر آج اُس نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں کیا ایسا؟''

''شاہین تم جانتی ہو ایک اکیلی لڑکی کا معاشرے میں کیا مقام ہے؟'' ماہ نور نے اُس سے پوچھا تو وہ بھیگی آنکھیں اُٹھا کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مالِ غنیمت جانتی ہو نا مالِ غنیمت کیا ہوتا ہے؟ اسے ہر جگہ بھوکی نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میری بہن' یہ دنیا کیچڑ کا تالاب ہے لاکھ خود کو بچا کر چلو، چھینٹے پھر بھی پڑ ہی جاتے ہیں۔ اماں کی پہرے دار نظروں سے بچ کر کس نے تمہارے دل پر نقب لگائی ہے؟ اپنے ہاتھوں خود اپنے لیے گڑھا کھود رہی تھیں۔ تم کہاں کی اتنی انسان شناس ہوگئیں کہ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ خود ہی کر لیا۔''

شاہین بدستور نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ ماہ نور کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ کیا کہے؟ ایک طرف تو اسے شاہین پر شدید غصہ اور ناراضگی تھی تو دوسری طرف دل کہہ رہا تھا کہ یہ تو عمر ہی بہکنے کی ہوتی ہے۔ غلطی اس کی نہیں' غلطی تو ہماری ہے جنہوں نے اُسے یوں کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ جہاں دل چاہے جاؤ اور لڑکیاں تو یوں بھی کانچ سے نرم و نازک خیالات و احساسات کی مالک ہوتی ہیں۔ سو بیرونی اثرات بھی جلدی قبول کرتی ہے اُسے سمجھانا فرض تھا دنیا کی اونچ نیچ، معاشرے کے رویہ جات لیکن اس فرض سے کوتاہی نے آج یہ دن دکھا دیا۔

''اور یہ غیاث کہاں ملا تمہیں؟''

''ارشد اور میں پارک کے ایک گوشے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ارشد میرے ساتھ'' ہچکچاہٹ نے زبان پر قفل لگادیا۔

''بولو آگے کہو۔'' ماہ نور نے نرمی سے کہہ کر گویا اس کی ہمت بندھائی۔

''ارشد میرا ہاتھ پکڑ کر بولا کہ پارک میں لگے درختوں کے جھنڈ کی طرف چلتے ہیں۔ ہم دونوں اس طرف نکل گئے۔ گھنے درختوں کے بیچ لے جا کر اُس نے مجھ سے فری ہونے کی کوشش کی۔ غیاث بھائی کہیں قریب ہی تھے۔ میری آوازیں سن کر تیزی سے اُس طرف آگئے۔ ارشد تو انہیں دیکھ کر بھاگ گیا اور وہ مجھے لے کر گھر آگئے۔ آپی آپی میں سوچتی ہوں اگر غیاث بھائی نہ ہوتے تو؟ تو سے آگے کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ یقیناً پچھلے چند لمحات نے اُسے وقت سے پہلے بلوغت سے آگاہی عطا کردی تھی۔

''تو سے آگے کیا ہوتا تھا شاہین اس کا تصور تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں آسکتا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے اُس نے تمہیں بچالیا۔ آئندہ کے لیے میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ لڑکیاں کانچ کے برتن کی ہوتی ہیں۔ ٹھیس لگنے سے ٹوٹ سکتی ہیں اور اگر ٹوٹیں نہ تب بھی اُن میں کریک آسکتا ہے جو ان کی شخصیت کو بدنما کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اگر زندگی میں عزت کو لازم سمجھتی ہو تو کوئی ایسا کام مت کرو جو تمہیں دوسروں سے خاص طور پر گھر والوں سے چھپ کر کرنا پڑے۔ ان پوشیدہ راستوں کی منزل ہمیشہ رسوائی ہوتی ہے اور بس۔'' بالآخر ماہ نور کو سمجھانے کے لیے موزوں الفاظ مل ہی گئے۔

دگرنہ تو آج کے اس واقعہ نے اس کے ذہن کو ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔ ابھی اماں کو منانا باقی تھا جو نہ جانے اس وقت کس ذہنی اذیت میں مبتلا تھیں۔

''شاہین اماں کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لو اور آئندہ کے لیے یقین دہانی بھی کراؤ کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' شاہین کی بھیگی نظریں ماہ نور کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''اب کیا ہے؟''

''آپی آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔''

''نہیں شاہین کسی تیسرے فرد کی موجودگی شاید اماں اور تمہارے دونوں کی گفتگو میں مخل ہو۔ تم خود جاؤ اور دیکھو اگر وہ کچھ سخت بات کہیں تو سر جھکا کر سن لینا کہ بہرحال مان اور اعتماد توڑنے پر اتنی سزا تو تمہیں ملنی ہی چاہیے۔'' ماہ نور کے کہنے پر شاہین نے جھجکتے ہوئے کمرے میں جھانکا۔ اماں دروازے کی طرف پشت کیے لیٹی تھیں۔ شاہین خاموشی سے آگے بڑھی اور اماں کے پائنتی نیچے زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے ان کے پاؤں پکڑ لیے لیکن اماں کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں ملا تو اُس نے آگے بڑھ کر اماں کے پاؤں ہونٹوں سے چھو لیے۔ گرم انگاروں سے آنسو ڈھیرے ڈھیرے اماں کے پاؤں بھگو رہے تھے۔ اذیت کی آگ اُس کے تن من کو خاکستر کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

''اماں!'' کانپتے ہونٹوں سے اُس نے پکارا لیکن جواب نہ ملا۔

''اماں مجھے معاف کر دیں۔''

''کس بات کی معافی؟'' اماں کے لہجے میں محسوس کی جانے والی ناراضگی تھی۔ شاہین سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ بس وہ ان کے قدموں پر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اماں کچھ دیر تو لیٹی رہیں پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''شاہین تم نے آج مجھ بتا دیا کہ حد سے بڑھا ہوا اعتماد کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے۔ بڑا ناز تھا مجھے اپنی تربیت پر کہ سارا زمانہ ایک طرف اور میری بیٹیاں ایک طرف۔ پڑھ لکھ کر معاشرے میں ایک اونچا مقام بنائیں گی اور تم تم نے اپنے باپ کا بنایا ہوا نام اور کمائی ہوئی عزت داؤ پر لگا دی۔ بولو جواب دو کہاں میری تربیت میں کمی تھی؟ کہاں تمہیں محبت کی کمی تھی جو تم نے چور راستے تلاش کرنے شروع کر دیئے؟ ابھی تو تمہاری عمر کی لڑکیاں گڑیاں کھیلنا چھوڑتی ہیں اور تم اپنے دامن پہ داغ لگانے چلی تھیں۔'' اماں کی آواز بھیگنے لگی۔ شاہین کے چہرے پر خفت و ندامت کا تاثر ابھر آیا۔

''اماں پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دیں۔'' وہ اماں کے پاؤں پکڑے بلک بلک کر التجا کر رہی تھی۔ اماں کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اُسے اپنے کمزور و ناتواں بازوؤں میں بھر لیا۔

''میری بچی دنیا بڑی ظالم ہے۔ بھیڑوں کے روپ میں یہاں بھیڑیے پھرتے ہیں۔ جتنی محتاط رہ کر زندگی گزارو گی اتنا بچی رہو گی۔'' اماں اُسے زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ کر رہی تھیں اور وہ فرمانبردار بچی کی طرح سر جھکائے سن رہی تھی۔ یقیناً اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ چارپائی پر لیٹا ہوا سامنے دیوار پر آویزاں تصویر کو مستقل دیکھے جا رہا تھا۔ یہ ایک قدرے بڑی عمر کی عورت کا پورٹریٹ تھا جسے بنایا بھی اُس نے خود تھا۔ پچھلے پندرہ سال سے اُس نے ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ اس تصویر سے نفرت کی تھی لیکن اتنی شدید نفرت کے باوجود وہ تصویر اس کے کمرے کی زینت تھی۔

''آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟'' آنکھوں میں سوال لیے وہ برابر اُس تصویر کو حقارت سے دیکھے جا رہا تھا کہ یکدم جیسے چونک پڑا۔ اُسے لگا تھا جیسے کسی نے گھر کا بیرونی دروازہ بجایا ہے۔ اُسے یہ مداخلت سخت ناگوار گزری تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی بیر پسارے جھلنگا چارپائی پر پڑا رہا کہ جو کوئی بھی ہے انتظار کر کے خود ہی واپس چلا جائے گا لیکن شاید آنے والا کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ تھا کہ مسلسل دستک دیئے جا رہا تھا۔ وہ غصے سے اٹھا اور تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ دھاڑ سے دروازہ کھول کر اُس نے آنے والے کی خبر گیری کرنا چاہی لیکن باہر کھڑے چھ سات سال کے معصوم بچے کو دیکھ کر سخت الفاظ اس کے ہونٹوں کی گرفت سے آزاد نہ ہو پائے۔

بچہ اس کے کرخت چہرے پر پھیلے غیظ و غضب کے تاثرات سے کچھ خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''انکل انکل یہ میری مس نیک نہیں ہے وہ... وہ احمر نے ہٹ ہی اتنے زور کی لگائی کہ بال آپ کے گھر میں آ گئی۔'' وہ کچھ گھبرا کر صفائی پیش کرنے لگا تو اُس نے دھیرے سے مسکرا کر اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ بچہ اپنی گیند ڈھونڈ لینے کے بعد شکریہ کہہ کر چلا گیا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ اس کے پیچھے اس کا روتا بلکتا بچپن ایک بار پھر اپنی پوری جزئیات سمیت جاگ اُٹھا۔

''میرے ہاتھوں میں کیا تھما یا تم نے ابا ہتھوڑا اماں تمہارے پاس میرے لیے سوائے جوتوں کے اور کیا تھا۔ کبھی تمہاری ممتا بھری آغوش میری خاطر وا نہیں ہوئی۔ میں سخت سردیوں میں ٹھٹھرتا رہا لیکن کوئی ہاتھ جذبوں کی حدت دینے کو میری طرف نہیں بڑھا۔ ابا تم نے بھی کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں تیرا بیٹا کیا چاہتا ہے؟ میں بھی دوسرے بچوں کی طرح تیرے گلے میں بانہیں ڈال کر فرمائشیں کرنا چاہتا تھا۔ تیرے پاس لیٹ کر کہانیاں اور قصے سننا چاہتا تھا مگر تو نے... تو نے مجھے جھڑکیوں کے سوا کیا دیا۔ وہ ہاتھ جو کھلونے تھامنے کے لیے تھے، قلم پکڑنا چاہتے تھے تو نے ان میں اوزار پکڑا دیئے۔ تو بھی ٹھیک تھا بھلا اولاد کو پڑھا کر حاصل بھی کیا ہوتا ہے؟ ہاں مزدوری کر کے پیٹ تو پل جاتا تھا ناں اور میرے لیے یہی کافی تھا۔''

ہمیشہ کی طرح یادیں اُسے اذیت دینے کو اس کے ذہن میں در آئی تھیں اور ان یادوں سے فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

''ارے بیٹا ناشتہ تو کرتی جاؤ۔'' رسوئی میں سے اماں نے ماہ نور کو دیکھا جو بڑی تیزی سے چادر اوڑھتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

''اماں دیر ہو جائے گی۔ آج پہلا دن ہے ناں آپ کو کیا پتہ فرسٹ امپریشن از دا لاسٹ امپریشن۔''

''ہیں؟'' اماں قدرے تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''اماں آج جو میرا تاثر بن جائے گا وہ مستقل ہو گا اور میں اچھا تاثر چھوڑنا چاہتی ہوں تاکہ آئندہ ترقی کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہوں۔'' ماہ نور جملہ مکمل کرتی ہوئی دروازے سے نکل گئی۔

''خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے میری بچی۔'' اماں کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تیر گئی۔

بوتیک قدرے فاصلے پر تھا لیکن آج ماہ نور اپنے اندر بہت اعتماد اور تازگی محسوس کر رہی تھی۔ سو

اپنے ازلی تمکنت بھرے انداز میں قدم اٹھاتی وہ گلی کا موڑ مڑ کر سڑک پر آ گئی۔ آج خلاف معمول چاچے سراج کا تھڑا خالی تھا۔ ماہ نور قدرے حیران تھی کہ آج ایسا کیا ہو گیا تھا؟ پھر اُسے یاد آ گیا کہ کل زندگی میں ایک بہت بڑا طوفان آتے آتے رہ گیا تھا اور اس طوفان کو روکنے والا اور کوئی نہیں غیاث تھا۔ لیکن اس کے باوجود ماہ نور کے دل میں اس کے لیے ذرہ برابر جگہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔

پیدل چلتے چلتے ماہ نور کچھ تھکان سی محسوس کر رہی تھی۔ اس لیے وہ سڑک کے کنارے لگے درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ گرین لیموزین اور اس کے اندر بیٹھے ہوئے شخص' دونوں نے ہی لمحہ بھر کو اُسے چونکا دیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا تھا لیکن لیموزین کو چلانے والا کوئی اور نہیں غیاث ہی تھا۔

''ایک ہی شخصیت کے دو رخ'' وہ کچھ حیران سی ہو گئی لیکن اگلے ہی لمحے ایک سوچ اس کے ذہن کو پرسکون کرتی چلی گئی۔

''ہو گی کسی دوست کی بھلا غیاث اور اس قدر مہنگی اور نئی گاڑی میں۔'' اس کی آنکھوں کے سامنے میلے کچیلے لباس میں ملبوس گندے سے حلیے والا غیاث آ گیا۔ انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں آخر کار وہ اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ باوردی دربان نے بڑا سا گلاس ڈور کھول کر گویا اُسے اندر جانے کی اجازت دی۔ اندر کے ماحول کو تو اس نے کل ہی طلسم ہوشربا کا نام دے دیا تھا۔ رنگ رنگ کے ملبوسات اور ان ملبوسات کی فروخت کے لیے خوبصورت ترین سیلز گرلز جن کے چہروں پر سجی کاروباری مسکراہٹ بھی عجب جادو کا سا سماں پیدا کر دیتی تھی کہ آنے والے مسحور ہو کر رہ جاتے تھے۔ توقع کے مطابق اُسے سامنے ہی مریم نظر آ گئی جو ہاتھ میں رجسٹر لیے کاؤنٹر کی جانب چلی آ رہی تھی۔

''ہیلو نور'' بے تکلفی تو اس کی جیسے شخصیت میں ہی رچی بسی تھی۔

''ہیلو مریم ہاؤ آر یو۔'' ماہ نور نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''فائن۔'' مریم کی مسکراہٹ انتہائی خوبصورت تھی۔ معصوم چہرہ اور گالوں پر پڑنے والے گڑھے اُسے اپنی عمر سے کم از کم پانچ یا چھ سال کم عمر ظاہر کرتے تھے۔

''پہلے ایسا کرو نور' اٹینڈنس لگا لو اس کے بعد میڈم نظامانی سے بریفنگ لینا ہو گی تاکہ باضابطہ طور پر کام شروع کیا جا سکے۔'' مریم نے ہاتھ میں پکڑا رجسٹر اس کے سامنے کاؤنٹر پر کھول کر رکھ دیا۔ ماہ نور نے اپنے نام کے سامنے اپنے آنے کا وقت اور سائن کر کے رجسٹر مریم کو تھما دیا۔ مریم نے قریب ہی لگے انٹر کام پر میڈم کو ماہ نور کی آمد کی اطلاع دی۔

''میڈم تمہاری ہی منتظر ہیں۔'' مریم اُسے میڈم کے آفس تک پہنچا کر خود اپنے کیبن کی طرف بڑھ گئی۔

ماہ نور آفس کا دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہو گئی۔ مسز نظامانی کمپیوٹر پر گرافکس کا کام کر رہی

تھیں۔ انہوں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کر کے اُسے بیٹھنے کو کہا اور پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ ماہ نور آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں آفس کی چکنی دیواروں پر آویزاں خوبصورت ماڈلز کی تصاویر پر پھسل رہی تھیں۔

قیامت خیز سراپے پر موجود قیمتی ملبوسات نے ان ماڈلز کو عجیب سا وقار اور حسن عطا کر دیا تھا۔ اُسے مسز نظامانی کے آفس میں بیٹھے تقریباً نصف گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت ہو گیا ہو گا۔ جب انہوں نے کمپیوٹر کو ٹرن آف کرنے کے بعد اپنی پوری توجہ اس کی جانب مبذول کر لی۔ دونوں کہنیاں میز کی سطح پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں کی ایک مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے اپنی سحر انگیز آنکھوں سے گویا وہ اس کا سارا وجود کھنگالنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ماہ نور کو ان کے دیکھنے کے اسٹائل سے الجھن ہو رہی تھی لیکن اُس نے اپنے بشرے سے ظاہر نہیں ہونے دی۔

''سوری تمہیں کافی انتظار کرنا پڑا تم بور تو نہیں ہوئیں۔ دراصل میرا مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی کام کر رہی ہوں تو اپنی ساری توجہ اسی کام پر رکھتی ہوں۔ توجہ کے بٹ جانے سے کام کا بہت زیادہ حرج ہوتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات۔ یقیناً جان بھی گئی ہو گی کہ یہاں کام کرنے کا اولین اصول بھی یہی ہے۔'' وہ بغور ماہ نور کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ ماہ نور کے چہرے پر دلچسپی کے تاثرات دیکھ کر وہ بھی قدرے مطمئن سے انداز میں مسکرا اٹھیں۔

''مجھے یقین ہے کہ تم ہمارے بوتیک کے سٹاف میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہو گی۔ اب تم مریم سے مل لو۔ وہ تمہیں بتائے گی کہ تم نے کیا کرنا ہے؟'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی موٹی سی فائل کھول لی جس میں مختلف فیبرکس کے نمونے، کپڑوں کے پرنٹوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں نہایت قرینے سے چسپاں تھیں۔ ماہ نور اٹھ کر آفس سے باہر نکل آئی۔ سامنے تین چار کیبن تھے۔ اُس نے اندازے سے ایک کیبن میں جھانکا اور سامنے مریم کو بیٹھا دیکھ کر اطمینان سے اندر داخل ہو گئی۔ مریم کسی لڑکی کو فیبرکس کی سلائی سمجھا رہی تھی۔

''آؤ ماہ نور۔ بیٹھو'' کچھ دیر اُس لڑکی کے ساتھ سر کھپانے کے بعد جب وہ دوبارہ ماہ نور کی طرف متوجہ ہوئی تو بالکل فریش موڈ میں تھی۔

''توبہ ہے غلطی سے چند کوڑھ مغز لڑکیاں کیا بھرتی کر لیں، جان عذاب میں آ گئی۔ پتہ نہیں کون سے جنگلوں میں بیٹھ کر ڈپلومے حاصل کر رکھے ہیں۔ کہتی کچھ ہوں اور کرتی کچھ ہیں، خیر تم یہ بتاؤ کہ کیا ہو گی؟''

''ہاں میں ارے مریم میں یہاں مہمان نہیں ہوں میں تو اس لیے آئی تھی تاکہ تم سے اپنے کام کی نوعیت پوچھ سکوں۔''

''فی الحال تو ابھی تم مہمان ہو ... چلو ایسا کرتے ہیں کولڈ ڈرنک منگوا لیتے ہیں۔'' انٹرکام پر کولڈ ڈرنک کا کہہ کر اُس نے ایک نظر ماہ نور کی طرف دیکھا اور ایک بڑا سا رجسٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔

''شہر کی نواحی بستیوں میں موجود کاریگر خواتین کے نام، پتے اور ان کے کاموں کی تفصیل اس میں درج ہے۔ یہ ایک نظر دیکھ لینا، میرے کیبن سے ایک چھوڑ کر اگلا کیبن تمہارا ہے۔ تمہاری نیم پلیٹ ٹیبل پر دھری ہوگی لیکن آفس میں جانے سے پہلے تمہیں مزید ایک کام کرنا ہوگا۔ امید ہے تم برا نہیں مانو گی۔''

''کیا مطلب ... ؟ کون سا کام؟'' ماہ نور نے عجیب سے انداز سے اُسے دیکھا۔

''تمہیں ایک پروسیس سے گزرنا ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اسی کیفیت میں مریم کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ مریم جس دروازے سے اس کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی وہ بوتیک کے ساتھ تھا لیکن وہاں کا ماحول یکسر مختلف تھا۔ سامنے کی طویل دیوار کے ساتھ ایک کونے سے دوسرے کونے تک تین فٹ چوڑا آئینہ لگا ہوا تھا جس کے سامنے لائن سے چھ سات موونگ چیئرز رکھی تھیں۔ ایک طرف دیوار گیر الماری نت نئی امپورٹڈ کاسمیٹکس سے مزین نظر آ رہی تھی۔ اس بیوٹی پارلر میں تین چار لڑکیاں مصروف عمل تھیں۔ عام سادہ سے چہروں کو رنگوں کی ترتیب سے خوبصورت اور طرحدار بنایا جا رہا تھا۔ ازل کی سادہ مزاج ماہ نور کو اس ماحول میں کچھ گھٹن اور بناوٹ محسوس ہو رہی تھی۔

''سارہ ... ماہ نور آج سے تمہاری مستقل کلائنٹ ہے اُسے یکسر بدل دو۔'' مریم نے وہاں موجود ایک لڑکی کو مخاطب کیا۔

''لیکن مریم میں نے تو کبھی پہلے ...''

''میک اپ نہیں کیا ناں ... '' مریم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ارے میری جان یہاں آنے والوں کے خیالات کے مطابق ہمیں اپنا اسٹینڈرڈ بنانا پڑتا ہے ورنہ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ سارہ جس طرح کہے تم نے ویسا ہی کرنا ہے او کے۔'' مریم اُسے اس اجنبی دنیا میں چھوڑ کر خود جہاں سے آئی تھی وہاں چلی گئی۔ ماہ نور اب مکمل طور پر اُس بیوٹیشن کے رحم وکرم پر تھی جس کا نام سارہ تھا۔

''آیئے مس ماہ نور۔'' سارہ اُسے لیے سامنے بنے کچھ دروازوں میں سے ایک میں گھس گئی۔ سٹیم باتھ لینے کے بعد جدید تراش خراش کے قیمتی لباس میں ملبوس ماہ نور جب باتھ روم کے دروازے سے باہر آئی تو سارہ کی آنکھوں میں اُس نے اپنے لیے واضح ستائش محسوس کی۔

''واؤ ... اور یجنل بیوٹی۔'' سارہ نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر شیشے کے سامنے رکھی موونگ چیئر پر بٹھا دیا۔ پھر اُس کے چہرے کو تختہ مشق بنانا شروع کر دیا۔ کلینزنگ، مساج، سٹیم اور اس کے بعد میک اپ۔ لمبے لمبے بالوں کو سمیٹ کر عجیب وغریب سے جوڑے کی شکل دے کر ننھی ننھی لٹیں سی بنا کر

چہرے کے اطراف میں بکھرا دیں۔

سادگی، بانکپن، اغماض، شرارت، شوخی

تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اپنے ہی ہاتھوں سے اُسے سجانے سنوارنے کے بعد سارہ نے عجب مبہوتیت سے یہ شعر پڑھا۔ ماہ نور کے چہرے پر سرخی سی پھیل گئی۔ حقیقتاً وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی میں کبھی اتنی خوبصورت بھی دکھائی دے گی۔ شاید جس قسم کے ماحول کی وہ پروردہ تھی وہاں اتنے قیمتی ملبوس، جیولری اور میک اپ کا محض تصور ہی مہنگا تھا۔

''سارہ ... مجھے اب باہر جاتے ہوئے شرم آئے گی۔'' سارہ نے بہت عجیب انداز سے اُسے دیکھا۔

''تم کس قدر بھولی ہو ماہ نور ... ؟'' اگلی بات جیسے سارہ نے دانتوں تلے دبالی۔ ماہ نور نے روپٹہ سیٹ کیا اور پارلر سے باہر آ گئی۔ مریم کے کیبن سے حسب معمول اس کے بولنے کی اونچی اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً کسی اور کو ذہنی طور پر دماغ کھپا رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔

''واؤ ... ماؤ بیوٹی فل یو آر۔'' انتہائی برجستگی کے عالم میں مریم کا کہا گیا یہ جملہ اسے ایک بار پھر شرم وخفت کا شکار کر گیا۔

''اب ایسا بھی نہیں۔'' کمزوری تردید کرتی ہوئی وہ ٹیبل پر سے رجسٹر اٹھا کر اپنے کیبن میں آ گئی۔ ''اگر اس حلیے میں کبھی اماں کے سامنے چلی جاؤں تو وہ تو کبھی مجھے یہ نوکری نہ کرنے دیں۔''

ماہ نور نے ایک نظر اپنے ہاتھوں، پاؤں اور جسم پر ڈالی۔ بہت سی مصنوعی لیپا پوتی نے اُسے اور سے اور ہی کر دیا تھا۔ رجسٹر کھول کر اُس نے نہایت محویت سے تفصیلات دیکھنا شروع کر دیں۔ فیلڈ کا کام اس کی دانست میں تھا تو مشکل لیکن معاوضہ بھی تو بہترین تھا۔ تقریباً دو گھنٹوں میں ہی اُس نے سارا کا سارا رجسٹر کھنگال لیا۔ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ہلکی ہلکی میوزیکل بیل بجی۔

''ماہ نور ... لنچ بریک ہو گئی ہے ... ڈائننگ ہال میں آ جاؤ ... ارے لیکن تمہیں کیا پتہ چلو میرے ساتھ ہی چلو ... اصل میں لنچ آفس کے ذمے ہوتا ہے اور اس وقت سب ماتحت اور میڈم یوں ہوتے ہیں جیسے انتہائی گہرے دوست۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔'' مریم جو کیبن میں جھانک کر اُس سے بات کر رہی تھی آگے بڑھی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کرسی سے اٹھایا اور اگلے ہی پل کیبن سے نکل کر میڈم کے آفس کی سمت چل پڑی۔

''مریم...... میں نے لنچ نہیں کرنا۔'' احتجاج کمزور تھا کیونکہ صبح سے خالی پیٹ تھی اور اس وقت پیٹ میں چوہوں کا ہا کی میچ شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔

"ارے جو تھوڑا بہت دل چاہے کھا لینا۔" میڈم کے آفس کے قریب پہنچ کر دائیں طرف ایک چھوٹی سی راہداری تھی۔ جس کے اختتام پر موجود دروازہ کھلا ہوا تھا اور تقریباً بوتیک کی تمام ماتحت خواتین اور لڑکیاں وہاں موجود تھیں۔ عجب گہما گہمی تھی ماہ نور کو یوں لگا جیسے وہ کسی کی شادی کی تقریب میں آ گئی ہو۔

بڑی بڑی تین میزوں کے اوپر قرینے سے برتن لگے ہوئے تھے۔ چار پانچ برنگ سٹینڈوں کے اوپر دیگچی نما برتن دھرے تھے۔ لڑکیاں آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھیں لیکن کوئی بھی کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہال پر اچانک جیسے خاموشی طاری ہو گئی۔ دروازے سے مسز گیلانی اندر داخل ہو رہی تھیں۔ سیاہ ساڑھی میں ملبوس سفید پرل کے سیٹ نے ان کی شخصیت کو بہت جاذبیت اور وقار بخشا تھا۔

آگے بڑھ کر ایک پلیٹ اور ٹشو پیپر پکڑ کر انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

"کم آن گرلز...... کھانا شروع کریں۔" اور اس کے ساتھ ہی ڈائننگ ہال میں برتنوں کی مخصوص کھنک جاگ اُٹھی۔ دھیمی دھیمی سرگوشیوں کے درمیان اُس نے زندگی کا سب سے منفرد کھانا کھایا۔ اُس نے اچھے حالات ضرور دیکھے تھے لیکن وہ ایک سادہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ سو اس کی اپنی فطرت میں بھی وہی سادگی رچی بسی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ صبح سے لے کر اب تک اُس نے جو کچھ بھی دیکھا وہ اُسے بناوٹی اور پر تصنع لگا تھا۔ بہر حال مجبوری کا نام شکریہ۔ ڈیوٹی آف ہونے سے کچھ دیر پہلے ماہ نور مریم کے کیبن میں آ گئی۔

"مریم کیا میں اس حلیے میں گھر جاؤں گی؟" اس کی بات پر مریم چند ثانیے بغور اسے دیکھنے کے بعد مسکرا دی۔ وہ اس کا تذبذب اور ہچکچاہٹ محسوس کر گئی تھی۔

"ضروری نہیں تم پر ڈیپنڈ کرتا ہے اگر گھریلو پابندی کا خیال ہے تو تم چینج کر سکتی ہو۔ اس سلسلے میں تم پر کوئی پابندی نہیں ہو گی جس طرح دل چاہے کرو۔" اور ماہ نور جب دوبارہ اپنی جون میں واپس آئی تو ایک گہرا سکون بھرا سانس اس کے سینے کی اتھاہ گہرائیوں سے یوں باہر کو لپکا جسے کسی نے قید کر رکھا تھا۔ معصوم بھولا چہرہ دوبارہ پاکیزگیوں کی گواہی دینے لگا جس کی اصل کو سارا دن اُس نے میک اپ کی دبیز تہوں تلے چھپا رکھا تھا۔

ایک طویل عرصے کے بعد آج وہ ہنستی مسکراتی گھر میں داخل ہوئی۔ اماں حسب معمول تخت پر بیٹھی سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔

"اسلام علیکم اماں......" چہکتی ہوئی آواز سن کر اماں نے سر اُٹھا کر اس کے صبیح چہرے کو دیکھا۔ کتنے عرصے کے بعد انہوں نے اس کے چہرے پر اطمینان و سکون دیکھا تھا۔ وہ تو جیسے دوبارہ سے جی

اُٹھی تھیں۔

"وعلیکم السلام! آ گئی میری بیٹی......"

"جی اماں۔" ماہ نور نے آگے بڑھ کر تخت پر بیٹھتے ہی پرس میں سے پندرہ سو روپے نکال کر اماں کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔

"اماں اس ہفتے کی تنخواہ مجھے ایڈوانس ملی ہے۔ گھر کی ضرورت میں خرچ کر دیں۔"

"ارے بیٹا فی الحال اسے اپنے پاس ہی رکھو گھر کی دال روٹی جیسے تیسے چل ہی رہی ہے۔ ابھی ان پیسوں کو بچا کر رکھو جب ضرورت پڑے گی تو لے لوں گی۔" اماں نے اسے پیسے واپس کرنے چاہے۔

"اماں آپ اپنے پاس ہی رکھیں اور اب ختم کریں یہ سب۔ جلدی سے کچھ کھانے کو دیں قسم سے سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

"دن کو کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔"

"اماں دن کا کھانا آفس کی طرف سے ہوا کرے گا لیکن اتنا عجیب و غریب سا سسٹم ہے کہ دل چاہنے کے باوجود کچھ کھایا پیا ہی نہیں گیا۔ یوں لگ رہا تھا سب روبوٹ ہیں۔ اماں گھر کی دال بھی باہر کے مرغن کھانوں سے بھلی۔ بس اب جلدی سے لائیں جو بھی پکا ہے۔"

"ارے آج تو میں نے اپنی بیٹی کی پسند کی ڈش بنائی ہے۔ مٹر پلاؤ اور ساتھ رائتہ۔"

"اماں رہنے دیں میں خود ہی رسوئی میں جا کر کھا لیتی ہوں۔" پلاؤ اور رائتے کا سن کر اس کی بھوک اور تیز ہو گئی تھی۔ وہ جلدی سے رسوئی میں چلی گئی۔ پلاؤ گرم کر کے پلیٹ میں ڈالا اور کٹوری میں رائتہ ڈال کر وہیں پیڑھی پر بیٹھ کر کھانے لگی۔

"ویسے اماں ایک بات ہے۔ بوتیک کے اندر کا ماحول انتہائی محفوظ ہے۔ سارا دن سکون سے گزر گیا۔ سب لڑکیاں آپس میں بالکل دوستوں کی طرح ہیں یہاں تک کہ میڈم ہیں تو بہت بااصول لیکن ماتحتوں کے ساتھ ان کا رویہ بہت دوستانہ ہے۔ ایک عرصے کی کوششوں کے بعد بہترین جاب ملی ہے بالکل میرے خیالات کے مطابق۔"

"چلو بیٹا تم مطمئن ہو، خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔"

"اماں...... یہ شاہین، راہین وغیرہ کہاں ہیں؟" کافی دیر بعد گھر کی خاموشی کا احساس ہوتے ہی اُس نے پوچھا۔

"راہین اور ماہین سو رہی ہیں اور شاہین اوپر چھت پر ہے۔ کہہ رہی تھی پیپرز نزدیک ہیں اس لیے اب زیادہ تیاری کر رہی ہے۔"

''اماں...... مجھے شاہین کی بہت فکر ہے۔ کچے ذہن کی ہے سمجھ نہیں آتا کس طرح اس کا خیال رکھا جائے۔ اب امید تو نہیں کہ کبھی اس طرح کی حماقت وہ دوبارہ کرے گی لیکن پھر بھی ایک ذمہ داری تو ہے ناں۔''

''ہاں بیٹا ٹھیک کہتی ہو تم...... میرے تو مانو پیروں تلے سے دھرتی کھسک گئی تھی جب غیاث کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ یقین جانو یہ غیاث مجھے کچھ اچھا آدمی نہیں لگتا لیکن اُس نے تو فرشتہ رحمت کی طرح میری بچی کو بچالیا۔ میرے تو دل سے دعائیں نکلتی ہیں اس کے لیے۔''

''اماں...... آپ وقتاً فوقتاً شاہین کو اونچ نیچ سمجھاتی رہا کریں تاکہ اس کے ذہن میں دوبارہ اس قسم کا خیال نہ آنے پائے۔''

''آپی...... آپ کب آئیں؟'' سیڑھیوں سے اُترتی شاہین نے اُسے مخاطب کیا تو اس کے ہونٹوں کی بات ہونٹوں میں ہی دبی رہ گئی۔

''کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔ تم کیا کر رہی ہو؟''

''وہ آپی ڈیٹ شیٹ آگئی ہے ایگزامز کی' سائنس کے سبجیکٹ ہیں' مشکل اور توجہ طلب۔ سو کوشش کر رہی ہوں کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنی پوزیشن قائم رکھوں۔ یوں بھی فضول قسم کے مشغلوں میں اُلجھ کر میرا بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔'' شاہین کے لہجے میں اپنے کیے کی پشیمانی کے ساتھ ساتھ سچ کی حلاوت بھی گھلی ہوئی تھی جو بیک وقت ماہ نور اور اماں دونوں کے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ ماہ نور نے ایک نظر اماں کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر پھیلے یقین آمیز تاثر کو دیکھ کر اُس نے مزید کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھی اور اُٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سارے دن کی تھکان جیسے یکدم اُس پر آن وارد ہوئی تھی۔ اُس نے خود کو چارپائی پر جیسے گرایا اور چند لمحوں میں ہی اردگرد سے یکسر غافل ہو چکی تھی۔

☆............☆............☆

''پچھلے پندرہ سال میں ایک ایک پل' ایک ایک لحظہ میں نے تم سے فقط ایک ہی سوال کیا ہے لیکن تم آج تک جواب نہیں دے پائی۔ جانتی ہو تم نے کتنے بڑے رشتے کی' کتنے قیمتی جذبے کی کس قدر توہین کی ہے۔ تم تو عورت کہلانے کی حقدار نہیں تھیں پھر اوپر والے نے تمہیں عظیم رتبہ کس لیے عطا کیا؟ تم نے جنت کی شبیہہ کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ اُجلے دامن، اُجلے چہروں پر کالک مل کر تمہیں کیا مل گیا؟ شاید تم کبھی نہ جان سکو کہ چمکتی چیزوں کے پیچھے بھاگنے والے بسا اوقات اپنی وقعت بھی کھو بیٹھتے ہیں اور تم...... تم نے تو خود کو خاک کے ذروں سے بھی کہیں زیادہ بے وقعت کر کے رکھ دیا ہے۔ تم سے وابستہ تعلق بچپن سے لے کر آج تک میرے لیے ذلت و لعنت کا ایک طوق رہا ہے اور بس۔ کاش زندگی میں کبھی تم سے میرا سامنا ہو اور میں تمہارے اس خوبصورت چہرے کے نقوش کو تیزاب ڈال کر مسخ کر سکوں۔ اسی خوبصورتی پر ناز تھا ناں تمہیں۔ اسی حسن کو ہتھیار بنا کر تم نے اتنا بڑا قدم اُٹھایا تھا ناں۔ کیسی لگو گی تم جلے ہوئے سیاہ بدصورت، بے ڈھنگے چہرے کے ساتھ۔ کیا پھر بھی تم لوگوں کے دلوں سے کھیلنے کے فن کو استعمال کر سکو گی؟ تمہارے چہرے کے جھلسے ہوئے خدوخال تاعمر تمہیں یاد دلائیں گے کہ پاکیزہ رشتوں کی توہین کرنے والوں کی سزا کیسی ہوتی ہے؟''

حسب معمول اپنے کمرے کی جھلنگا چارپائی پر لیٹا ہوا وہ سامنے دیوار پر لگی تصویر سے مخاطب تھا۔ اس کے چہرے کے کرخت نقوش میں ایک عجیب طرح کا حزن و ملال' ایک کرب سا گھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں یاسیت اور نفرت نے ایک عجیب سا تاثر قائم کر دیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس تصویر سے باتیں کر کے اسے حاصل کیا ہوتا ہے؟ دیکھنے والا شاید اسے پاگل سمجھتا لیکن وہ خود کو' اپنی تنہائی کو بہلانے کے لیے اس تصویر سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ یہ اور بات کہ باتیں کرتے کرتے جب ماضی اپنی پوری جزئیات سمیت اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تو اس کی بدصورتی اس کے وجود کے اندر وحشت کا ایک جہان آباد کر دیتی تھی۔ اسے اس تصویر والی ہستی سے محبت نہیں تھی اُن دونوں کے درمیان اگر کوئی رشتہ تھا تو وہ تھا نفرت کا۔ بے انتہا نفرت کا اور یہ رشتہ پچھلے پندرہ سال سے قائم تھا اور یہی لگتا تھا کہ اس کے ساتھ ہی اس رشتے نے ختم ہونا تھا۔ جلتی ہوئی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اُس نے اپنے اندر سسکتے سناٹوں اور اندھیروں کو شمار کرنا شروع کر دیا کہ نیند تو ازلوں سے ہی روٹھی ہوئی تھی۔ شاید وہ تب تک نیند کی پلکوں سے سویا تھا جب تک اس کی آنکھیں محض دنیا کا حسن دیکھ پائی تھیں۔

☆............☆............☆

''ماہ نور...... تمہیں میڈم بلا رہی ہیں۔'' مریم ہاتھ میں کپڑوں کا ڈھیر اُٹھائے عجلت میں اسے پیغام دے کر سامنے ریپئرنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ماہ نور نے جلدی سے پین اور لیٹر پیڈ اُٹھایا اور آفس کی طرف جانے لگی۔ کاؤنٹر کے پاس دو تین خواتین کھڑی کچھ لین دین میں مصروف تھیں۔

''ماہ نور......'' کاؤنٹر گرل نے اُسے آواز دی۔

''ہاں...... کیا بات ہے؟''

''کچھ وقت دے سکتی ہو؟''

''میڈم کی بات سن کر آتی ہوں۔''

''او کے۔''

آفس کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی دروازہ خود بخود کھل گیا جیسے اسی کے انتظار میں ہو۔ میڈم دروازے کے بالکل قریب کھڑی تھیں اور دروازے کی ناب پر اُن کا ہاتھ تھا۔

''اوہ...... ماہ نور میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کم ان ہری اپ۔'' میڈم کا اضطراری انداز اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی میڈم...... کیا کوئی خاص کام تھا؟''

''ہاں...... کل سے تمہارا فیلڈ ورک شروع ہو رہا ہے۔ ان سے ملو یہ ہیں سلیم انصاری صاحب۔ فیلڈ ورک میں تمہارے ساتھ معاون کے طور پر کام کریں گے اور سلیم صاحب یہ ہیں ماہ نور جن کا میں نے ابھی ابھی آپ سے تذکرہ کیا تھا۔'' سلیم انصاری ایک درمیانی عمر کا قدرے کیم شحیم شخص تھا۔ بھاری چہرہ آدھے سے زیادہ مونچھوں اور داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں بھی سیاہ شیشوں کی عینک لگائے وہ اُسے بہت ہی عجیب وغریب شخصیت لگا۔

''ہیلو مس ماہ نور...... آپ کو میڈم نے بتایا ہوگا کہ فیلڈ ورک میں کیا کچھ شامل ہے؟''

''جی سر...... کچھ میڈم اور مریم نے بتایا تھا اور کچھ میں نے خود رجسٹر اسٹڈی کیے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے آپ اپنا کام تو سمجھ گئی ہوں گی۔''

''جی سر...... کافی حد تک سمجھ چکی ہوں۔ یوں بھی یہاں کا ماحول بہت کوآپریٹو ہے۔ سو میں کافی ایزی فیل کر رہی ہوں۔''

''ویری گڈ...... یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ او کے میڈم پھر میں چلتا ہوں اب کل ہی ملاقات ہوگی۔'' سلیم انصاری بمشکل کرسی پر سے کھڑا ہوا۔ ماہ نور کو اس کی شخصیت میں کچھ ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوئی تھی بلکہ اُس نے ماہ نور پر کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا لیکن فیلڈ ورک اس کی جاب کا حصہ تھا اور یہ بات شروع سے ہی اس کے علم میں تھی سو مجبوراً یا خوشی سے اُسے یہ کام کرنا تو ضرور تھا۔

''میڈم...... میں چلوں۔'' سلیم صاحب کے جاتے ہی ماہ نور بھی جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''ہاں...... ہاں جاؤ۔'' میڈم کے چہرے پر پھیلی بے چینی اور اضطراب اُس کی نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔

''میڈم کیا بات ہے......؟ آپ کچھ پریشان ہیں؟''

''نہیں...... بس یہ کاروباری مسائل پریشان کرتے ہیں۔ خیر ایسی کوئی بات نہیں تم جاؤ میں ٹھیک ہوں۔''

ماہ نور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ کاؤنٹر گرل جویریہ ہنوز ان خواتین کے ساتھ برسرِپیکار تھی۔ ''ہاں جویریہ...... تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟''

''جسٹ اے منٹ پلیز......'' وہ کاؤنٹر کے پاس رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہی

خواتین کے ساتھ بحث میں مصروف ہوگئی۔ پتہ نہیں کس قسم کی لیچڑ خواتین تھیں جان ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ پندرہ پندرہ سو کے تین سوٹ لے کر ٹوٹل پندرہ سو عنایت کر رہی تھیں جو کسی صورت قابلِ قبول نہیں تھا۔ آخر ساڑھے تین ہزار لے کر جویریہ نے اُن سے جان چھڑائی۔

''تو یہ ہے ہماری صنف کی یہ سب سے بری صورت ہے۔ پتہ نہیں خواتین بازار جا کر اس قسم کی حرکتیں کرنا اپنا فرض کیوں سمجھتی ہیں جو قیمت کہو اس کا ایک چوتھائی بتائیں گی اور پھر اُس پر ڈٹ جائیں گی۔'' جویریہ مسلسل دو گھنٹے سر کھپانے کے بعد کچھ نڈھال اور بے قرار نظر آنے لگی تھی۔ پھر وہ ماہ نور کی طرف متوجہ ہوگئی جو دلچسپی سے اس کے اور ان خواتین کے درمیان ہونے والے مکالمے سن رہی تھی۔

''ہاں ماہ نور میری تم سے نہ تو دوستی ہے اور نہ ہی قرابت داری لیکن تمہارے بارے میں رائے بہت اچھی ہے۔'' جویریہ نے یکدم ٹاپک بدلا، ماہ نور کچھ حیرت سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

''یہاں پر کام کرنے والی تقریباً تمام لڑکیاں ہی بہت اچھی ہیں۔ تعاون کرنے والی، اچھے اخلاق کی مالک اور سلجھی ہوئی۔''

''لیکن اس وقت ان سب میں اور تم میں ایک نمایاں فرق ہے جسے تم سمجھ نہیں پاؤ گی۔''

''ہاں میں جونیئر ہوں اور تم سینئر۔'' ماہ نور کے لیے جویریہ کا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔

اس کی بات سن کر جویریہ کے چہرے پر مضمحل سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں وہ سینئر ہیں اور تم جونیئر۔''

''جویریہ کیا بات ہے؟ تم اس طرح ناقابلِ فہم باتیں کیوں کر رہی ہو؟''

کس قدر مضطرب ہے دل لیکن
ہونٹ کھولوں تو بات ہو نہ سکے

''جویریہ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناں؟'' ماہ نور حقیقتاً پریشان ہوگئی تھی۔

''آں...... ہاں...... ہاں میری طبیعت کو کیا ہونا ہے؟ بس یونہی آج کچھ مایوسی کا دورہ سا پڑا ہوا ہے۔ تم بتاؤ فیلڈ ورک پر کب جا رہی ہو؟''

''کل...... میڈم کہہ رہی تھیں کل دس بجے سلیم انصاری صاحب کے ساتھ میں نے اور تین نیو اپائنٹمنٹ لڑکیوں نے نواحی بستیوں کا چکر لگانا ہے۔''

''ماہ نور...... تمہیں گھر سے اجازت مل جائے گی؟'' جویریہ کے پوچھنے پر ماہ نور کے ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی آ کر دم توڑ گئی۔

''جویریہ ہمارا گھرانا بہت مذہبی ہوا کرتا تھا۔ ابو جی عورتوں کے پردے کے زبردست حامی تھے لیکن ان کی وفات کے بعد گھر کا سارا سیٹ اپ مجھے ہی سنبھالنا ہے۔ سو گھر کے بہت سے اصول

توڑنے پڑیں گے۔ ہمارے خاندان میں آج تک کسی لڑکی نے نوکری نہیں کی۔ میں پہلی لڑکی ہوں جو نوکری کے سلسلے میں گھر سے باہر آئی ہوں۔"

"ہاں..... گھر کی چاردیواری کا مضبوط حصار توڑ کر باہر آنا عورت صرف انتہائی مجبوری میں ہی گوارا کرتی ہے۔ یوں بھی عورت کا اصل مقام چاردیواری کے بیچ ہے لیکن اپنے ساتھ رہنے والوں کی سانسوں کا بوجھ بانٹنے اور جینا آسان بنانے کے لیے کسی نہ کسی کو تو قدم بڑھانا پڑتا ہے۔"

جویریہ کے لہجے میں کیا تھا' تاسف، پریشانی، پچھتاوا یا ندامت وہ سمجھ نہیں پائی۔ وہاں سے اُٹھ کر اپنے کیبن میں جانے کی بجائے وہ مریم کے کیبن کی طرف بڑھ گئی۔ مریم سامنے بڑا سا پیپر چارٹ پھیلائے کسی ڈریس کی ڈیزائننگ میں مصروف تھی۔

"ماہ نور..... شکر ہے تم آ گئیں۔ میں ابھی تمہاری ہی طرف جانے والی تھی۔ یہ ڈیزائن اور رنگوں کا کنٹراسٹ مجھے کچھ کنفیوز کر رہا ہے۔ ذرا دیکھو۔" ماہ نور کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر ہی مریم نان اسٹاپ بولے گئی اور پیپر چارٹ اس کے سامنے کر دیا۔ میرون انگرکھے پر فیروزی بارڈر اور اس پر رنگین دبکے کے نفیس بیل تھی۔

"اس میں بھلا کنفیوژن کہاں ہے؟ انتہائی پیارا ڈیزائن ہے اور آج کل تو یہ کنٹراسٹ اِن ہے۔"

"کیا سچ مچ اس میں کوئی کمی یا خامی نہیں۔"

"نہیں..... خوبصورت لگے گا تیار ہو کر۔"

"تھینکس گاڈ..... ویسے آج ذہن کچھ بٹا ہوا تھا سو صحیح طرح کام نہیں ہو پا رہا۔ تم بتاؤ فیلڈ میں کب جا رہی ہو؟"

"کل جا رہی ہوں لیکن سب کیوں بار بار پوچھ رہے ہیں؟"

"ارے..... نہیں ایسی کوئی خاص بات نہیں دراصل تم پہلی بار جا رہی ہو ناں اس لیے۔ تمہیں ایکسائٹمنٹ ہو رہی ہو گی؟"

"ظاہر ہے ایکسائٹمنٹ تو ہے لیکن کچھ پریشانی بھی ہے۔ میں گھر سے تنہا پہلی بار نکل باہر جاؤں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں ہمیشہ ابو جی یا پھر اماں کے ساتھ جاتی تھی جہاں کہیں جانا ہوتا تھا۔ اب بالکل اجنبی لوگوں کے ساتھ جانا ہے تو کچھ پریشانی تو ہے بہرحال ایسی بھی نہیں۔"

"چلو خیر..... میڈم نے اور کچھ کہا؟"

"نہیں۔ کام کی کچھ تفصیل بتائی..... سلیم صاحب سے متعارف کروایا اور بس....."

"اچھا مریم میں چلتی ہوں کچھ کام نمٹانے ہیں تاکہ کل پریشانی نہ بنے۔"

ماہ نور اپنے کیبن میں آ گئی۔ پچھلے کھاتے کھنگالنے کے بعد آنے والے کل کی ساری ڈیلنگز نوٹ کیں۔ یونہی کام میں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ آفس ٹائم اوور ہونے کے بعد جب وہ بوتیک سے باہر آئی تو سڑک کے دوسرے کنارے گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی شخصیت اس کے لیے بہت شناسا تو نہیں تھی کہ صرف ایک بار دیکھنے سے اجنبیت دور ہو جاتی لیکن اُسے پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی۔ اپنے دائیں طرف سے تیزی سے سڑک کراس کرتی مریم کو بھی اُس نے دیکھ لیا تھا لیکن اگلے ہی پل نظر آنے والا منظر قطعاً غیر متوقع اور ماہ نور کے لیے ناپسندیدہ بھی تھا۔ مریم تیزی سے گاڑی سے پشت لگائے کھڑے سلیم انصاری کی طرف بڑھی۔ چند لمحوں تک دونوں کے درمیان خوش بیانی رہی اور پھر مریم اسی کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چل گئی۔ ماہ نور نے مریم کے بارے میں بہت اچھی رائے قائم کر رکھی تھی جواب کچھ متزلزل ہو گئی تھی۔ پھر جیسے اُس نے سر جھٹک کر خود کو اپنے ذہن کے ہر قسم کے خیالات کی گرفت سے آزاد کیا اور دھیرے دھیرے بس اسٹینڈ کی جانب بڑھ گئی۔ پوائنٹ آنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے وہ اسٹاپ پر سڑک کے کنارے قدرے فاصلے پر لگے درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ دھوپ کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ پرس میں سے رومال نکال کر اُس نے اپنے چہرے سے بہتا پسینہ صاف کرتے ہوئے یونہی ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر نظریں جہاں کی تہاں ٹھہر گئیں۔ اُس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ سامنے سڑک پر سگنل کے بدلنے کے انتظار میں کھڑے موٹر بائیک پر موجود لڑکا اُس کے لیے اجنبی سہی لیکن لڑکی نہیں تھی۔ اس کے ہر بن مو سے پسینہ نکلنے لگا۔ شرم اور ندامت نے دھڑکنوں کو روک دینا چاہا لیکن زندگی کہاں اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑتی ہے۔ کاش آنکھیں صرف مرضی کی چیزیں دیکھ پاتیں یا پھر ایسا منظر دیکھنے سے قبل مردہ ہو جاتیں۔ ماہ نور کے ذہن میں یکے بعد دیگرے جانے کتنے ہی چہرے گھوم گئے۔ ابو جی کا چہرہ بارعب اُدھیڑ عمر شریف آدمی، اماں ساری زندگی صبر اور قناعت، سادگی میں گزر بسر کرنے والی نیک دل عورت، غیاث جس کی ایک مہربانی ایک احسان اس کے کندھوں کا بوجھ تھا۔ زندگی اُس کے لیے مشکلات کے دریچوں وا کیے دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے کی دبیز چادر بن گئی۔ تیورا کر گرتے گرتے اُسے یہی لگا جیسے کسی نے آگے بڑھ کر اُس سہارا دیا ہو۔

"بیٹی..... بیٹی آنکھیں کھولو کیا ہوا ہے تمہیں؟" آنکھیں بدقت تمام کھول کر اس نے خود پر جھکی ہوئی پرشفقت خاتون کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں شناسائی تو نہیں تھی لیکن خلوص تھا' مروت تھی۔

"کچھ نہیں آنٹی..... بس یونہی چکر سا آ گیا۔"

''دیکھو بیٹا پریشانیاں زندگی کا حصہ ہیں۔ میں نہیں جانتی تمہاری پریشانی کا سبب کیا ہے لیکن فی الوقت میں تمہیں اس حالت میں تنہا سفر نہیں کرنے دوں گی۔ وہ سامنے میری کار کھڑی ہے۔ آؤ جہاں کہو گی ڈراپ کر دوں گی۔''

''نہیں آنٹی آپ کا بے حد شکریہ میں..... میں اب ٹھیک ہوں۔ میں چلی جاؤں گی۔'' ماہ نور نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ اس وقت وہ بس اسٹینڈ پر رکھے سیمنٹ کے ایک بنچ پر دراز تھی۔ اپنی حالت دیکھ کر اُسے ندامت سی محسوس ہوئی۔ پھر شا کی نظریں سامنے روڈ پر جم گئیں جہاں سے کچھ دیر قبل موٹر بائیک پر وہ لڑکا اور لڑکی گزر رہے تھے۔

''تکلف میں نہ پڑو..... مجھے بھی اپنی ماں ہی سمجھو۔ تمہیں اس حالت میں یوں تنہا چھوڑ کر چلی جاؤں' میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا..... اُٹھو شاباش۔'' انہوں نے اس کے سر سے ڈھلکی ہوئی چادر اچھی طرح اوڑھاتے ہوئے ایک ہاتھ میں اس کا پرس اٹھایا اور دوسرا ہاتھ سہارے کے لیے اس کی طرف بڑھایا۔ جسے اس نے بغیر رد و قدح تھام لیا کہ بار بار ان کے خلوص کو ٹھکرانا اُس نے مناسب خیال نہیں کیا۔ گاڑی کا بیک ڈور کھول کر انہوں نے اُسے اندر بیٹھا دیا اور خود فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئیں۔ گاڑی میں خنک آمیز نیم تاریکی تھی۔

''چلو شہسوار .....'' اُن خاتون نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو مخاطب کیا۔

''ہاں بیٹا..... تم بتاؤ تمہیں کہاں ڈراپ کرنا ہے؟''

''شاہو گڑھی.....'' اس نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

''مما..... شاہو گڑھی کس طرف ہے؟'' قدرے تمسخرانہ انداز میں اُن خاتون کے دائیں طرف بیٹھی شخصیت نے پوچھا۔

''بری بات شاری..... چلو گاڑی چلاؤ۔ تم محلے سے باہر گاڑی روک دینا اور ہاں بیٹا آپ کچھ لینا چاہیں گی کوئی کولڈ ڈرنک یا پھر آئس کریم۔''

''نہیں آنٹی..... شکریہ۔'' بیک ویو مرر میں سے جھانکتی سیاہ شرارتی مسکراتی آنکھیں اُسے اس وقت انتہائی غصہ دلا رہی تھیں۔ اُسے اس گاڑی میں بیٹھنا ہی نہیں چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس اس کی ماں بہت پر خلوص اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ بہر حال باقی کا سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ محلے کی گلی کے آغاز پر اُسے اُتار کر وہ تیزی سے گاڑی بھگا لے گیا اور وہ گلی میں داخل ہو گئی۔ دو سرخ آنکھوں میں اُسے آج اپنے لیے بہت مختلف سے جذبات نظر آئے۔ حیرت، بے یقینی، تاسف اور شاید کچھ پریشانی بھی لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اُن بولتی آنکھوں کو نظر انداز کرتی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی جیسے اس کے ذہن نے پلٹی کھائی اور آج کا واقعہ

پوری طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

گھر کے صحن میں لگے واحد ہار سنگھار کے درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر ماہین اور راہین بیٹھی سکول کا کام کر رہی تھیں۔ اماں تخت پر بیٹھی سبزی بنانے میں مصروف تھیں۔

''السلام علیکم اماں.....'' ماہ نور کی متلاشی نگاہیں سارے گھر میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔

''اماں..... شاہین کہاں ہے؟'' اماں کے سلام کے جواب انتظار کرنے کی بجائے اُس نے عجلت سے پوچھا تو اماں نے قدرے متعجب نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

''ابھی ابھی سکول سے واپس آئی ہے۔ کیوں کیا بات ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں اماں..... یونہی ماہین، راہین کو بیٹھے دیکھا تو اس کا خیال آ گیا۔''

''السلام علیکم آپی۔'' شاہین یونیفارم میں ملبوس کمرے سے برآمد ہوئی۔ ماہ نور کی نظریں انتہائی گہرائی سے اس کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کو تو وہ گڑبڑا سی گئی۔ پھر ماہ نور نے اس کے چہرے پر سے نگاہیں ہٹا لیں۔ وہ کیسے شاہین کے چہرے کے بھولپن سے متاثر ہو گئی تھی اس کی مصنوعی معصومیت میں چھپا بھید اماں کی جہاندیدہ نگاہوں سے کیسے چھپا رہ گیا؟

''شاہین..... تمہارے ایگزام کب شروع ہو رہے ہیں؟''

''ایک ماہ رہ گیا ہے آپی۔ کیوں؟''

''بس یونہی میں چاہتی ہوں کہ تم سکول کی بجائے گھر بیٹھ کر امتحان کی تیاری کرو۔ اصل میں سکول میں آخری دنوں میں پڑھائی تو کچھ خاص ہوتی نہیں اسٹوڈنٹس کا مفت میں وقت برباد ہوتا ہے۔''

''نہیں آپا ہمارے سکول میں اس طرح نہیں ہوتا۔ آج بھی بیالوجی کے ایکسپیریمنٹ کی وجہ سے ہی میں گھر لیٹ آئی ہوں تقریباً روزانہ ہی کوئی نہ کوئی پریکٹیکل ہوتا ہے۔'' ماہ نور کی گہری نظروں نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''ارے بیٹا..... سکول میں مل بیٹھ کر پڑھ لیں گی۔ گھر میں تو کبھی ادھر کا کام کبھی ادھر کا کام نکل آتا ہے۔ وقت ضائع ہو جاتا ہے۔'' اماں کی بات سن کر ماہ نور نے فی الحال کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ شام کو جب شاہین اپنی کتابیں اُٹھا کر چھت پر پڑھنے کے لیے گئی تو ماہ نور دبے قدموں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ سامنے چھت پر بچھی چارپائی پر کتابیں تو موجود تھیں لیکن شاہین موجود نہیں تھی۔ چھت کی منڈیر سے چپکی کھڑی وہ ساتھ کے گھر کی چھت پر کھڑے لڑکے سے خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

''ارے اسد..... تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی۔ میں نے کچھ اس طرح اپنی بے گناہی کا یقین دلا دیا ہے کہ اماں تو اماں آپا بھی میرا جھوٹ نہیں پکڑ سکیں۔ تم یہ بتاؤ

تم کل اوپر کیوں نہیں آئے تھے؟ میں کتنی دیر تک انتظار کرتی رہی۔'' شاہین کی شوخ چنچل آواز کسی ہتھوڑے کی مانند اس کے سر پر وار کر رہی تھی۔ معصوم سی شاہین اس قدر چالباز اور ایسے کردار کی مالک نکلے گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ خدا جانے سکول میں کیسی سوسائٹی کی لڑکیوں کی صحبت میں رہتی تھی۔ ماہ نور کو یہ صورتحال انتہائی بیہودہ محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کا حل کیا ہو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ انہی قدموں واپس سیڑھیاں اُتر گئی۔ رات کو جب سب کھانے سے فارغ ہو کر اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے تو ماہ نور نے اپنی چارپائی کھسکا کر شاہین کی چارپائی کے بالکل ساتھ لگا دی۔ دن بھر کی تھکی اماں بستر پر لیٹتے ہی غش ہو گئیں۔

''شاہین..... مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے لیکن پہلے ایک وعدہ کرو کہ جو کچھ کہوں گی تم اس کا برا بھی نہیں مانو گی اور کہا مانو گی بھی۔''

''آپی..... جو بھی کہنا ہے کہیں۔ آپ کو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟'' ماہ نور نے شاہین کی آنکھوں میں جھانکا۔ کہیں بناوٹ، تصنع یا ریا کا نام تک نہ تھا۔

''تم نے ارشد سے راہ و رسم بڑھا کر جو غلطی کی تھی کیا اس پر اب بھی نادم ہو؟''

''ہاں آپی .... سارے لڑکے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ میں اُس غلطی پر ہمیشہ شرمندہ رہوں گی اور آئندہ کبھی ایسی کسی سوچ کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دوں گی۔''

''شاہین آج موٹر سائیکل پر تمہارے ساتھ کون تھا؟'' ماہ نور نے کڑی نظروں سے اُسے گھورا جو اپنا جھوٹ پکڑے جانے پر اب ''کاٹو تو بدن میں لہو نہیں'' کی نظیر بنی بیٹھی تھی۔

''کک..... کون آپی ..... کہاں..... میں..... میں تو..... موٹر سائیکل پر....''

''دیکھو شاہین جھوٹ مت بولو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں اس لڑکے کے ساتھ موٹر سائیکل پر دیکھا اور کیا تم یہ بھی جھٹلاؤ گی کہ تم چھت پر پڑھنے نہیں بلکہ اسد کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے جاتی ہو۔'' کوشش کے باوجود ماہ نور کا لہجہ تلخی سے مبرا نہ رہ سکا۔

''آپی..... دوسری اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دیں۔ میرا وعدہ رہا آئندہ آپ کو ایسی کوئی شکایت نہیں ملے گی۔'' شاہین کے چہرے پر گہری شرمندگی کا تاثر تھا۔ خدا جانے وہ اتنی بہترین اداکاری کیسے کر لیتی تھی؟۔

''شاہین معاف کرنا نہ کرنا ایک الگ بات ہے۔ تم نے کل سے سکول نہیں جانا اور نہ ہی چھت پر۔ گھر بیٹھ کر امتحان کی تیاری کرو۔''

''آپی..... میں نے وعدہ تو کر لیا ہے۔'' مری مری آواز میں شاہین نے استدعا کی۔

''نا ڈیلو دس ٹاک' میں نے جو کہہ دیا ہے رتی بھر اُس میں رد و بدل کی گنجائش نہیں۔'' ماہ نور

نے یہ کہہ کر اس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا لیکن وہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کی عادی تھی۔ اگلے دن صبح جب وہ بوتیک جانے کے لیے تیار ہوئی تو شاہین کو گھر کے کپڑوں میں کتابیں کھولے بیٹھے دیکھ کر کچھ مطمئن تو ہوئی لیکن زیادہ نہیں۔ شاہین اپنا اعتبار کھو چکی تھی اور اعتبار ایسا شیشہ ہے جو ٹوٹ کر دوبارہ جڑے بھی تو اُس میں ہمیشہ کے لیے بال آ جاتا ہے۔ سو مکمل طور پر اطمینان نہ ہونے کے باوجود اُس نے اپنے ذہن کو قدرے ہلکا محسوس کیا۔ بوتیک میں داخل ہوتے ہی کاؤنٹر پر کھڑی مریم سب سے پہلے اس کی نگاہوں کی زد میں آئی۔ کل کا واقعہ یاد آتے ہی اُس نے کترا کر گزر جانا چاہا۔

''گڈ مارننگ ماہ نور۔'' پیار بھرا لہجہ اُسے قدم روکنے پر مجبور کر گیا۔ وہ پلٹ کر کاؤنٹر کے پاس آئی۔ رجسٹر کھول کر وقت لکھا اور سائن کیا۔ جویریہ کی استقبالی مسکراہٹ کا جواب دیتی وہ سیدھا میڈم کے آفس کی طرف بڑھی۔

''میڈم آف پر ہیں' آفس میں سلیم صاحب تمہارے منتظر ہیں۔ جاتے ہوئے عظمیٰ اور ارم کو بلا لینا وہ میرے کیبن میں ہوں گی۔'' مریم نے پیچھے سے اُسے انفارم کیا اور وہ سر ہلاتی ہوئی آفس میں داخل ہو گئی۔ سامنے میڈم کی سیٹ پر سلیم انصاری براجمان تھا۔

''آؤ..... آؤ ماہ نور بیٹھو۔'' اس کے لہجے کی بے تکلفی ماہ نور کو ایک آنکھ نہ بھائی۔

''سر..... کس وقت جانا ہے؟''

''بیٹھو چلیں گے ایسی جلدی بھی کیا ہے؟'' چہرے پر پھیلی خباثت بھری مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

''دراصل مجھے ایک دو کام نمٹانے تھے اس لیے پوچھا تھا۔'' ماہ نور بمشکل اپنے لہجے کی ناگواری پر قابو پا سکی۔

''او کے تم کام نمٹا لو' ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹا باقی ہے۔''

''او کے سر۔'' وہ آفس سے باہر آ گئی۔ ''اس شخص کے ساتھ زیادہ دیر گزارنا سرے سے ناممکن ہے۔ ناپسندیدہ آدمی۔'' ماہ نور دل ہی دل میں اُسے برا بھلا کہتی اپنے کیبن میں آ گئی۔ بڑے بڑے دو شاپروں میں نئے آنے والے کپڑوں کے سوٹ پیس رکھے تھے۔ اُس نے عظمیٰ کو بلا کر قمیضوں کا کپڑا الگ کروایا۔ ہم رنگ دوپٹے ایک الگ شاپر میں رکھے اور مریم کے کیبن میں آ گئی۔

''مریم تم نے جو نئے ڈیزائن بنائے ہیں ان کی کاپی دے دو۔ تا کہ اُس حساب سے آرڈر دیا جا سکے۔'' ماہ نور کے مخاطب کرنے پر مریم نے خاموشی سے وہ کاپی اُسے تھما دی۔ ماہ نور نے بھی اس کی خاموشی کو زیادہ نوٹ نہیں کیا اور وہ کاپی لے کر اپنے کیبن میں آ گئی۔ انٹرکام کی بیل مسلسل بج رہا

تھی۔ گویا آفس میں اس کا بلاوا تھا۔

''جی سر۔''

''ماہ نور۔ کہاں تھیں آپ؟ کافی دیر سے انٹرکام آن کیا ہوا ہے۔'' سلیم انصاری کی آواز قدرے برہمی لیے ہوئے تھی۔

''سر مریم کے کیبن میں تھی اُس نے چند نئے ڈیزائن تیار کیے ہیں جو میں کاریگر عورتوں کو دینا چاہتی ہوں۔ اسی لیے اُس سے وہ کاپی لینے گئی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ اب آپ عظمیٰ اور ارم کو لے کر بوتیک سے نکلیں میں بھی آ رہا ہوں۔''

ماہ نور نے اپنی چادر ٹھیک سے اوڑھی، پرس اور ڈیزائنز والی کاپی ہاتھ میں تھامی اور مریم کے کیبن کی طرف بڑھ گئی۔

''عظمیٰ...... ارم چلو بھئی جلدی کرو سلیم صاحب باہر گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں۔ او کے مریم اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' مریم نے بظاہر خوشدلی سے جواب دیا۔

''عظمیٰ تم ایسا کرو میرے کیبن میں جو کپڑوں کے دو بڑے شاپر ہیں وہ اٹھا لو۔''

تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے ماہ نور نے کہا۔ کاؤنٹر پر حسبِ معمول جویریہ چند کسٹمر خواتین کے ساتھ بقول مریم بک بک میں مصروف تھی۔ اُسے جاتا ہوا دیکھ کر لحظہ بھر کو اس کی چلتی زبان رُک گئی۔ اُس نے ماہ نور کو آواز دینا چاہی لیکن بوتیک کے دروازے پر کھڑے سلیم انصاری کو دیکھ کر الفاظ جیسے اس کے اندر ہی گھٹ گئے۔ ماہ نور اُسے الوداعی ہاتھ ہلاتی بوتیک کا گلاس ڈور عبور کرتی چلی گئی۔ سڑک پر کھڑی بلیک نسان وہی تھی جس میں کل مریم کو سوار ہوتے دیکھ کر اُسے بہت برا لگا تھا۔ عظمیٰ فرنٹ ڈور کھول کر آگے بیٹھ گئی وہ یوں بھی ماڈرن خیالات رکھنے والی لڑکی تھی جبکہ ارم اور وہ دونوں سفید پوش گھرانوں کی پروردہ تھیں۔ گاڑی لاہور کی مصروف شاہراہوں پر دوڑتے دوڑتے یکدم ٹرن لے کر ایک انتہا پوش علاقے میں داخل ہو گئی۔ قطار در قطار انتہائی خوبصورت کوٹھیاں جن میں سے بیشتر نئی تعمیر شدہ لگ رہی تھیں۔

''یہاں میڈم کے پارٹنر سیٹھ حبیب الرحمٰن رہتے ہیں۔ میڈم نے بطور خاص ہدایت کی تھی کہ آپ کو اُن سے ملوایا جائے۔ وہ اس سلسلے میں آپ کو کچھ بریفنگ دینا چاہتے ہیں۔ سیٹھ صاحب کا نام تو سنا ہوگا آپ نے؟'' سلیم انصاری انفارمر کم خوشامدی زیادہ لگ رہا تھا۔

''اس شہر میں تین بہت بڑی گارمنٹ فیکٹریوں کے وہ تنہا مالک ہیں۔ اس کے علاوہ بیرون ملک ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بھی بہت وسیع پیمانے پر ہے۔ یقیناً اُن سے مل کر آپ کو خوشی

ہوگی۔'' وہ خود ہی سوال کیے جا رہا تھا اور خود ہی تفصیل بتائے جا رہا تھا۔ آخر کار ان کی منزل آ گئی۔ ایک وسیع و عریض کوٹھی کے کھلے گیٹ سے گاڑی اندر لے جاتے ہوئے اُس نے ان تینوں کو کنکھیوں سے دیکھا۔

''عظمیٰ اور ارم چونکہ آپ کے انڈر ہیں اس لیے یہ گاڑی میں رہیں گی۔ ماہ نور آپ میرے ساتھ چلیں۔'' وہ گاڑی کا دروازہ کھولے اس کا منتظر کھڑا تھا۔ ماہ نور شش و پنج میں پڑ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے ازلی اعتماد کے ساتھ گاڑی سے اُتری اور سلیم انصاری کے ساتھ چل پڑی۔ ابھی وہ کوریڈور عبور کر کے وسیع و عریض لاؤنج میں آئی تھی کہ اُسے گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

''سر یہ تو آپ کی گاڑی کی آواز ہے۔''

''نہیں میری گاڑی کھڑی ہے۔ آپ چلیے۔'' لاؤنج میں پڑے صوفے پر اُسے بٹھا کر وہ کہیں غائب ہو گیا۔ ماہ نور کو یہ سب کچھ اور اس کوٹھی کا یہ خاموش سا ماحول بہت عجیب لگ رہا تھا اُس نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر سجائے جانے والے ڈیکوریشن پیس بھی عجیب ہی نوعیت کے تھے۔ بڑے بڑے خنجر اور تلواریں، مختلف جانوروں کے سروں کے ساتھ یقیناً دوسروں کو مرعوب و مبہوت کرنے کے لیے کافی تھے لیکن وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔

''ویلکم... ویلکم ٹو مائی ہوم مس ماہ نور...'' اس کے بالکل سامنے والے دروازے سے سلیم انصاری کے ساتھ جو شخصیت برآمد ہوئی تھی اُسے دیکھ کر ماہ نور کو کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا تھا۔ چھ فٹ قد کے ساتھ بھاری بھرکم وجود کو وہ تقریباً گھسیٹتا ہوا اس کے سامنے پڑے صوفے پر آ براجمان ہوا۔

''ماہ نور --- یہ ہیں مسٹر نظامانی کے بزنس پارٹنر ون اینڈ اونلی سیٹھ حبیب الرحمٰن اور سیٹھ صاحب یہ ہیں ماہ نور آپ کی نئی سب کوآرڈینیٹ۔'' سلیم انصاری کے لہجے سے خوشامد کا شیرہ ٹپک رہا تھا۔

''اسم بامسمیٰ ہیں آپ، خوشی ہوئی... بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر....'' سیٹھ کی آنکھیں عجب وحشت انگیز چمک سے لبریز تھیں۔ ''کیا کوالیفکیشن ہے آپ کی؟''

''سر..... بی۔ اے کے ساتھ ٹیکسٹائل پینٹنگ کا ڈپلومہ لے رکھا ہے۔ ایم اے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن حالات نے اجازت ہی نہیں دی۔'' ماہ نور کی آنکھوں کے سامنے ابو جی کا شفیق چہرہ آ گیا جن کی محبت اور توجہ کے باعث اُس نے اپنی علمی کاوشوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ جانے کتنے ہی خواب تھے جو ابو جی اور اس کی آنکھوں میں مشترکہ اہمیت آمیز وجود رکھتے تھے اور جوان کے بے وقت چلے جانے سے چکنا چور ہو گئے تھے لیکن اب ماہ نور دو آنکھوں کے خواب بھول گئی تھی۔ اس کے پیشِ نظر کئی آنکھوں کے خواب تھے اس نے اپنے خوابوں میں اپنے بہن بھائیوں کو حصے دار ان کی کامیابی بھی تو اُس کی کامیابی تھی۔

''آپ کس سوچ میں گم ہوگئیں مس ماہ نور؟'' سیٹھ کی آواز بھی اس کے وجود کی طرح ہی بھاری بھرکم تھی۔ ماہ نور جیسے جھرجھری لے کر ہوش و خرد کی دنیا میں لوٹ آئی۔

''کہیں نہیں سر......'' وہ گویا جھینپ سی گئی۔

سیٹھ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور صوفے کے قریب پڑی ٹیبل پر رکھی بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ جانے کس سمت سے باوردی ویٹر نمودار ہوا۔

''عبدل... تمہاری نااہلی پر اب کیا سزا دی جائے؟ کتنی دیر ہوگئی ہے مہمانوں کو آئے ہوئے۔'' سیٹھ خشمگیں نظروں سے آنے والے کو گھور رہا تھا۔ وہ شخص جس کا نام عبدل پکارا گیا تھا سر جھکا کر سیٹھ کی سخت ڈانٹ سننے کے بعد ایڑیوں پر گھوما اور تیزی سے جس طرف سے آیا تھا اُسی طرف کو لوٹ گیا۔

''اچھا سیٹھ صاحب...... مجھے اجازت دیں چند ضروری کام نمٹانے ہیں۔'' سلیم انصاری صوفے پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے......تم کسی گامے ماجھے کے گھر میں نہیں سیٹھ حبیب الرحمٰن کے دولت کدے پر ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خالی منہ واپس لوٹ جاؤ۔ تمہاری مرضی اور پسند کی چیز تو آج دستیاب نہیں بہرحال جو ہم پئیں گے تم بھی پی لینا۔'' سیٹھ بائیں آنکھ دبا کر بولا۔ ماہ نور دونوں کی طرف بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کا ذہن جیسے کھٹک سا گیا تھا۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے نکلنا چاہتی تھی لیکن سلیم انصاری کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی اسی شش و پنج میں تھی کہ عبدل ٹی ٹرالی گھسیٹتا ہوا لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ ٹرالی انواع و اقسام کی اسنیکس اور ہلکی پھلکی چائے کے ساتھ پیش کی جانے والی چیزوں سے بھری پڑی تھی۔ سیٹھ نے ٹرالی گھسیٹ کر ماہ نور کے سامنے رکھ دی۔

''مس ماہ نور... آپ اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر دیں۔'' سیٹھ کا سارا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ ماہ نور نے چار و ناچار دو کپ کافی تیار کر کے ایک کپ سیٹھ صاحب کو اور دوسرا سلیم انصاری کو تھما دیا۔

''ارے آپ نے اپنے لیے کیوں نہیں بنایا؟''

''مجھے کافی پسند نہیں۔''

''ارے تو چائے کے لوازمات بھی موجود ہیں آپ اپنے لیے چائے بنا لیں۔''

''سوری سر لیکن چائے بھی میں شوق سے نہیں پیتی۔ یوں بھی گرمی کی اس شدت میں چائے نہیں پی جاسکتی۔''

''ارے تو تکلف کی کیا بات؟ چلیں آپ کے لیے کولڈ ڈرنک منگوا لیتے ہیں۔'' ماہ نور نے اردگرد دیکھا ٹیبل پر پانی کا جگ رکھا تھا۔

''سر... ایک گلاس پانی چاہیے۔'' سیٹھ نے گلاس میں پانی ڈال کر ماہ نور کی سمت بڑھا دیا۔ ماہ نور ایک ہی سانس میں گلاس چڑھا گئی۔ پیاس کی شدت کے باوجود اُسے پانی کا ذائقہ عجیب سا لگا لیکن اُس نے غور نہیں کیا۔

''سلیم صاحب... اب چلیں۔'' اس نے سلیم انصاری کو دیکھا جو مختلف چیزوں سے پلیٹ کو بھرے بری طرح کھانے میں مصروف تھا۔ وہ جب سیٹھ صاحب کی کسی بات کا جواب دیتا تو کھانے کی دوران اس کے منہ سے نکلنے والی آواز بہت مضحکہ خیز لگتی تھی۔

''چلتے ہیں چلتے ہیں اب بیٹھ ہی گئے ہیں تو کچھ دیر اور سہی۔ یوں بھی سیٹھ صاحب بہت دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔'' سلیم انصاری کے جواب پر اُس نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پیچھے ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی اور خاموش نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے دماغ میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں جیسے نیند کا خمار سا ہلکورے لینے لگا۔ دماغ سن ہونے لگا اور ہاتھ اور پیر جیسے بے جان سے ہونے لگے۔

''سلیم صاحب... اٹھیں چلیں میری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' سلیم انصاری نے ایک نظر سیٹھ صاحب کو دیکھا اور پلیٹ ٹرالی میں رکھ کر سرعت سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماہ نور نے بھی اس کی تقلید کی لیکن اس کی رفتار سست تھی۔ جتنی دیر میں وہ بیرونی دروازے تک پہنچی، سلیم انصاری دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔ دروازہ دھاڑ کی آواز سے بند ہو گیا۔ ماہ نور نے دروازے پر پہنچ کر اس کی ناب گھمائی لیکن دروازے کو شاید باہر سے لاک کر دیا گیا تھا۔ ماہ نور نے زور زور سے دروازہ بجایا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے باہر سرے سے ہی کوئی موجود نہ ہو جبکہ اُس نے کوٹھی میں داخل ہوتے وقت گیٹ پر چوکیدار اور بیرونی دروازے پر دو سکیورٹی گارڈز کو دیکھا تھا۔ پھر ایک فرد تو کوٹھی کے اندرونی حصے میں موجود تھا جسے عبدل کے نام سے پکارا گیا تھا۔

''سیٹھ صاحب... دروازہ کسی نے باہر سے بند کر دیا ہے۔'' ماہ نور کی آواز میں بھی قدرے لرزش آ گئی تھی۔ اُس نے پلٹ کر سیٹھ کو مخاطب کیا جو نہایت اطمینان سے سگار سلگانے میں مصروف تھا۔ اُسے یہ کوٹھی اس وقت کسی چوہے دان کی طرح لگ رہی تھی جس میں سے نکلنے کا راستہ نہ تھا۔

''اوہو ماہ نور... پریشان کیوں ہوتی ہو؟ یہاں آ کر بیٹھو۔ میں ابھی دروازہ کھلوا دیتا ہوں۔''

''نہیں آپ پہلے دروازہ کھلوائیے۔'' اس کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔ سیٹھ زیر لب مسکراتے ہوئے اُٹھا۔ اس کے اٹھتے اٹھتے بھی ماہ نور نے ایک بار پھر دروازہ دھڑ دھڑا دیا تھا۔

''ایک منٹ رُک جاؤ۔ میں نے کہا تو ہے دروازہ کھلواتا ہوں میں۔'' سیٹھ کے آگے بڑھنے پر ماہ نور ایک دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سیٹھ نے آگے بڑھ کر ہاتھ بلند کیا لیکن اُس نے دروازہ نہیں بجایا

تھا بلکہ اندر سے بھی چٹخنی چڑھا دی۔

''سیٹھ صاحب یہ..... یہ آ..... آپ کیا کر رہے ہیں؟'' چکراتے گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے وہ کانپتے لہجے میں گویا ہوئی۔

''وہی..... مس ماہ نور جو مجھے کرنا چاہیے۔'' سیٹھ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ ماہ نور کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات آ گئے۔

''چھوڑو مجھے..... چھوڑو خدا کے لیے چھوڑو مجھے۔'' ماہ نور کا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو سیٹھ سے چھڑانے میں مصروف تھی لیکن سیٹھ کی آہنی گرفت میں محض تڑپ کر رہ گئی۔

''چھوڑ کیسے دوں.....؟ یہاں آنے والے آتے اپنی مرضی سے ہیں لیکن جاتے میری اجازت سے ہیں۔'' سیٹھ نے اُسے صوفے کی طرف دھکیلا۔ ماہ نور کٹتے ہوئے شہتیر کی طرح صوفے پر گر گئی اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کی چیخ و پکار سیٹھ کے لیے بالکل بے معنی تھی کیونکہ کوٹھی کا اندرونی حصہ کچھ ایسے بنایا گیا تھا جہاں سے کوئی چیخ و پکار نہ باہر جا سکتی ہے اور نہ اندر آ سکتی ہے۔

اس کی کیفیت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی اُسے اتنا تو علم ہو گیا تھا کہ جگ میں موجود پانی میں پہلے سے ہی کچھ ملایا گیا تھا لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح خود کو اس عفریت نما انسان کی دستبرد سے بچائے۔ اُس نے ایک بار پھر بچاؤ کے لیے حلق کے بل چلا کر گویا کسی نادیدہ نجات دہندہ کو پکارا۔ اس کے ساتھ ہی کوریڈور کے دروازے پر باہر سے دستک ہوئی۔ ایک بار..... دو بار..... تین بار پھر جیسے کوئی انتہائی غصے کی حالت میں مسلسل دروازہ دھڑ دھڑانے لگا۔ سیٹھ نے جو ماہ نور کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا آگے بڑھ کر اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ماہ نور نے خود کو چھڑانے کی کوشش میں اپنے آپ کو پیچھے دھکیلا لیکن وہ سیٹھ سمیت ہی صوفے پر آ رہی تھی۔ سیٹھ نے ایک ہاتھ سے ماہ نور کی دونوں کلائیاں جوڑ کر پکڑ رکھی تھیں اور ایک ہاتھ سے اس کے سر کے بالوں کو اپنے آہنی شکنجے میں لے کر تقریباً بے بس کر دیا تھا۔ ماہ نور کی کمزور پڑتی مزاحمت زیادہ دیر تک سیٹھ کے ارادوں میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔

''یا الٰہی..... میری حفاظت اور عزت اب تیرے ہاتھ میں ہے۔ مولا مجھے اس درندے سے بچا لے۔'' ساکت ہوتی نبضوں اور دھڑکنوں کے دوران اس کے دل سے دعا نکلی اور اس کے ساتھ ایک دھماکے کی آواز آئی۔ بجھتی آنکھوں کے ساتھ اُس نے بھی سیٹھ کی نظروں کی تقلید میں دیکھا۔ دھماکے کی آواز کوریڈور کی سمت سے آئی تھی۔ کوریڈور کے دروازے کے چٹخنی والے حصے میں ایک گہرا شگاف پڑ چکا تھا۔ دروازہ دھاڑ سے کھلا اور ایک ہی جست میں کوئی لاؤنج کے اندر داخل ہو۔ وہ ایک طویل

قامت نقاب پوش تھا جس کی آنکھوں پر سیاہ شیشوں کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریپیٹر تھا جو اُس نے سیٹھ پر تان لیا۔ سیٹھ نے ماہ نور کو صوفے پر ہی چھوڑا اور خود اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کک..... کون ہو تم.....؟ اندر کیسے آئے.....؟ شہزاد..... واصف..... کہاں مر گئے ہو تم دونوں؟'' سیٹھ کی آواز میں قدرے بوکھلاہٹ تھی لیکن نووارد کے لیے اس کا کہا گیا ایک بھی لفظ معنی نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے لمحے کی تاخیر کیے بغیر ریپیٹر کا فائر کر دیا۔ ماہ نور نے گم ہوتے حواسوں کے ساتھ سیٹھ کی پشت پر سے کپڑوں اور گوشت کے پرخچے اڑتے دیکھے اور پھر ہوش کی دنیا سے بہت دور چلی گئی۔

جانے کتنی دیر اس کے ذہن کا رابطہ دنیا سے منقطع رہا۔ شاید کوئی بھیانک خواب تھا جو اُس نے دیکھا تھا یا پھر اگر وہ حقیقت تھی تو اُسے آج علم ہوا تھا کہ حقیقت کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے اُسے دھیرے دھیرے ہوش آ رہا تھا۔ شاید وہ اپنے گھر میں تھی اس کے بے حد قریب کوئی بیٹھا نہایت نرمی سے اُسے پکار رہا تھا۔ اُسے چہرے پر ٹھنڈک آمیزی کا فرحت بخش احساس ہو رہا تھا کہ حواس جیسے بحال ہو رہے تھے۔ کسی نے اس کے حلق میں چند قطرے ٹھنڈے پانی کے ٹپکائے تھے۔ چٹختی لکڑی جیسے سوکھے حلق کے تر ہوتے ہی اُس نے نہایت دھیرے سے آنکھیں کھولیں لیکن اپنی سامنے بیٹھی شخصیت کو دیکھ کر وہ بدک کر تیزی سے پیچھے ہٹی اور کسی چیز سے ٹکرا گئی۔ اُس نے لمحے بھر میں ہی گرد و پیش کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ اس وقت کسی گاڑی میں تھی اور اس کے سامنے وہی سیاہ پوش موجود تھا۔ چہرے کے دھاتے پہنے ہاتھ میں پانی کی بوتل پکڑے وہ اُسی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ رگ و پے میں جیسے وحشت دوڑنے لگی تھی۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ کس طرح یہاں سے خود کو بچائے۔ نقاب پوش نے اس کی خوفزدہ آنکھیں اور ان آنکھوں میں پھیلتے واہمے اور وسوسوں کے سائے دیکھ لیے تھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے ٹھہرنے کو کہا اور خود گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور وہ سے ہاتھ سے باہر نکلنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ماہ نور جلدی سے گاڑی سے باہر نکل آئی۔ نقاب پوش نے دروازہ بند کیا۔ کچھ دیر کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر تیزی سے پلٹ کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر کے یہ جا وہ جا۔ ماہ نور ورطۂ حیرت میں پڑ گئی۔ شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قسمت اتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے۔ پتہ نہیں کون تھا یہ مہربان شخص؟ کیا سیٹھ کا کوئی کارندہ؟ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ سیٹھ کے ملازم تو وہاں پہلے سے موجود تھے ان کے لیے تو یہ سب روز کا معمول ہو گا۔ انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ ایک مظلوم لڑکی کی مدد کرتے؟ پھر وہ کون تھا؟ جو عین وقت پر رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ کیا وہ سب جانتا تھا اور اگر جانتا تھا تو کیسے اور کس طرح؟

بہت سے سوالات ماؤف ذہن میں چکراتے پھر رہے تھے لیکن اسے کسی سوال کے جواب کا علم نہیں تھا۔ جہاں نقاب پوش نے اُسے ڈراپ کیا تھا وہ ایک سنسان سڑک تھی۔ دور دور تک کسی قسم کی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ وہ ایک بار پھر گھبرا گئی لیکن اللہ کا نام لے کر سمت کا تعین کر کے چل پڑی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی پیدل مسافت کے بعد سامنے بارونق اور مصروف شاہراہ نظر آنے لگی اس کے بے جان پڑتے قدموں میں جیسے جان سی آ گئی۔ تیز تیز قدم اُٹھاتی وہ مین روڈ پر پہنچ گئی۔ اُس نے دائیں بائیں دیکھا قدرے فاصلے پر اُسے بس اسٹینڈ نظر آ گیا۔ وہ اس طرف کو چل پڑی۔

''اے مس شاہوگڑھی.....کہاں جا رہی ہیں آپ؟ چلیے میں ڈراپ کر دوں آپ کو۔'' قدرے شناسا آواز پر اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ سلور گرے کرولا اس کے بالکل قریب آ رُکی تھی۔

''تھینک یو...... میرا پوائنٹ آ گیا ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔ آپ کی بہت مہربانی۔'' ماہ نور نے قدرے رُکھائی سے کہہ کر قدم آگے بڑھائے تو شہسوار بھی کندھے اُچکا کر گاڑی چلا لے گیا۔ ماہ نور نے قدرے ناگوار نظروں سے جاتی ہوئی سلور گرے کرولا کو دیکھا اور آگے کھڑی بس پر سوار ہو گئی۔ اس کا دماغ ابھی پوری طرح اس کے کنٹرول میں نہیں آیا تھا۔ تیز رفتار بس بہت تیزی سے اردگرد کے مناظر کو پیچھے چھوڑے جا رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب والی سیٹ پر بیٹھی تھی اس کے ساتھ بیٹھی خاتون اللہ جانے کون سی دنیا جہان کی باتیں کیے جا رہی تھی۔

''اف توبہ کس قدر باتونی عورت ہے۔'' ماہ نور کے کانوں میں جیسے سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔

''ارے بہن بس کیا بتاؤں منے کے ابا تو اپنی عادت کے ایک ہیں۔ انہوں نے تو یوں پکڑی بہن کی چوٹی اور یوں گھر سے نکال باہر کیا۔ چنڈال آئے روز گھر میں ڈنڈا ڈالنے آ دھمکتی تھی۔'' وہ خاتون شاید اپنی نند کے متعلق گوہرافشانی فرما رہی تھیں لیکن ماہ نور کے حواس کہاں اس کے ساتھ تھے اس کا وجود تو ابھی تک خفیف سی لرزش کی زد میں تھا۔ دھڑکنوں پر خوف کا تسلط تھا۔

''ارے بہن کیا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی ہو؟ توبہ ہے جو کسی ایک بات کا جواب بھی دیا ہو۔'' وہ خاتون شاید اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آ گئی تھیں۔ سو ناراضگی کے اظہار کے طور پر منہ پھیر کر بس میں اردگرد نگاہیں دوڑانے لگیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد اپنے سامنے والی سیٹ پر براجمان اپنے ہی جیسی خاتون کے ساتھ محوِ گفتگو ہو گئیں۔

''شاہوگڑھی.....شاہوگڑھی۔'' کنڈیکٹر نے صدا لگائی۔

''بھائی میں نے اُترنا ہے۔''

''روکو جی بس کو استاد جی۔'' بس کے رُکتے ہی ماہ نور اُتر کر سڑک کے بالکل سامنے والی کھلی گلی میں داخل ہو گئی۔ اس وسیع گلی کے نکڑ سے اس کے گھر والی گلی شروع ہوتی تھی۔ چاچے ساجے کی دُکان

پر حسبِ معمول غیاث کھڑا تھا۔

''چاچا پانچ روپے کے سگریٹ تو دینا۔'' ماہ نور کو ایک نظر دیکھ کر اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

''ارے میاں سگریٹ بھی پیتے ہو اور بچت بھی کرتے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟'' چاچے نے ہنستے ہوئے خالی گولڈ فلیک کی ڈبی میں آٹھ سگریٹ رکھ کر اس کے حوالے کر دیئے۔

''اوہو چاچا.. تم نہ باز آنا باتوں سے!''

گھر تک پہنچتے پہنچتے بھی غیاث کی بھاری آواز اس کے کانوں تک آ رہی تھی۔ گھر کا بیرونی دروازہ حسبِ معمول کھلا ہوا تھا۔ صحن میں ماہین اور گڈو کھیل رہے تھے۔ شاہین نلکے کے نیچے برتن رکھے انہیں دھونے میں مصروف تھی۔ اماں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بوجھل بوجھل سے انداز میں صحن کی چارپائی پر ہی دراز ہو گئی۔ سینے میں دھڑکتا دل خوف اور وحشت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے آپی... کیا بہت تھک گئی ہیں؟'' دُھلے ہوئے برتن اُٹھا کر رسوئی کی جانب جاتی شاہین نے اس کے قریب رُک کر بغور اس کے پژمردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں.. آج بہت تھک گئی ہوں.. اماں کہاں ہیں؟''

''وہ پڑوس میں گئی ہیں۔ خالہ آمنہ کی نند فوت ہو گئی تھیں پچھلے ہفتے۔ فاتحہ کے لیے گئی ہوئی ہیں وہاں۔'' شاہین نے جاتے جاتے چٹ کر جواب دیا اور رسوئی میں گھس گئی۔

ماہ نور کے وجود کا رواں رواں ایک ان دیکھی اذیت کے حصار میں تھا۔ آج جو کچھ ہوا تھا اس نے اسے ذہنی و جذباتی لحاظ سے بالکل شکستہ کر کے رکھ دیا تھا۔

''اگر وہ مہربان شخص وقت پر نہ پہنچتا تو... اگر سیٹھ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتا تو.....''

تو سے آگے کا تصور اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا وہ کمرے میں جانے کے لیے چارپائی سے اُٹھی۔

ایک قدم.. دو قدم... تین قدم.. پھر جانے اُسے کیا ہوا۔ شاید اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ تیورا کر وہیں صحن کے وسط میں گر پڑی۔ دھڑام کی آواز کے ساتھ شاہین اور ماہین دونوں تیزی سے بھاگ کر صحن کی طرف لپکیں۔ ماہ نور کو بے ہوش پڑا دیکھ کر تو جیسے دونوں کو ہی ہاتھ پاؤں پڑ گئے۔

''ماہی..... جاؤ بھاگ کر خالہ آمنہ کے ہاں سے اماں کو بلا لاؤ۔'' شاہین نے ماہین سے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ کر ماہ نور کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔

''آپی...... آپی آنکھیں کھولیں۔'' وہ اس کے گال تھپتھپا رہی تھی اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ آج ماہ نور کے حواسوں نے کتنی بڑی آزمائش میں سرخروئی

حاصل کی تھی۔ شاید اس لیے تھک گئے تھے' نڈھال تھے۔ شاہین نے ماہ نور کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ راہین ماہ نور کی کبھی ہتھیلیاں سہلانے لگتی اور کبھی پاؤں کے تلوے۔

''راہین... پانی لے کر آؤ۔'' شاہین نے ماہ نور کی صبیح پیشانی پر پسینے سے چپکے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے راہین سے کہا۔ اس اثناء میں بیرونی دروازے سے اماں افتاں و خیزاں اندر داخل ہوئی۔ برقع انہوں نے ایک طرف چارپائی پر پھینکا اور تیزی سے آگے بڑھ کر ماہ نور کے قریب بیٹھ گئیں۔

''نور... میری بچی کیا ہوا...؟ آنکھیں کھولو۔'' اماں گھبرائی ہوئی تھیں۔ شاہین نے راہین کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر ماہ نور کے منہ پر چند چھینٹے مارے۔ ماہ نور قدرے کسمسائی۔

''آپی... آپی آنکھیں کھولیں۔'' ماہ نور کو شاہین کی آواز ایسے محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ کسی گہرے کنویں یا کھائی سے اُسے پکار رہی ہو۔ اُس نے بمشکل نیم وا آنکھوں سے پہلے اماں اور اپنے اوپر جھکی راہین اور شاہین کو دیکھا۔

''نور...... کیا بات ہے بچی؟ آنکھیں کھولو...... کیا ہوا بتاؤ مجھے؟'' اماں کے چہرے پر تفکر اور آنکھوں میں شدید پریشانی کا تاثر انتہائی واضح تھا۔ ماں کا مہربان چہرہ دیکھ کر اب تک کے جمع شدہ اعصاب و حواس روئی کے گالوں کی طرح منتشر ہو گئے۔ آنکھوں کے گوشوں سے آنسوؤں کی قطار بہنے لگیں۔

''نور... نور...... میری بچی۔'' اماں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کے رونے سے وہ جیسے تڑپ ہی گئی تھیں۔

''اماں...... اماں وہ...... وہ نوکری چھوٹ گئی......!!!''

''ارے تو اس میں رونے والی کون سی بات ہے ایک در بند سو در کھلے۔ اللہ کوئی اور سبب پیدا کر دے گا۔ تم کیوں اس طرح رو رو کر دل چھوٹا کر رہی ہو؟ دل ہی دہلا دیا میرا۔'' اماں کو اس کے جواب سے اطمینان ہو گیا۔ ورنہ تو اس کے بری طرح رونے سے وہ بوکھلا ہی گئی تھیں۔

''ایسا کرو میں چائے بناتی ہوں۔ ایک کپ چائے پی لو اور کچھ دیر کے لیے سو جاؤ۔ اب پریشان نہ ہونا۔ اللہ نے چاہا تو تمہیں اس سے بھی اچھی نوکری مل جائے گی۔'' اماں جیسے اُسے بہلا رہی تھیں۔

''نہیں اماں کسی چیز کو جی نہیں چاہ رہا۔ بس میں کچھ دیر کے لیے سونا چاہتی ہوں۔'' وہ اپنے بوجھل دماغ کے ساتھ گھر کے کسی فرد کے ساتھ بات چیت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اُس نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

''چلو بچو...... باہر چلو...... تمہاری آپی اب سوئیں گی۔ شور مت کرنا۔'' اماں حیران و پریشان خاموش کھڑے بچوں کو اپنے ہمراہ لیے کمرے سے باہر نکل گئیں اور جاتے جاتے دروازہ بند کر دیا۔ ماہ نور نے ایک طویل سانس لیا۔ اللہ کی رحمت پر یقین تو اُسے پہلے بھی بہت تھا لیکن آج معجزوں پر بھی یقین ہو گیا۔ ایک ان دیکھے' ان جانے شخص نے کس طرح بروقت پہنچ کر اس کی عزت و حرمت بچالی تھی۔ اس رحمت کے فرشتے کے باعث وہ گندگی کی دلدل میں گرنے سے بال بال بچی تھی۔ ایک ایسی دلدل جس میں گر جانے والوں کے لیے کوئی مقامِ عافیت نہیں ہوتا۔ اس کی سوچوں کا دھارا جانے کدھر سے کدھر کو بہتا چلا جا رہا تھا۔ آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ اُس نے دماغ کو ہر قسم کی سوچ سے آزاد کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چند لمحے سکون کے گزارنا چاہتی تھی۔ سو اس نے خود کو نیند کی پرسکون آغوش کے حوالے کر دیا۔

☆...... ☆...... ☆

دیمک لگے دروازے کے کواڑ ایک بھدی سی آواز پیدا کرتے ہوئے کھل گئے۔ وہ کھلے دروازے سے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ گھر اس کے لیے خانہ عافیت تھا۔ اس گھر میں اس کے بچپن کی یادیں تھیں۔ کہیں وہ ماں کی گود میں ہمکتا ہوا دکھائی دیتا تو کہیں کسی کونے میں باپ کے ڈر سے چھپ کر روتا ہوا۔ سسکتے ہوئے بچپن کے الوژنز تھے جو اس گھر میں اس کے ساتھ ساتھ جیتے تھے' سانسیں لیتے تھے۔ اس کے دکھ درد بانٹتے تھے اور اپنے دکھ درد سناتے تھے۔ اُسے ان الوژنز سے پیار تھا بالکل ایسے ہی جیسے ایک ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے بچوں کو آپس میں ہوتا ہے اور ہاں اس گھر میں وہ تصویر بھی تو تھی جس کا اس کی ذات سے گہرا تعلق تھا۔ جس سے شدت کی نفرت تھی مگر جسے دیکھے بغیر اُسے سکون بھی نہیں تھا۔ اس تصویر نے اُس کے بچپن کی معصومیت غصب کی تھی وہ کیسے اسے فراموش کر دیتا؟ اسے فراموش کرنا اپنی ذات کو فراموش کرنے کے مترادف تھا اور وہ خود فراموش نہیں تھا۔ اُسے دنیا میں جینا بھی آتا تھا اور تنہا اپنی ذات کی گہرائیوں میں اُترنے کا سلیقہ بھی تھا۔ آج سے پندرہ سال پہلے اس گھر کی جو حالت تھی اُس نے اُس میں رتی برابر بھی تبدیلی نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گھر اپنی اصل ہیئت کھو چکا تھا۔ دیواروں پر سے جابجا پلستر اُکھڑ کر انہیں چیچک زدہ کر چکا تھا۔ صحن کے وسط میں کبھی کنواں اور چرخی لگی ہوئی ہوتی تھی وہاں اب محض ایک گڑھا سا رہ گیا تھا۔ لوگوں نے اس کے صحن میں بنے ہوئے کنویں سے کوڑے دان کا کام لینا شروع کر دیا تھا اور اُس نے بھی منع نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ باہر کی غلاظت اندر کی غلاظت سے کہیں بہتر ہوتی ہے کیونکہ اس کی صفائی ممکن ہے۔ یوں بھی وہ دن کا صرف کچھ حصہ اس گھر میں گزارتا تھا۔ سو لوگوں کو اُس نے کبھی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ اپنے گھر کی تنگی کی باعث گھر آئے مہمانوں کو اس کے گھر ٹھہرا

دیتے تھے اور اس لحاظ سے کئی لوگ اس کے معترف بھی تھے۔ اُس نے ایک نظر صحن میں جابجا پھیلے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کو دیکھا اور جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ جھاڑو اُٹھا کر صحن کی صفائی میں جت گیا۔

''منے بیٹا..... ذرا رانی کو پکڑنا میں صحن میں جھاڑو لگا لوں۔''

''اونہوں اماں۔''

''ارے بیٹا بڑوں کی بات مانتے ہیں۔ دیکھو کیسے بری طرح رو رہی ہے؟ چلو اپنا کرو یہ لو پیسے اسے باہر سے گھما بھی لاؤ اور چیز بھی لے لینا۔'' دور بہت دور کہیں سے اس کی اور اس کی ماں کی آواز کی بازگشت سُنائی دے رہی تھی اس کی آنکھوں میں کچھ چبھنے لگا۔ اُس نے جھاڑو وہیں صحن میں رکھ دی اور خود بھی نم آلود کچی زمین پر بیٹھ کر گھٹنوں میں سر دے لیا۔

''یہ یادیں کب تک میرے وجود میں نشتر بن کر اُترتی رہیں گی؟ مجھے ان سے رہائی کب ملے گی؟'' وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا ایک دلیر آدمی اس وقت بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا لیکن اس گھر کے در و دیوار بس سوگوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ سکتے تھے بڑھ کر اُسے اپنی آغوش میں نہیں سمیٹ سکتے تھے' اس کے آنسو نہیں صاف کر سکتے تھے۔ کچھ دیر تک رونے سے اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا پڑ گیا۔ وہ یونہی اُٹھا اور گھر کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ خالہ کلثوم کسی کے گھر سے نکل رہی تھیں اُسے یوں جاتے دیکھ کر سمجھ گئیں کہ آج پھر اُسے اُداسی کا دورہ پڑا ہے۔ وہ اس کی ہمسائیگی میں تھیں اور جب کبھی وہ یہاں آتا یا رہتا تھا وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اب بھی انہوں نے آگے بڑھ کر پہلے صحن میں جھانکا۔ کمروں کو تالے لگے ہوئے تھے۔

''ارے آج تو یہ کمرے میں بھی نہیں گیا.....'' وہ خود سے ہمکلامی کرتی ہوئی اس کے گھر کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا کر اپنے گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔

☆..........☆..........☆

''آپی..... آپی.....'' شاہین اُسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ اُس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اس کی سمت دیکھا۔

''کیا ہے..... کیا بات ہے؟''

''وہ..... وہ آپی باہر..... پولیس آئی ہے۔''

''پولیس.....'' ماہ نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں سے نیند یکدم اُڑنچھو ہو گئی۔

''کیا کہا تم نے..... پپ..... پولیس؟''

''ہاں آپی..... پولیس اور وہ آپ کا پوچھ رہے ہیں۔''

''لل..... لیکن میں نے کیا کیا ہے؟'' ماہ نور مضطرب سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیٹھ حبیب الرحمٰن کے نقاب پوش کے ہاتھوں قتل کا واقعہ آ گیا۔

''کل رات کسی نے آپ کی بوتیک کی مالک مسز نظامانی کو قتل کر دیا ہے۔ پولیس اسی سلسلے میں وہاں کی تمام ملازمت پیشہ لڑکیوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔''

''مسز نظامانی..... قتل ہو گئیں؟'' ذہن میں ایک طرحدار خوبصورت عورت کا نفیس سراپا گھوم گیا۔ ساتھ ہی ذہن کے کسی گوشے میں نقاب پوش کی شبیہہ ہلکورے لے رہی تھی۔

''تو کیا مسز نظامانی کو بھی.....!!!''

''آپی..... آپ چلیں باہر پولیس دروازے پہ کھڑی ہے۔ اماں تو پہلے ہی بہت پریشان ہو رہی ہیں کہ شریفوں کا محلہ ہے لوگ کیا کہیں گے؟ نہ باپ نہ بھائی تو پھر یہ پولیس گھر کی عورتوں سے کیا پوچھ تاچھ کرنے چلی آئی ہے؟'' شاہین کی بات پر ماہ نور نے چارپائی سے اُٹھ کر چپل پاؤں میں اڑسے اچھی طرح دوپٹہ پھیلا کر اوڑھنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئی۔ صبح کا وقت تھا، اماں رسوئی کے دروازے کی اوٹ لیے صحن میں کھڑے تین عدد پولیس والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ سپاہیوں نے ماہ نور کو آتے دیکھ لیا تھا اس لیے اب مکمل توجہ اس کی طرف مبذول کر لی۔

''آپ ہیں مس ماہ نور؟'' اُن میں سے ایک نے جو اے۔ایس۔آئی تھا' پوچھا۔

''جی ہاں.....'' ماہ نور پریشان ہو رہی تھی لیکن چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔

''کیا آپ جانتی ہیں کہ پیرا ڈائز بوتیک کی مالک مسز نظامانی کل رات تقریباً ساڑھے سات بجے قتل ہو گئی ہیں؟''

''جی ہاں سر ابھی چند لمحے پہلے میری بہن نے مجھے بتایا ہے۔''

''آپ کو بوتیک میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟''

''یہی کوئی چار دن۔''

''اوہ تو آپ نیو اپوائنٹڈ ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''پھر تو آپ مسز نظامانی کو زیادہ نہیں جانتی ہوں گی۔''

''جی نہیں..... سر..... میری اُن سے کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ میں تو اپنی ایک دوست کے توسط سے وہاں جاب کے لیے گئی تھی۔ وہ پیرا ڈائز بوتیک کی مستقل گاہک تھی۔''

''بہر حال مس ماہ نور' محض دفتری خانہ پُری کے لیے ہمیں آپ کا بیان بھی لینا پڑے گا اور بوقت ضرورت آپ کو تھانے آنے کی زحمت بھی کرنا پڑے گی۔'' اے۔ایس۔آئی کی باتیں ماہ نور

کے اوسان خطا کیے دے رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس کے چکر میں پڑ جانے والوں کا حشر کیا ہوتا ہے۔

''اچھا مس ماہ نور...... اب ہم چلتے ہیں۔'' تینوں یکے بعد دیگر گھر سے نکلتے چلے گئے۔ انہیں دیکھ کر کھلے دروازوں سے لٹکی عورتوں نے جھٹ پٹ دروازوں کے کواڑ لگا لیے۔ شاید وہ سب یہ جاننے کو بے تاب تھیں کہ ان کے محلے کے ایک گھر میں پولیس کس لیے آئی ہے؟

''آئے ہائے...... آمنہ نے بتایا کہ آپا کے گھر پولیس آئی ہوئی ہے۔ میری تو مانو پیروں سے جیسے جان ہی نکل گئی۔ بھلا کیوں آئے تھے یہ موئے پولیس والے مردود؟''

دروازے سے ہی خالہ پروین لشتم پشتم چلی آ رہی تھیں۔ محلے بھر کی بی جمالو۔ بھلا پیٹ میں مروڑ نہ اُٹھنے لگ جاتے اگر جو ذرا دیر ہو جاتی تو۔

''ارے نہیں بہن پروین...... ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔'' اماں نے ٹالنا چاہا۔

''ارے پھر بھی پتہ تو چلے؟'' خالہ پروین ناک پر عینک چڑھاتے ہوئے کچر کچر پان چباتے ہوئے بولنے لگی۔ ان کی ایکسرے مشین جیسی آنکھیں بدستور ماہ نور کے وجود پر گڑی ہوئی تھیں۔

''ارے بہن...... جس جگہ ماہ نور کام کرتی تھی ناں بہت مالدار آسامی تھی وہ عورت کروڑوں میں کھیلتی تھی۔ کسی نے پیسے کی خاطر قتل کر دیا۔ اب پولیس تفتیش کرتی پھر رہی ہے۔'' اماں نے مختصراً تفصیل بتا کر جان چھڑائی۔

''تو ماہ نور بچی سے کیا تفتیش کرتی پھر رہی ہے یہ پولیس؟'' خالہ پروین کے ذہن میں جو کھٹک رہا تھا ابھی تک وہ اُن پر ظاہر نہیں ہو پایا تھا سوان کا اضطراب دیدنی تھا۔

''بھئی یہ بھی تو وہاں کام کرتی تھیں۔ ساری ملازمت پیشہ لڑکیوں سے کچھ نہ کچھ پوچھا ہو گا۔ خدانخواستہ اس پر شک تھوڑی کیا گیا ہے جو تم یوں بے چین ہوئی جا رہی ہو۔'' اماں کا اضطراب جواب دینے والا تھا۔

''ارے بہن تم تو برا مان گئی۔ میں تو بچی کی محبت میں کشاں کشاں چلی آئی۔ تمہیں اچھا نہیں لگا تو بی بی معاف کرنا۔'' خالہ کے آنے کا مقصد تو پورا ہو ہی چکا تھا۔ برقعہ سر پر جمائے باقی کا سارے کا سارا حصہ سمیٹ کر بازو پر دھرے وہ پان چباتی چباتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

''ایک تو اس عورت کو کسی پل چین نہیں۔ خدا معلوم اپنی بے اولادی کا یہ دوسروں سے بدلہ لینے پر کیوں تلی رہتی ہے۔ جب تک سارے محلے سے معلومات اکٹھی نہ کر لے اسے سکون نہیں پڑتا۔'' اماں بھی اُس سے جلی بیٹھی تھیں۔ گھر بھر میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی تھی اور ماہ نور...... اس کے لیے پریشانیوں کا ایک طویل باب کھلنے والا تھا۔

''نور...... میری بچی یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' اماں برآمدے میں تخت پر آ بیٹھی تھیں۔ ماہ

نور بھی سُست قدموں سے چلتی ان کے قریب آ بیٹھی۔

''بیٹا ایک بات پوچھوں...... سچ سچ بتاؤں گی؟'' اماں کے لہجے میں نرمی اور حلاوت تھی جبکہ آنکھوں میں تشویش اُبھر آئی تھی۔

''جی اماں......'' ماہ نور جانتی تھی کہ اماں کیا پوچھیں گی۔

''بیٹا تم نے نوکری کیوں چھوڑ دی؟'' ماہ نور نے اب اماں سے چھپانا مناسب نہ سمجھا لیکن درمیان سے دانستہ سیٹھ اور نقاب پوش والا واقعہ حذف کر گئی۔ وہ جانتی تھی اماں وہمی عورت ہیں۔ پھر انہوں نے اُسے گھر سے باہر نہیں جانے دینا تھا اور اس کے سر پر ابھی ذمے داریوں کا بوجھ تھا۔ ہاں اُسے اپنے ابو جی کی ایک بات پر ہمیشہ عمل کرنا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔'' محتاط لوگ ہمیشہ کم غلطیاں کرتے ہیں۔'' اور وہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط اور بااعتماد ہو جائے گی۔ اپنے اردگرد ایک ٹھوس اور مضبوط خول چڑھا لے گی کہ باہر کی آلودگی اس کے پاکیزہ وجود کو نہیں چھو پائے گی۔

اماں نے جب مسز نظامانی کے سائیڈ بزنس کے بارے میں سُنا تو حیران پریشان رہ گئیں۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میری بچی کہ تم وہ جگہ چھوڑ آئی تھیں۔ وگرنہ خدا معلوم وہ لوگ تمہارے ساتھ بھی کیا سلوک کرتے۔ توبہ توبہ دنیا میں کیا کیا نہیں ہو رہا اللہ معاف کرے۔'' ہمیشہ کی سادہ لوح اماں کے لیے یہ سب بہت اچنبھے کی بات تھی۔

''بس ماہ نور بچی...... اب تمہیں میں نے نوکری کے لیے نہیں جانے دینا۔ ہم روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش ہیں۔ ہمیں نہیں چاہیے کچھ بھی اور۔'' اماں کو واندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

''نہیں اماں ہر جگہ ایسی نہیں ہوتی۔ آپ کی دعا سے میں زندگی میں کامیاب ضرور ہوں گی۔ بس آپ واہموں میں مبتلا نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اماں کو تسلی تو دے رہی تھی لیکن اس کا اپنا دل بھی خوفزدہ تھا۔ شاید تازہ تازہ آکورڈ سچویشن فیس کی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مردوں کے اس معاشرے میں ملازمت کے لیے باہر جانے والی عورتوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اُن کو طرح طرح کے پریشان کن رویوں سے پالا پڑتا ہے۔ لوگ ہر ملازمت پیشہ عورت کو بازاری عورت سمجھتے ہیں لیکن اُسے لوگوں کے خیالات سے کیا لینا دینا تھا۔ وہ تو بس اپنے گھر بھر کے لیے پریشان تھی۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو کسی مقام پر دیکھنا اس کا خواب تھا اور وہ اس خواب کو اپنے دوسرے خوابوں کی طرح چکنا چور نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ سو اُس نے بڑی مشکلوں سے اماں کو آخر منا ہی لیا۔

اگلی صبح ایک بار پھر وہ ایک نئے عزم کے ساتھ گھر سے نکلی۔ اس کی دوست اسما ایک پرائیویٹ سکول میں پرنسپل کی جاب کر رہی تھی اور اس کا خیال بھی یہی تھا کہ وہ اس کے سکول میں جاب کر لے۔ جب وہ سکول کی عمارت کے سامنے پہنچی، ریسس ہو چکی تھی۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ ہر

طرف مختلف عمروں کے پیارے پیارے بچے یونیفارمز میں ملبوس اِدھر سے اُدھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ سکول کی آیا سے آفس کے بارے میں پوچھ کر وہ اس طرف چل پڑی۔ آفس میں اس وقت اسما کے علاوہ دو تین اور لڑکیاں بھی تھیں جو غالباً وہاں ٹیچرز تھیں۔ اسما اُسے دیکھ کر فوراً کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور آگے بڑھ کر اُس سے ہاتھ ملایا۔ ماہ نور کو وہاں کا ماحول کچھ پُرتکلف اور پُرتصنع لگ رہا تھا۔ بہرحال وہ آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسما نے ان ٹیچرز کو باہر بھیج دیا۔

''ہاں بھئی ماہ نور! کیسے آنا ہوا؟'' اسما کے لہجے میں پروفیشنل براؤڈنیس محسوس کر کے ماہ نور کا دل ہی مکدر سا ہو گیا۔

''کچھ نہیں بس یونہی یہاں سے گزر رہی تھی تو یاد آیا کہ اس اسکول میں تم پرنسپل ہو۔ سو ملنے چلی آئی۔''

''اوہ بہت اچھا کیا...... کیا لو گی چائے یا کولڈ ڈرنک؟'' اسما کے لہجے میں قدرے لچک پیدا ہوئی۔

''کچھ نہیں بس اب چلتی ہوں......''

''ارے ایسی بھی کیا جلدی کچھ دیر تو بیٹھو۔'' اسما کے اصرار پر وہ چند منٹ وہیں رُکی اور پھر آ گئی۔

''یعنی مجھے اب کسی اچھے موقع کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یوں بھی اچھی نوکریاں بھلا کیا راستے میں پڑی مل جاتی ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو تو اپنی حصے کی سانسیں بھی چھین کر جینا پڑتا ہے۔'' اُس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور کہیں اور جانے کی بجائے سیدھا گھر کے راستے پر ہو لی۔ گلی کے نکڑ سے مڑتے ہی اس کی نظر چاچے سراجے کی دکان کے قریب کھڑے چند لڑکوں پر پڑی۔ اُنہی میں غیاث بھی کھڑا تھا اور پان چبانے کے ساتھ ساتھ جانے کیا باتیں کیے جا رہا تھا۔

''اوئے ہوئے گلی کا چاند طلوع ہو گیا اوئے۔'' ایک نمبر کا لفنگا تھا یہ شخص۔ محلے بھر کی لڑکیاں اس سے تنگ تھیں لیکن کسی کی ہمت نہیں تھی کہ کوئی اس کے خلاف بات بھی کر سکتی۔

''ارے یار ارشد محلے کے چاند نے تو وہ وہ چاند چڑھائے ہیں کہ کیا کہنے۔'' یہ عامر تھا جو محلے میں ہی وڈیو سینٹر کھولے بیٹھا تھا۔ سارا دن دنیا جہان کے آوارہ لڑکوں کا اس کی دکان پر آنا جانا تھا۔

''اوئے تم لوگوں کو شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔'' غیاث نے ارشد کو ہلکا سا مکا دکھاتے ہوئے کہا۔ انداز میں تمسخر نمایاں تھا۔

''ہاں بھئی تمہیں برا نہیں لگے گا تو اور کسے لگے گا؟ جان جگر ان تلوں میں تیل نہیں۔'' امجد نے بھی ٹانگ اڑائی۔

''اوئے...... اوئے بس بہت ہو گئی اب مار نہ کھا لینا۔ اپنے اپنے پان لو اور راستہ ناپو۔'' چاچے نے مداخلت کی۔

''او چاچا...... تو کیوں غصے ہوتا ہے تیرا کیا جاتا ہے ذرا دل ہی پشوری کر رہے ہیں اور کیا؟''

''تو میری دکان کے تھڑے پر کھڑے ہو کر ہی دل پشوری کرنا ہے۔ راہ لگو اپنی گدھے کہیں کے۔'' چاچے کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ سب نے کان دبا لیے اور اپنا اپنا راستہ لیا لیکن اتنی سی دیر میں ہی ماہ نور پر جانے اضطراب کے کتنے ہی پل آ کر گزر گئے۔ بھاری بھاری قدم اُٹھاتی وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ سامنے برآمدے میں اماں کو بیٹھے دیکھ کر اُسے فوراً اپنے تاثرات چھپانے پڑ گئے۔

''السلام علیکم اماں......''

''وعلیکم السلام بیٹا۔ آ گئی میری بچی۔''

''جی اماں۔''

''بہت تھک گئی ہو۔''

''نہیں اماں کام نہیں ہو سکا۔ اسما تو بالکل بدل گئی ہے نہ لہجہ ویسا، نہ انداز، اتنی مغرور۔ اُس نے سیدھے منہ بات نہیں کی تو میں نے بھی نہیں کچھ کہا بس کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گئی۔''

''بس بچی دولت کا خمار کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ خیر اللہ مالک۔ تم نے کپڑے بدلنے ہیں تو بدل لو میں کھانا لاتی ہوں۔''

''نہیں اماں ابھی رہنے دیں ابھی بھوک نہیں ہے۔'' ماہ نور نے کاغذات کی فائل اُٹھائی اور کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ نہ جانے کیوں اُسے آج بے انتہا مایوسی ہو رہی تھی۔ نااُمیدی کے اندھیرے اُسے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دے رہے تھے لیکن اب بھی دل کے کسی گوشے میں ہلکی سی اُمید کی کرن روشن تھی۔

''گُڈو...... او گُڈو بیٹا چاچے سراج کی دکان پر جاؤ گے ذرا؟''

''کیوں آپی؟'' گُڈو صحن میں نیچے بیٹھا چاتے پتھروں کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے میں مصروف تھا۔

''بیٹا...... چاچے سے کہنا کہ روزانہ کا اخبار شام کو ہمیں دے دیا کریں۔ بے شک آدھی قیمت وصول کر لیں۔''

''اچھا آپی۔'' گُڈو سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد واپس بھی لوٹ آیا۔

''آپی چاچا کہہ رہا ہے آپ سب میرے بچوں جیسے ہو۔ تمہاری آپی میری بیٹی ہے اور میں بیٹی سے کسی چیز کی قیمت وصول کرتا کیا اچھا لگوں گا؟'' گُڈو نے من و عن چاچے کا کہا اُس تک پہنچا دیا۔

''ٹھیک ہے اب کل سے تمہاری ڈیوٹی ہے کہ شام کو تم مجھے اخبار لا کے دیا کرو گے اچھا!''

''اچھا آپی۔'' وہ دوبارہ سے اپنے کھیل میں مگن ہو گیا۔ ماہ نور نے رسوئی میں جھانکا۔ اماں

شام کی ہانڈی کی تیاری میں مصروف تھیں۔

''اماں آج ہانڈی میں پکاؤں؟''

''ارے رہنے دو بیٹا تم پہلے ہی تھکی ہاری آئی ہو جاؤ آرام کرو میں خود پکا لوں گی۔''

''او ہو اماں اب ایسی بھی تھکی ہوئی نہیں۔ ویسے آج پکانا کیا ہے؟''

''اُبلے چاول اور بڑیاں۔''

''چلیں پھر آپ اُٹھیں میں بناتی ہوں۔'' اُس نے اصرار کر کے اماں کو اُٹھایا اور خود پیڑھی پر بیٹھ کر چاول چننے لگی۔

☆............☆............☆

''بیٹا...... ماہ نور صاحبہ کیا گھر پر ہیں؟'' باہر کھڑے پولیس کانسٹیبل نے دروازے کے سامنے کھیلتے گڈو کو مخاطب کیا۔

''جی ہاں گھر پر ہیں۔'' گڈو نے جواب دے کر دوبارہ کھیلنا شروع کر دیا۔

''بیٹا ان کو بلا کر لاؤ۔''

''آپی...... آپی باہر ایک پولیس والا آیا ہے آپ کو بلا رہا ہے۔'' گڈو صحن کے وسط میں کھڑا ہو کر چلا رہا تھا۔ ماہ نور کے ہاتھ سے پانی کا گلاس ایک چھناکے کے ساتھ گرا۔ اُس نے وحشت بھری نظروں سے اماں کی طرف دیکھا جن کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ گڈو کی بات کے ردعمل میں سارے گھر والوں پر ہی ایک جیسا ردعمل ہوا تھا۔ آخر اماں نے ہی ہمت کی اور دروازے پر جا کر پوچھا۔

''کیا بات ہے بھائی؟''

''وہ مس ماہ نور کو کچھ دیر کے لیے تھانے چلنا ہوگا۔''

''بھائی دیکھو ہم شریف لوگ ہیں۔ تمہارا یہاں روز روز آنا لوگوں کی نظروں میں ہماری عزت گرا رہا ہے۔ یتیم بچیاں ہیں میری...... کچھ تو خیال کرو۔'' اماں کا ملتجیانہ اندازِ گفتگو کانسٹیبل کو بھی متاثر کر گیا۔

''دیکھئے ماں جی، ہم خود ماؤں بہنوں والے ہیں اور یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ لوگوں کا یہاں محلے میں ایک مقام ہے، عزت ہے لیکن ہم بھی اپنے پیشے کے تقاضوں سے مجبور ہیں۔ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ ہمیں فوراً آپ کی بیٹی کو تھانے لے جانا پڑے گا۔''

وہ کسی طور ٹل نہیں رہا تھا اور اماں کا دل ماہ نور کو بھیجنے کو کسی صورت راضی نہیں تھا۔ آخر طے پایا کہ اماں ماہ نور کے ساتھ جائیں گی۔

''بھائی اگر ہم تمہارے ساتھ نکلے تو بہت باتیں بنیں گی۔ بھرے پُرے محلے کے مکین ہیں تم

جاؤ ہم کچھ ٹھہر کر خود ہی آ جائیں گے۔''

''شکریہ ماں جی۔'' کانسٹیبل ان کی مجبوری سمجھ گیا تھا۔ سو بغیر ردوقدح کے واپس چلا گیا لیکن اس کی آمد اور گفت وشنید کو محلے کے بیشتر لوگوں نے دیکھا تھا اور انتہائی ناگواری محسوس کی تھی۔

کانسٹیبل کے جانے کے کچھ دیر بعد اماں ماہ نور کو لے کر گھر سے نکلیں۔ پڑوس کی خالہ آمنہ دروازے پر کھڑی خالہ پروین سے باتوں میں مشغول تھی۔

''ائے بہن کہاں جا رہی ہو اتنی دیر گئے؟'' خالہ پروین کو شاید پچھلی بات بھول گئی تھی۔

''کچھ نہیں یہ ماہ نور کی طبیعت ٹھیک نہیں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی ہوں۔'' اماں نے چلتے چلتے ہی جواب دیا۔

''اچھی خاصی ہٹی کٹی تو دکھ رہی ہے۔ مجھے تو کچھ اور ہی چکر لگے ہے۔ آئے دن ان کے گھر پہ پولیس تفتیش کرنے آئی کھڑی ہوتی ہے۔'' قدرے فاصلے پر آ جانے کے باوجود اماں اور ماہ نور دونوں نے خالہ پروین کی بات سُن لی تھی۔ اماں کی نظریں بارِ ندامت سے جھک گئیں۔ آج یہ دن بھی دیکھنا نصیب میں لکھا تھا۔ وہ خاموش نگاہوں سے ماہ نور کو دیکھنے لگیں۔

''کیا بات ہے اماں...... آپ پریشان ہیں؟''

''کیا نہیں ہونا چاہیے؟'' اماں نے اُلٹا سوال داغ دیا۔

''اماں جب ہم نے کوئی جرم ہی نہیں کیا تو پریشانی کس بات کی؟''

''بات جرم کرنے یا نہ کرنے کی نہیں بچی۔ عرصے سے بنائی گئی عزت تو مٹی میں مل گئی ناں۔ دوسری بار پولیس دروازے پر آئی ہے۔ اب تمہاری تھانے طلبی ہو رہی ہے۔ محلے والے تو تم اچھی طرح جانتی ہو، کس قسم کے ہیں۔ ان کے لیے تو رائی ہی بہت ہے پہاڑ بنانے کے لیے اور یہ رائی اُنہیں مل گئی ہے۔ پھر بتاؤ میں کیسے نہ پریشان ہوں؟'' اماں اپنی جگہ درست کہہ رہی تھیں۔ کسی مرد کا ساتھ نہ ہونا کس قدر پریشانی اور تکلیف کا باعث ہو سکتا ہے یہ اُسے آج پتہ چلا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح اماں کے ذہن کا بوجھ بانٹ لے۔ سڑک پر پہنچتے ہی انہوں نے لبِ سڑک کھڑے رکشے کے پاس جا کر اُسے تھانے چلنے کو کہا۔ رکشہ ڈرائیور نے حیرت واستعجاب اور قدرے مشکوک نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔ بہر حال انہوں نے اس کی نظروں کو بالکل نظرانداز کر دیا اور رکشے میں بیٹھ گئیں۔

''ویسے بہن جی...... کس سلسلے میں تھانے جا رہی ہیں آپ؟'' غالباً رکشہ ڈرائیور کو ان کا تھانے جانا ہضم نہیں ہو پایا تھا۔ سو زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکا۔

''ایک عزیز ہیں اُن سے ملنا ہے۔'' اماں نے مختصر جواب دے کر اپنی توجہ باہر کی جانب

مبذول کر دی۔ گویا رکشے والے کے لیے اشارہ تھا کہ اب وہ خاموش رہے اور وہ بھی پھر تھانہ آنے تک کچھ نہیں بولا۔

رکشے سے اُتر کر ڈرائیور کو پیسے پکڑا کر اماں پولیس اسٹیشن کے اندر داخل ہوئیں۔ برآمدے کے قریب ہی انہیں وہ کانسٹیبل مل گیا جو کچھ دیر قبل گھر پر آیا تھا۔

''آیئے ماں جی......'' وہ انہیں اپنی معیت میں لیے ایس۔ ایچ۔ او کے دفتر تک لایا۔

''اندر چلی جایئے۔ سر جی اس وقت اکیلے ہی ہیں۔'' کانسٹیبل اتنا کہہ کر دوبارہ واپس چلا گیا۔ اماں اور ماہ نور نے قدرے جھجکتے ہوئے دروازے پر سے چق اُٹھائی اور اندر داخل ہو گئیں۔ ایس۔ ایچ۔ او بھی کوئی بھلا مانس ہی تھا۔ اُس نے بہت اچھے طریقے سے انہیں اپنے دفتر میں بٹھایا تھا۔

''اماں جی......ہم آپ کو اور بہن کو یہاں زحمت تو نہیں دینا چاہتے تھے لیکن بات ہی کچھ ایسی تھی کہ انہیں بلانا پڑا۔ آپ دو منٹ انتظار کریں میں ابھی آیا۔'' وہ کرسی سے اُٹھ کر دروازے کے قریب گیا اور چق اُٹھا کر کسی حکمداد کو پکارنے لگا۔

''حکمداد......وہ جو دو لڑکیاں ملی تھیں اُنہیں اندر لے آؤ۔'' اور تھوڑی ہی دیر بعد ماہ نور نے دروازے سے اندر داخل ہوتی ارم اور عظمیٰ کو دیکھا۔ حیرت اور خوف کا ملا جلا تاثر اس کے چہرے کی سمت در آیا تھا۔ وہ دونوں عام حالات کے متضاد بہت برے حالوں میں تھیں۔

''ماہ نور بی بی......کیا آپ ان دونوں کو جانتی ہیں؟''

''جی ہاں سر یہ میرے ساتھ پیراڈائز بوتیک میں کام کرتی تھیں۔ ارم اور عظمیٰ۔'' ماہ نور کے لیے اعتراف کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

''حکمداد اُس کالے کُتے کو بھی تو لاؤ۔''

''یس سر۔'' حکمداد اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ جس شخصیت کے ہمراہ دفتر میں داخل ہوا۔ اُس کو تو ماہ نور قبر تک نہیں بھول سکتی تھی۔ اس کے وجود کو داغدار کرنے کے لیے وہی تو اُسے لے کر گیا تھا سیٹھ کے پاس۔ سلیم انصاری...... بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا۔ معصوم لڑکیوں کا دلال، عصمتیں بیچ کر پیٹ کا دوزخ بھرنے والا ایک خبیث۔

''اور ہاں بی بی......اس شخص کو بھی جانتی ہیں؟'' ایس۔ ایچ۔ او کے پوچھنے پر ایک ثانیے ماہ نور نے اماں کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات ثبت تھے۔ نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کن سوچوں میں گم تھیں۔

''جی ہاں......ان سے میری صرف ایک بار ملاقات ہوئی ہے لیکن میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں یہ سلیم انصاری ہیں، میڈم نظامانی کے اسسٹنٹ۔''

''کیا آپ جانتی ہیں کہ مسز نظامانی کو کیوں اور کس لیے قتل کیا گیا؟''

''نہیں جناب میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''لیکن آپ یہ تو جانتی ہوں گی کہ سیٹھ حبیب الرحمٰن کو کس نے قتل کیا؟'' ایک دھماکہ تھا جو ماہ نور کے کہیں قریب ہی ہوا تھا۔ اس کا سر ایک لمحہ کو تو جیسے چکرا کر رہ گیا لیکن پھر اُس نے اپنی دگرگوں کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''کیا مطلب...؟ کون سیٹھ حبیب الرحمٰن؟'' ماہ نور نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''وہی سیٹھ حبیب الرحمٰن جہاں ارم اور عظمیٰ کے بیان کے مطابق سلیم انصاری آپ کو چھوڑ کر گیا تھا۔''

ماہ نور کے چہرے پر خفت کی سرخی پھیلنے لگی۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بات سُن کر اس وقت اماں کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ اُسے اماں سے کوئی بات بھی نہیں چھپانی چاہیے تھی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

''ماہ نور صاحبہ! بہتر تو یہی ہے کہ آپ ہمیں ساری تفصیل سے آگاہ کر دیں۔ کیونکہ سیٹھ صاحب کے قتل کا الزام بالواسطہ یا بلاواسطہ آپ پر لگ سکتا ہے۔'' ایس۔ ایچ۔ او نے گھمبیر سنجیدگی کے ساتھ کہا تو ماہ نور نے الف سے ی تک سارا واقعہ بیان کر دیا۔

''لیکن مس ماہ نور نقاب پوش کون تھا جس نے عین موقع پر پہنچ کر آپ کو بچا لیا؟''

''سر میں نے اُس شخص کو کبھی نہیں دیکھا، نہ جانتی ہوں۔ پہلی بار وہیں دیکھا تھا۔ وہ رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ یہ اللہ کے بعد اُسی بروقت مدد کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی قیمتی متاع کھونے سے بچ گئی۔''

''آپ کو تو بروقت مدد مل گئی لیکن مس ارم اور مس عظمیٰ سلیم انصاری کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گئیں۔ اگر یہ اس کے خلاف رپورٹ نہ درج کرواتیں تو شاید سیٹھ کے قتل کا معمہ کبھی حل نہ ہو پاتا لیکن آپ کے بیان پر عدالت یقین نہیں کرے گی۔ عدالت ثبوت و شواہد مانگتی ہے۔ عینی گواہ طلب کرتی ہے اور آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں اور نہ ہی عینی شاہد کہ قتل آپ نے نہیں کسی اور نے کیا ہے؟ کیونکہ ممکن ہے آپ نے اپنے ڈیفنس میں اُسے قتل کیا ہو۔''

''لیکن سر میرے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ میں تو نہتی تھی۔''

''مس ماہ نور دوسرے اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے۔'' آفیسر کی باتیں ماہ نور اور ماں کو ازحد پریشان کر گئیں۔

''مس ماہ نور...... آپ شاملِ تفتیش رہیں گی اور جب تک تفتیش جاری رہے گی آپ کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اب آپ جا سکتی ہیں لیکن جس وقت بھی ہمیں ضرورت پڑی، آپ کو

یہاں آنے کی زحمت کرنا پڑے گی۔'' سلسلہ در سلسلہ اذیتوں اور ذلتوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تو اُس میں تھی اور نہ ہی اماں میں۔ چند لمحوں میں ہی اماں اپنی عمر سے کہیں دُگنی نظر آنے لگی تھیں۔ جانے اس نئی صورت حال سے کب تک نبرد آزما رہنا پڑے گا۔

ماہ نور نے اماں کا ہاتھ تھام کر اُنہیں اُٹھایا اور دفتر سے باہر آ گئی۔

''نور بیٹا...... اب کیا ہو گا؟'' اماں سرسراتے لہجے میں بولیں۔ ''یہ مصیبتوں نے میرا ہی گھر کیوں دیکھ لیا ہے؟'' ان کے لہجے میں نمی گھل گئی۔

''اماں...... آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔'' اس کا تو اپنا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے جیل کی سلاخیں آ گئیں۔ وہ جاہل ان پڑھ نہیں تھی۔ جانتی تھی جیلوں میں عورتوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اندر ہی اندر وہ دہلتی جا رہی تھی اور کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسی ادھیڑ بن میں گھر آ گیا۔ گھر کی فضا پر بھی عجب سی سوگواریت طاری تھی۔ ماہین اور گڈو خاموش بیٹھے ہوئے تھے جبکہ راہین سو رہی تھی۔ رسوئی کے کھلے دروازے کو دیکھ کر ماہ نور اسی طرف آ گئی رسوئی خالی تھی۔

ماہ نور کسی انجانے اندیشے کے زیر اثر کمرے کی طرف بھاگی۔ چارپائی پر تنہا راہین کو سویا ہوا دیکھ کر اس کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔

''ام...... ماں...... شاہین۔'' ماہ نور کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے لہجے کے غیر معمولی پن پر اماں تو دل پکڑ کر نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

''پروردگار مجھے موت دے دے...... سفید بالوں کے ساتھ ذلتوں کی یہ سیاہی میری برداشت سے باہر ہے مولا۔ میری آزمائش ختم کر دے مجھے موت دے دے۔'' اماں کی بوڑھی اُداس آنکھیں ساون بھادوں برس رہی تھیں۔ ماہ نور کے پیروں سے بھی جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ وہیں کمرے کی دہلیز پر نیچے بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے دیا۔

''ابو جی ایک صرف آپ کے نہ ہونے سے ہم کتنے رُل گئے ہیں آ کر دیکھیں ابو جی آپ کی اولاد اذیتوں کے کون کون سے مرحلوں سے گزر رہی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی آسرا نہیں لیکن جانے کیوں اُس نے بھی ہماری طرف سے منہ موڑ لیا ہے۔ اس ذلت بھری زندگی سے تو موت بہتر ہے لیکن وہ بھی تو اپنی مرضی سے آئے گی۔ اے اللہ تو نے ہمیں اتنا بے وقعت اور بے حیثیت کیوں کر دیا؟'' اُس کی آنکھیں خاموش آنسو بہانے لگیں۔

''اماں......'' اُس نے اماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اماں کیوں رو رہی ہیں؟ کیا پولیس نے زیادہ پریشان کر دیا۔'' شاہین کی آواز پر تو اماں یوں اُچھلیں گویا کئی وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

''چھینا...... تم...... تم کہاں تھیں؟ کہاں تھیں تم؟''

''اماں میں تو چھت پر سے دُھلے ہوئے کپڑے اُتارنے گئی تھی۔'' شاہین کے جواب پر اماں روتے روتے جیسے مسکرا اُٹھیں۔ ماہ نور بھی دہلیز سے اُٹھ کر پاس آ بیٹھی۔

''آپ یہ بتائیں آپ دونوں رو کیوں رہی تھیں؟'' شاہین نے بغور دونوں کے سُتے ہوئے چہروں کی جانب دیکھا۔

''اپنے حالات پر۔'' ماہ نور نے گویا اُسے ٹالا تھا۔ وہ اس کی ذات پر عدم اعتماد ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح اس کے مزید بگڑ جانے کا خدشہ تھا۔ شاہین نے بھی زیادہ نہیں کریدا۔

''اور یہ ماہی اور گڈو کیوں خاموش اور اُداس بیٹھے ہیں؟''

''ماہی نے گڈو کی لُڈو پھاڑ دی اور گڈو نے اس کی گڑیا کی ایک ٹانگ اور ایک بازو توڑ دیا۔ سو اب دونوں اپنی اپنی چیز کے ضائع ہو جانے پر افسردہ ہیں۔''

''تو یہ جھگڑے کیوں؟''

''ان کی عادت ہے پہلے مل کر کھیلنے کی ضد کریں گے اور جب ساتھ بیٹھ جائیں گے تو کچھ ہی دیر بعد کھیلنے کی بجائے جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں گی۔'' شاہین سبزی کی ٹوکری اُٹھائے رسوئی سے باہر آ رہی تھی۔

''بھلا کوئی بتائے کہ مل کر کھیلنے کا طریقہ نہیں آتا تو کھیلو ہی نہ۔ یہ جھگڑا ضرور ڈالنا ہوتا ہے۔''

''اماں! اب زمین سے اُٹھ جائیں کیوں دل پہ لگاتی ہیں۔ اللہ میاں پر کیا یقین نہیں رہا آپ کو؟''

ماہ نور اور شاہین نے اماں کو نیچے سے اُٹھا کر صحن میں بچھی چارپائی پر بٹھا دیا اور خود ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ اماں خاموش نگاہوں سے دونوں کی طرف، کچھ دیر دیکھتی رہیں۔ پھر سر جھکا کر بیٹھ گئیں۔

''اماں یوں مت بیٹھیں کچھ بولیں ناں۔'' ماہ نور سے ان کا اُداس ملول چہرہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

''کیا بولوں بچو... اتنا ہی ہے کہ میرا تم سب کے علاوہ اور کوئی نہیں، نہ ماں نہ باپ نہ بہن نہ بھائی۔ سسرال میں آئی تو یہ بھی میری طرح ماں باپ کے ایک ہی ایک بیٹے تھے۔ ہم دونوں کی ہر آرزو، ہر خواہش، ہر خواب بس تم لوگوں سے وابستہ ہے لیکن اب تم میں سے کسی ایک کو بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' وہ دونوں پوری محویت سے اماں کی بات سُن رہی تھیں۔

''نہیں اماں...... ہماری حفاظت وہ اوپر والا کرے گا۔ آپ یوں پریشان نہ ہوں۔'' ماہ نور نے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر سہلانے شروع کر دیئے۔

☆.......... ☆ .... ☆

''آپی... آپی... یہ باہر کوئی لڑکا دے کر گیا ہے۔'' ماہین بھاگتی بھاگتی کمرے میں داخل ہوئی۔ ماہ نور نیچے زمین پر لان کا سوٹ پھیلائے اس کی کٹائی میں مصروف تھی اور اماں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں۔ شاہین اماں کے سر میں تیل سے ہلکی مالش کر رہی تھی۔ ماہ نور نے سر اُٹھا کر دیکھا ماہی کے ہاتھ میں اس کا پرس تھا۔

''میرا پرس؟ کون... کون تھا وہ لڑکا؟'' ماہ نور اُس سے پوچھتی ہوچھتی تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف لپکی لیکن گلی ایک سرے سے دوسرے سرے تک بالکل سنسان پڑی تھی۔ ماہ نور متحیر سی واپس پلٹ آئی۔

پرس کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو اُسی کا تھا لیکن یہ کسی اور کے پاس کیسے پہنچ گیا؟ پھر ایک جھما کا سا ہوا آنکھوں کے سامنے۔ دو تین دن پہلے کا واقعہ جیسے پردۂ اسکرین پر نمودار ہوا۔

سیٹھ کے قتل کے بعد دہشت سے اس کا بے ہوش ہو جانا، نقاب پوش کی گاڑی میں ہوش آنا... ہوش میں آنے کے بعد وہیں سنسان سڑک پر گاڑی سے اُتر جانا۔ یقیناً گاڑی سے اُترتے وقت وہ پرس اُٹھانا بھول گئی تھی۔

''تو... تو کیا اس کا پرس نقاب پوش دے کر گیا ہے لیکن ماہی تو کہہ رہی تھی کہ کوئی چھوٹا سا لڑکا دے کر گیا ہے۔'' ماہ نور حیران پریشان پرس اُٹھائے دیکھ رہی تھی۔

''ماہ نور بیٹا... یہ واقعی تمہارا پرس ہے؟'' اماں نے پوچھا۔

''جی ہاں اماں میرا ہی ہے۔ آپ کو بتایا تھا نا کہ وہ شخص جس نے مجھے سیٹھ سے بچایا تھا۔ وہی مجھے وہاں سے نکال کر لے کر آیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اُس نے مجھے ایک قدرے غیر آباد سڑک پر اُتار دیا تھا اور شاید یہ پرس میں وہیں گاڑی میں ہی بھول گئی تھی۔'' اماں سے باتیں کرتے کرتے وہ پرس کی زپ کھول کر اندر جھانک رہی تھی اور پھر تو جیسے اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

پرس میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی چار گڈیاں رکھی تھیں۔

''اماں... اس کے اندر تو بہت سارے پیسے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اماں یکدم اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ شاہین بھی اشتیاق سے ماہ نور کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ البتہ ماہین اور گڈو ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے میں مصروف تھے۔ ماہ نور اماں کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور پرس میں سے چاروں گڈیاں نکال کر اماں کے سامنے بستر پر رکھ دیں۔ اماں تو اتنے نوٹ دیکھ کر حیران سے زیادہ پریشان ہو گئیں۔

''یہ... یہ اتنے پیسے کہاں سے آ گئے؟''

''یہی تو میں بھی حیران ہو رہی ہوں اماں۔ جب یہ پرس میرے پاس تھا تو اس میں زیادہ سے زیادہ پندرہ سو روپے تھے۔ اتنے بہت سارے پیسے کہاں سے آ گئے؟''

''کسی نے مذاق نہ کیا ہو... آپی غور سے دیکھیں نقلی تو نہیں۔'' راہین نے کمرے میں داخل ہوتے ہی مبہوت کن منظر دیکھ لیا تھا۔

''نہیں بالکل اصلی اور نئے نوٹ ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کوئی ہمیں کسی بڑے جال میں نہ پھنسانے والا ہو۔'' ماہ نور ایک بار ڈس جا چکی تھی سو اتنی جلدی اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔

''آپی پرس میں دیکھیں ان نوٹوں کے ساتھ کوئی پرچی کوئی خط ضرور ہو گا۔'' شاہین نے پتے کی بات کی تھی۔ ماہ نور نے ایک بار پھر پرس کھنگالنا شروع کیا۔ ہلکے گلابی رنگ کا ایک تہہ شدہ خوشبودار کاغذ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

نور!

السلام علیکم

میں کون ہوں؟ اس جستجو میں پڑنے کی بجائے اتنا یاد رکھو کہ تمہارا ہمدرد ہوں۔ میری وجہ سے پولیس نے تمہیں پریشان کیا اس کے لیے معذرت قبول کرو۔ اب وہ تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔ ممکن ہے تفصیل سے آگاہی کے لیے تمہیں باتیں یا تمہارے گھر آ گیا۔ تم گاڑی میں ہی اپنا پرس بھول گئی تھیں۔ یہ پرس اور اس میں موجود ہر چیز بلاشرکت غیرے تمہاری ہے۔ ان پیسوں سے تم شاہین کی شادی کر دینا۔ اسد اچھا لڑکا ہے لیکن اس کی ماں لالچی عورت ہے۔ سو اس کا منہ بھرنے کے لیے یہ پیسے کافی ہیں۔ محلے والے اب تمہارا جینا تنگ کر دیں گے۔ اس لیے پرس میں موجود چابی اُس فلیٹ کی ہے جو تم سب کے لیے ہے۔ اس میں میرا کوئی مفاد کوئی غرض پوشیدہ نہیں۔ کسی قسم کے خدشے اور واہموں کو دل میں جگہ مت دینا۔

فقط

بلیک مین

ایک طرف کونے میں فلیٹ کا ایڈریس تحریر تھا۔

ساری باتیں ماہ نور کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ کوئی شخص ان کے بہت قریب رہ کر ہر مشکل وقت میں ان کا ساتھی بننا چاہتا تھا۔ ان کے دکھ، ان کی تکلیفیں بٹانا چاہتا تھا۔ اماں بھی حیرانگی سے خط کے الفاظ سن رہی تھیں اور غور کر رہی تھیں۔

''ماہ نور بچی......میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہے؟''

''لیکن اماں مجھے سمجھ آ رہا ہے۔اوپر والا ہماری پریشانیاں کم کرنا چاہتا ہے۔''

''پر بچی......کیا خبر دنیا میں بڑے بڑے دغاباز اور مکار لوگ رہتے ہیں۔اللہ جانے اس شخص کا کیا مفاد ہے؟ کیا سوچ کر یہ ہمارے اوپر مہربان ہے؟ ہم کسی کے ذہن میں چھپی سوچیں تو نہیں دیکھ سکتے۔'' اماں جہاندیدہ عورت تھیں۔اتنی جلدی کیسے بھروسہ کر لیتیں لیکن ماہ نور کے بھروسے اور یقین کی وجہ کچھ اور تھی۔سیٹھ کے ہاتھوں سے اُسے بچانے کے بعد وہ مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھی لیکن اُس نے اس کے ناخن تک کو نہیں چھوا۔اس سے زیادہ اس کے بااعتبار ہونے کی کیا گارنٹی دی جا سکتی تھی۔

بہر حال ماہ نور نے پرس دوپٹے میں اچھی طرح لپیٹ کر سب سے نچلے ٹرنک میں رکھ کر اُسے تالا لگا دیا۔اس کے دل کو کسی حد تک ڈھارس مل گئی تھی کہ وہ تنہا نہیں کوئی تو ہے جو اس کے بوجھ کو بانٹ سکتا ہے۔اُسے اس ان دیکھے ان جانے شخص کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ایک انجانی سی دُکھتی دُکھتی لذت اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی لیکن کچھ تھا کہ اسے سارا جہاں بدلا بدلا سا نیا نیا سا دکھائی دے رہا تھا۔

☆............☆............☆

''شاہین......'' ماہ نور نے شاہین کو پکارا جو سیڑھیوں پر بیٹھی کسی کتاب کو پڑھنے میں مصروف تھی۔

''جی آپی۔''

''بات سنو میری۔'' شاہین نے کتاب بند کی اور کمرے کی طرف چل پڑی۔کل سے ماہین کو شدید بخار تھا۔اماں راہین کو اور اُسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔گڈو باہر گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ماہ نور نے موقع غنیمت جان کر شاہین کو اپنے پاس بلایا۔

''ہاں جی آپی......''

''یہاں بیٹھو میرے پاس اور جو کچھ تم سے پوچھوں ایک ایک لفظ سچ ہونا چاہیے۔ایک نقطہ بھی جھوٹ کا ملائے بغیر۔''

''پوچھیں آپی۔''

''وعدہ کر رہی ہو ناں مجھ سے۔''

''جی آپی پکا وعدہ۔'' شاہین نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم اب بھی اسد کے ساتھ ملتی ہو؟''

''جی آپی......!'' اُس نے سر جھکا کر اثبات میں جواب دیا۔

''ہوں......اب یہ بتاؤ کہ کیا وہ اور تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ محض وقت گزاری کر

رہے ہو یا واقعی ایک دوسرے کے لیے دل میں اچھے جذبات رکھتے ہو؟''

''آپی...... میں بہت بری لڑکی ہوں۔ میں نے آپ کے اور اماں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ دراصل میری دو دوستوں نے مجھے اس راہ پر لگایا لیکن میں نے بہت بعد میں یہ جانا کہ چور راستوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جو وقت گزاری کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی دوسرے کہاں مخلص ہوں گے لیکن اب میں نے جان لیا ہے کہ اب تک میں نے جو کچھ کیا غلط کیا۔ آپ کے سوال کے جواب میں بس اتنا ہی کہوں گی کہ اسد کے دل میں میرے لیے سچے جذبے ہیں لیکن وہ اپنی ماں کے ڈر سے خاموش ہے۔ وہ اپنی ماں کے سامنے تقاضا یا خواہش نہیں کر سکتا جبکہ میرے دل میں اس کے لیے صرف پسندیدگی ہے اور بس۔'' شاہین نے تفصیل سے جواب دیا۔

''یہ میں نے اس لیے پوچھا کہ اگر اسد کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کر دیا جائے تو تمہیں اعتراض نہیں ہوگا؟''

''لیکن آپی اتنی جلدی؟'' شاہین کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''دیکھو شاہین...... لڑکیاں ماں باپ کے گھر میں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ جلد یا بدیر انہوں نے وہاں سے رخصت ہو ہی جانا ہوتا ہے۔ یہ فرض جتنی جلدی ادا ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' ماہ نور نے اُسے [illegible] سمجھانے کی کوشش کی۔ حالانکہ شاہین کی جلد از جلد شادی کے پیچھے کیا راز تھا' یہ وہ بخوبی جانتی تھی لیکن وہ اس کا تذکرہ اُس سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کسی کے سامنے اگر اس کے گناہوں کا بار بار ذکر کیا جائے تو وہ انسان ہمیشہ احساسِ جرم اور احساسِ ندامت میں گھرا رہتا ہے۔ جو تائب ہو جائے اُسے اعلیٰ ظرفی کے ساتھ معاف کر کے اس کے لیے روشن راہیں کھول دینی چاہئیں۔ شاہین سترہ سال کی تھی اور یہ کوئی اتنی بھی کم عمری نہیں تھی کہ اس کے بارے میں سوچ کر ہلکان ہوا جاتا۔ یوں بھی منگنی کے بعد ایک آدھ سال تو درمیان میں شادی بیاہ کی تیاریوں کے لیے بھی رکھا جاتا ہے۔

''آپی...... اسد کی اماں کبھی بھی نہیں مانیں گی۔ وہ بی۔ سی۔ ایس کر رہا ہے، شاندار مستقبل کا مالک ہے۔ مجھ جیسی کم مایہ لڑکیوں کے بارے میں اس کی اماں کہاں سوچے گی؟''

''شاہین تم باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔ فی الحال اسد سے کہو کہ وہ اپنی ماں سے تمہارے بارے میں کھل کر بات کرے اور جو باتیں بھی ہوں وہ سب مجھ سے آ کر ڈسکس کرے۔ جس طرح اس کی ماں چاہے گی، ہو جائے گا۔'' ماہ نور کی باتیں شاہین کو بہت عجیب لگ رہی تھیں لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ ماہ نور اُٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ چاچے ساجے نے اخبار بھیجا ہوا تھا۔ اُس نے ''ضرورت ہے'' کے اشتہارات دیکھنے شروع کر دیے۔

''ایک بوڑھی خاتون کے لیے (جن کی عمر تقریباً 70 سال ہے اور فالج کی مریضہ ہیں) ایک گورنس درکار ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی ٹریٹمنٹ جانتی ہو۔ معقول معاوضہ اور پک اینڈ ڈراپ کی سہولت کے ساتھ کنٹیکٹ کریں۔

ملک معظم جاہ مینجنگ ڈائریکٹر ملک ٹیکسٹائل ملز۔

ماہ نور کی آنکھوں میں اُمید کے چراغ جلنے لگے۔ یہ جاب ہر لحاظ سے محفوظ ہوگی۔ ایک بوڑھی عورت اور وہ بھی فالج زدہ۔ وہ دل سے اس کی خدمت کرے گی، اس کا خیال رکھے گی۔ شاید اسی بہانے اس کی مشکلات میں کچھ کمی ہو جائے۔'' پھر اُسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

''ارے تم تو ایسے سوچ رہی ہو جیسے تمہارا سلیکشن ہو گیا۔ پتہ نہیں کتنی ہی اُمیدوار لڑکیاں وہاں تم سے پہلے موجود ہوں گی۔ اچھی نوکری شہد ہے جس کی طرف لوگ مکھیوں کی طرح لپکتے ہیں۔ خیر پھر کیا ہو گیا۔ اپنی طرف سے کوشش کروں گی۔'' ماہ نور انہی سوچوں میں گم تھی کہ باہر سے اماں کی آواز سنائی دی۔

''ڈاکٹر کہتا ہے بچی کو صرف فروٹ اور دودھ دیں۔ اسے معدے کی کوئی ایسی تکلیف ہے جس کے باعث یہ روٹی ہضم نہیں کر سکتی۔ بھلا اب بتاؤ ہم غریب لوگ اتنا مہنگا علاج کس طرح کر سکتے ہیں۔ مہنگائی ہے کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ ہفتوں فروٹ کی شکل دیکھنے کو نہیں ملتی اور یہ ڈاکٹر لوگ کیسے منہ پھاڑ کر کہہ دیتے ہیں۔'' مہر تصدیق ثبت ہو گئی تھی کہ اُسے نوکری کرنی ہے۔ گھر بھر کی زندگی آسان بنانے کے لیے...... ننھے منے بہن بھائی جن کی پُر اُمید نگاہیں اُس پر ٹکی ہوئی ہیں ان نگاہوں کی ہر اُمید کو بجھنے سے پہلے روشنی سے ہمکنار کرنا ہے کہ اُمیدیں بجھ جائیں تو دل بجھ جاتا ہے اور دل ہی تو جینے کا منبع ہے۔

''اماں...... پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماہ نور نے تسلی آمیز انداز میں اماں کا شانہ تھپتھپایا۔

''لیکن میں اب تمہیں نوکری نہیں کرنے دوں گی۔'' اماں کا لہجہ حتمی تھا۔

''اماں...... اماں مان جائیں یہ ویسی نوکری نہیں ہے۔''

''نہ ایسی...... نہ ویسی۔ ہمیں نوکری کروانی ہی نہیں۔'' اماں تو ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھیں۔

''اماں ایک فالج کی مریضہ عورت کی گورنس کے لیے اشتہار ہے۔ گھر سے لے جانا اور گھر چھوڑ کر جانے کی ذمہ داری اُنہی کی۔ اس نوکری میں کیا قباحت ہے؟'' ماہ نور ایک ہی سانس میں بولے گئی۔ اماں قدرے ٹھٹک گئیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔

''لیکن نور بچی...... دنیا تو وہی ہے اور دنیا والے بھی وہی۔ تمہارے اُجلے دامن پر داغ لگنے سے ڈر لگتا ہے۔ میری فرشتوں جیسی معصوم بچی۔ میں تم لوگوں کو کہاں لے جاؤں؟ جہاں گرم ہوا کا جھونکا بھی تمہیں نہ چھو پائے۔'' اماں کی نم آواز یوں لگ رہی تھی جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔

''اماں...... ایک بار اجازت دے دیں۔ یقین جانیں میں اپنے اُجلے دامن کی پاکیزگی کو نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔ اس دنیا میں لوگ صرف بروں کو ہی برا نہیں کہتے، اچھے بھی لوگوں کی نظر میں برے ہوتے ہیں۔ نوکری پیشہ عورتوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن ہر لڑکی کا دامن دریدہ نہیں ہوتا۔ اماں پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اپنے بھائی اور بہنوں کو گھٹن کی زندگی نہیں جینے دوں گی۔'' ماہ نور نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔

اماں نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا۔ جانے اُن کی آنکھوں میں کیا تھا کہ پل بھر کو ماہ نور نے شرمندگی کی دبیز تہہ کے نیچے اپنے وجود کو دبتے ہوئے محسوس کیا۔ اُن آنکھوں میں اُسے یہ احساس ہلکورے لیتا نظر آیا کہ پہلے بھی تو وہ اتنے ہی اعتماد کے ساتھ ہر بات کرتی تھی۔ پھر کیا نتیجہ نکلا۔ ابھی تک اُس جھنجھٹ سے ہی چھٹکارہ نہیں ملا اور تم ایک بار پھر کوئی مصیبت گلے لگانے کی کوشش میں ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' اماں نے ایک ٹھنڈی آزردہ سی سانس لی۔ ''یوں بھی اولاد جب جوان ہو جاتی ہے تو پھر ماں باپ کی باتیں محض حماقتیں ہی لگتی ہیں۔'' یہ انداز، یہ لہجہ صریحاً ناراضگی کا اظہار تھا۔

''چلیں ایسا کرتے ہیں کہ اس بار آپ خود میرے ساتھ چلیے گا اگر وہاں کا ماحول اور لوگ آپ کو پسند نہ آئے تو وعدہ رہا میں نوکری نہیں کروں گی۔'' اس بات پر اماں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے کمرے کے اندر چلی گئیں۔ ماہ نور بھی ان کی تقلید میں پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ اماں نے برقع اتار کر کھونٹی کے ساتھ لٹکا دیا۔ ماہ نور نے جلدی سے پنکھے کا سوئچ آن کیا اور اماں کے پاس نیچے زمین پر بیٹھتے ہوئے اپنا سر اماں کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

''اماں...... مان جائیں ناں اب۔'' وہ بچوں کی طرح اٹھلا کر بولی۔

''اچھا بابا اچھا لیکن میں خود جا کر دیکھوں گی۔''

''سچ اماں۔'' ماہ نور کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

''پاگل۔'' اماں نے ہلکی سی لاڈ بھری چپت اس کے سر پر جمائی تو اُس نے دوبارہ سے ان کے گھٹنوں میں سر گھسیڑ لیا۔

''کیا کروں میری بچی...... دنیا نے اتنے زخم دیے ہیں کہ اب قدم قدم پر خوف کھاتی ہوں۔ خود پر تو جو کچھ ہوا سہہ گئی مگر تم لوگوں کی ہلکی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ بس اسی لیے

ڈرتی ہوں۔''

''اماں آپ کی دعائیں ہیں تو کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' اماں نے اُسے نوکری کی اجازت تو دے دی تھی لیکن اندر سے غیر مطمئن تھیں۔

☆............☆............☆

گیٹ سے اندر داخل ہوتے وقت اُس نے اماں کی طرف ایک نظر دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ گیٹ پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ البتہ گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کیبن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''اے......اے کہاں منہ اُٹھائے گھسی چلی جا رہی ہیں؟'' انتہائی بدتمیز لہجے میں یقیناً انہیں ہی کہا گیا تھا۔ ماہ نور کو یہ آواز کچھ شناسا سی لگی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ کیبن کے دروازے سے سر نکالے شہسوار اُنہیں ہی گھور رہا تھا۔ ماہ نور کو ایک لمحے کے لیے شدید تاؤ آیا لیکن ضبط کر گئی۔

''آج انٹرویو نہیں تھے کیا؟'' اُس نے اس کی بدتمیزی کو نظرانداز کرتے ہوئے بمشکل اپنی آواز کو نرم رکھا۔

''تھے تو سہی...... لیکن ملک صاحب نے ایک لڑکی کو اپوائنٹ کر لیا ہے۔'' کیبن کا دروازہ بند کرتا وہ اُنہی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''شہسوار......'' بھاری پُروقار آواز پر اُس نے آواز کے تعاقب میں دیکھا۔ اونچا لمبا قد، ورزشی جسم، سرخی مائل گندمی رنگت، کشادہ پیشانی اور پیشانی پر بکھرے بال، گہری گہری ذہین اور متجسس آنکھیں۔ آواز کی طرح شخصیت بھی بارعب اور پُروقار تھی۔

''اوہو...... بھائی......''

''بہت بُری بات ہے شہسوار جھوٹ نہیں بولتے۔ آیئے خاتون تشریف لایئے۔'' وہ صاحب کوریڈور کے دروازے سے دوبارہ اندر کی جانب مڑ گئے۔ اماں اور ماہ نور بھی پیچھے پیچھے کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئیں۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم اپنے مالک کی نفاست پسند طبیعت اور امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کارنر صوفہ سیٹ میں سے ایک پر بیٹھ کر انہوں نے ان دونوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اماں اور ماہ نور دونوں قدرے فاصلے پر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اماں تو اردگرد کے پُرتعیش اور پُرتکلف ماحول کی وجہ سے قدرے مرعوب سی ہو کر سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ البتہ ماہ نور بااعتماد شخصیت کی مالک تھی۔ سو اُس نے اردگرد کے ماحول کا زیادہ اثر نہیں لیا۔

''شہسوار نے ایک بات تو درست کہی تھی کہ صبح سے انٹرویو کا سلسلہ چل رہا تھا لیکن جانے آج

کل کے لوگوں کی پہلی ترجیح پیسہ ہی کیوں ہے۔ یقین جانیے جتنی لڑکیاں بھی آئیں ان کا پہلا سوال سیلری سے متعلق ہوتا تھا۔ بتایئے ذرا کیا محض پیسے کی مدد سے کسی کی بے غرض خدمت اور پُرخلوص جذبے خریدے جا سکتے ہیں۔ آپ کے ساتھ آپ کی والدہ ہیں۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کو اپنی والدہ سے کتنی محبت ہے؟''

''سر محبت ماپی یا تولی نہیں جا سکتی۔ پھر جن رشتوں کا نعم البدل ہی نہ ہو اُن سے تو محبت بھی بے پایاں ہوتی ہے۔''

''مجھے بھی اپنی والدہ سے اتنی ہی محبت ہے۔ چند روز پہلے تک وہ زندگی سے بھرپور خاتون تھیں۔ خدا معلوم یکایک انہیں کیا ہوا۔ فالج کے ایک ہی اٹیک سے ڈھے سی گئی ہیں۔ ان کا دایاں بازو اور دائیں ٹانگ بہت بُری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ میں ان کے لیے ایک ایسی نگران اور نرس رکھنا چاہتا ہوں جو صرف ان کی جسمانی ٹریٹمنٹ ہی نہ کرے بلکہ ان کا ذہن بٹائے، اُن سے باتیں کرے، دل بہلائے تاکہ بیماری ان کے ذہن و دل سے کو متاثر نہ کرنے پائے۔'' ملک معظم نے تفصیلاً ہر بات بتا دی تھی۔

''سر نہ تو مجھے سیلری سے متعلق پوچھنا ہے اور نہ ہی کچھ اور۔ مجھے صرف اور صرف گھریلو ماحول اور تحفظ درکار ہے جو عموماً نوکری پیشہ خواتین کو دستیاب نہیں ہوتا۔ نہ تو میں یہ دعویٰ کرتی ہوں کہ میں آپ کی والدہ کے لیے موزوں ترین ہوں۔ بس اتنا کہوں گی کہ میں ماں کی قدر و قیمت، اس کی اہمیت جانتی ہوں۔'' ملک معظم کی گہری دلچسپ نگاہیں ماہ نور کے صبیح چہرے پر پھیلے سچ کو ٹٹول رہی تھیں۔

''او کے مس ماہ نور...... چلیے میں آپ کو اپنی والدہ سے ملواؤں۔'' ملک معظم یکدم صوفے سے اُٹھ کھڑے ہوئے ماہ نور نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''لیکن سر انٹرویو...؟''

''انٹرویو تو ہو گیا مس ماہ نور۔'' انہوں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آنٹی آپ بھی آ جائیں۔'' وہ اماں سے مخاطب تھے۔

اماں اور ماہ نور ان کی تقلید میں جس کمرے میں داخل ہوئے، ڈرائنگ روم کی طرح اس کمرے کی سجاوٹ بھی اپنی مثال آپ تھی۔ سامنے ہی شاہانہ بیڈ پر سینے تک کمبل اوڑھے ایک ادھیڑ عمر خاتون محو استراحت تھیں لیکن ان کو دیکھ کر ماہ نور کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔

''ایکسکیوزمی سر ابھی چند دن قبل میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے گھر تک ڈراپ کیا تھا۔'' ماہ نور کے لہجے میں واضح تاسف تھا۔ ''انہیں یہ یکدم کیا ہو گیا؟''

دبس کسی ٹینشن کے باعث یہ اس حال کو پہنچ گئیں۔'' ملک معظم کسی گہری سوچ میں ڈوبے مبہم سے لہجے میں بولے۔ پھر جیسے یکلخت چونک کر اماں اور ماہ نور کی طرف دیکھا اور بولے۔

''مس ماہ نور آپ کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے سے رات نو بجے تک ہوگی۔ ماما کو رات کو دوائی کھلانے کے بعد آپ یہاں سے جائیں گی۔ شرفو آپ کو پک بھی کیا کرے گا اور ڈراپ بھی' اور سیلری آپ کو دس ہزار روپے دی جائے گی فی الوقت۔ باقی آپ کی کارکردگی پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔'' اماں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ صرف سارا دن ایک عورت کے پاس بیٹھنے، اس کو کھانا کھلانے اور اس کا دل بہلانے کی تنخواہ دس ہزار۔ سچ ہی ہے دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔

اپنی ماما کے کمرے سے نکل کر کوریڈور کی طرف ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ بتا رہے تھے۔'' اور ہاں یہاں آپ کی ڈیمانڈ بھی پوری ہوگی۔ مکمل طور پر گھریلو سیٹ اپ ہوگا۔ آپ کو کسی قسم کی جھجک یا پریشانی نہیں ہوگی۔ گھر میں ماما کے علاوہ شرفو، مالی بابا اور خالہ فرحون ہی ہوتی ہیں اور بھی جس قسم کا تحفظ اور سیکورٹی آپ چاہیں گی آپ کو دی جائے گی۔ بس ماما کی دیکھ بھال میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔'' ان کا لہجہ نرم لیکن انداز میں محسوس کی جانے والی سختی تھی۔ ماہ نور نے ایک لحظہ کو ان کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکائے ان کے پیچھے چلتی چلتی کوٹھی کے اندرونی حصے سے باہر آ گئی۔

''اور آنٹی ایک بات آپ سے۔ ماہ نور جب تک یہاں رہے گی اس کی حفاظت اور ضرورت کا خیال ہماری ذمہ داری ہوگی۔ آپ اس معاملے میں فکر مند مت ہوئیے گا۔'' ملک معظم اب اماں سے مخاطب تھے جبکہ اماں ان کی سحر انگیز شخصیت اور امارت کو دیکھ کر جانے کیا کیا سوچ بیٹھی تھیں۔ بوڑھی آنکھوں میں جب اُمید ہلکورے لیتی ہے تو سارا چہرہ ہی جذبوں کی حدت سے تمتما اُٹھتا ہے۔ اس وقت اماں کے چہرے پر بھی ایک الوہی سی چمک آ گئی تھی۔

''تمہارا بہت شکریہ بیٹا......'' انہوں نے برقعہ ٹھیک طریقے سے اوڑھتے ہوئے اتنا کہا اور ماہ نور کو ساتھ لیے کوٹھی کے احاطے سے باہر آ گئیں۔

''اماں...... اب تو اجازت مل جائے گی ناں؟ آپ نے خود دیکھ لیا ہے یہاں کا ماحول۔'' سڑک کے کنارے چلتے چلتے ماہ نور نے گہری سوچ میں گم اماں کو مخاطب کیا۔

''اوں...... ہاں...... کیا کہا تم نے؟'' اماں کسی سوچ کے ریلے میں اس کی بات ہی نہ سن سکی تھیں۔

''اماں میں نے یہ کہا ہے کہ اب نوکری کی اجازت دے دیں گی آپ؟''

''ہاں...... اچھے لوگ ہیں، پڑھے لکھے اور دیکھنے میں بہت مہذب بھی۔ مجھے یقین ہے یہ تمہارا بہت خیال رکھیں گے۔'' اماں معظم جاہ کی باتوں سے کسی حد تک مطمئن ہوگئی تھیں۔

''اماں اب کیا پیدل مارچ کرنے کا ارادہ ہے؟ گھر یہاں سے کم از کم بھی دو یا تین کلومیٹر کے

فاصلے پر ہے۔ بہتر ہے کہ رکشہ لے لیں۔'' ماہ نور نے اماں کو یوں سر جھکائے سوچ میں گم چلتے دیکھا تو بول پڑی۔

''تو لے لو...... میں نے منع تھوڑی کیا ہے۔'' اماں کے کہنے پر وہ رُک گئی۔ سڑک پر کافی ٹریفک تھی۔ اُنہیں کچھ دیر تک رکشے کا انتظار کرنا پڑا۔

''شاہو گڑھی ......'' ایک رکشہ انہیں سڑک کے کنارے کھڑے دیکھ کر خود بخود رک گیا۔ پتہ بتا کر اماں اور ماہ نور اس پر سوار ہوگئیں۔

گلی کے شروع پر انہیں اتار کر رکشہ آگے بڑھ گیا۔ ماہ نور اور اماں دھیمی آواز میں باتیں کرتی گلی کے موڑ سے مڑیں تو چاچے ساجے کی دکان کے تھڑے پر کھڑے لفنگوں کو دیکھ کر ایک لمحے کو ماہ نور کا دماغ ہی گھوم گیا لیکن دوسرے ہی پل اُس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

''اوئے ہوئے کیا نوریں ہیں بھئی ......'' انہوں نے اماں کا لحاظ بھی نہیں کیا۔

''اوئے عامر یار پولیس کا چکر کہیں کوئی دوسرا چکر نہ ہو۔ میرا مطلب ہے......'' بات ادھوری چھوڑ کر ارشد نے عامر کو آنکھ ماری۔

''چھوڑ اوئے یار ارشد دانتی پھل کے کھانے کا کیا مزہ۔'' امجد کی تیزی آواز اُبھری۔

اماں اور ماہ نور خاموشی سے سب کچھ سن کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ وہ کتوں کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھیں۔ یوں بھی گھر میں مرد کے نہ ہونے کے باعث وہ اب خود کو بے حد غیر محفوظ سمجھنے لگ گئی تھیں۔

گھر کا دروازہ خلاف توقع بند تھا۔ دستک دینے پر راحین نے دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے...... ؟ دروازہ کیوں لگا رکھا تھا......؟'' ماہ نور نے گھر میں داخل ہوتے ہی سوال کر دیا۔

''وہ...... وہ آپی خالہ پیر دین کا میاں اور ارشد وغیرہ آئے تھے آپ کے جانے کے بعد۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ محلہ شریفوں کا ہے۔ تم لوگوں کے طور طریقے یہاں قابل قبول نہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی معاملہ پڑا ہوتا ہے۔ ہمارے بچوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس لیے ایک دو ہفتوں میں محلہ چھوڑنے کا کہہ رہے تھے۔ گھر میں ہم اکیلے تھے۔ ڈر کے مارے دروازہ بند کر دیا۔'' اماں تو پہلے ہی ان لفنگوں کی باتوں سے دلبرداشتہ ہو رہی تھیں۔ یہ نیا حکم نامہ سن کر تو گویا ان کا چین سکون ہی غارت ہوگیا۔

''ارے کہاں چلے جائیں ہم...... کون سی جگہ ہے ہمارے لیے۔ اپنا گھر چھوڑ دیں لوگوں کی نام نہاد عزت کی خاطر دربدر ہو جائیں۔'' اماں کی آواز شدت کرب سے کانپ اُٹھی۔

''اماں ان عزت کے ٹھیکیداروں سے یہ تو پوچھیں گے کہ ان کی اپنی اولادیں کیا کیا گل کھلاتی

پھر رہی ہیں۔ان کی اخلاق باختہ حرکتوں سے کیا ان کی عزت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔'' ماہ نور کو بھی یہ بات سن کر غصہ آ گیا۔

''بیٹا اپنی اولاد کا عیب کسے نظر آتا ہے۔خدایا تو نے اور کتنی آزمائشیں رکھی ہوئی ہیں میرے لیے۔اب لوگ ہم سے ہمارے سر کی چھت بھی چھیننا چاہتے ہیں۔پاؤں تلے سے زمین کھینچنا چاہتے ہیں۔اے خدا میں ان سیاہ سروں کو لے کر کہاں چلی جاؤں۔'' اماں کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔

''اماں رو کیوں رہی ہیں؟ ان ناخداؤں کا حکم ہے ہم مانیں گے۔بس لیے کہ اس وقت ہم کمزور ہیں لیکن وہ جو ذات اوپر بیٹھی ہے وہ کسی سے کمزور نہیں، طاقتور سے طاقتور بھی اس کے آگے ناتواں ہے۔اماں وہ تو ہے ناں ہمارے ساتھ۔وہ کوئی سبب بنا دے گا۔'' ماہ نور اندر سے ریزہ ریزہ ہونے کے باوجود اماں کو بہلا رہی تھی۔اماں آنسو پونچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''نور بیٹا...... کیا...... یہ لوگ ہمیں چین سے نہیں رہنے دیں گے؟ ہم نے کسی کا بگاڑا کیا ہے؟'' اماں اُس سے پوچھ رہی تھیں اور ماہ نور کی نم پلکیں جواب دے رہی تھیں کہ ان کا عورت ہونا ہی تو سب سے بڑا بگاڑ ہے۔

''اماں آپ پریشان نہ ہوں۔انشاء اللہ بہت جلد کوئی بندوبست ہو جائے گا۔'' مجھے نوکری مل گئی ہے۔اب کوئی پریشانی نہیں۔'' ماہ نور قدرے پُرجوش انداز میں کہہ رہی تھی۔

''آپی...... آپی یہ خط باہر دروازے کے پاس نیچے پڑا ہوا تھا۔اوپر آپ کا نام لکھا ہے۔'' شاہین نے اندر آ کر ایک خط ماہ نور کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ماہ نور نے پہلے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر لفافے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔نام تو اُسی کا تھا۔انداز تحریر جانا پہچانا تھا۔یکدم اس کا دل دھڑک اُٹھا۔ہاتھوں میں نرماہٹ آمیز لرزش آ گئی۔دل کی دھڑکن کو قابو کرنے کی کوشش کرتے کرتے اُس نے لفافہ چاک کیا اور کسی صحیفے کی طرح احترام سے لفافے کے اندر تہہ شدہ کاغذ باہر نکال لیا۔اماں، شاہین اور راہین اس کے گرد بیٹھی ہوئی تھیں۔اُس نے ایک نظر سب کے چہروں کی جانب دیکھا اور پھر خط کی سطروں پر نظریں دوڑانے لگی۔

نور!

اسلام علیکم

دوسری بار تم سے مخاطب ہوں۔میں جانتا ہوں تم کیسی لڑکی ہو، اس لیے تمہیں بلاوجہ تنگ کرنا نہیں چاہتا۔پچھلی مرتبہ خط لکھنا ضروری تھا اور اب بھی بہت ضروری ہے۔تمہیں میں نے بتایا تھا کہ اب پولیس تمہیں تنگ نہیں کرے گی۔اب پھر کہہ رہا ہوں کہ تم ہر معاملے میں بری الذمہ ہو چکی ہو۔

میں نے تھانے میں اپنا اقرار نامہ بمعہ بیان داخل کر دیا تھا جن وجوہات کی بناء پر میں نے سیٹھ کو قتل کیا اور یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ میڈم کو بھی میں نے ہی قتل کیا ہے۔تم حیران ہو رہی ہو گی کہ کیوں؟ تو اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ وہ بوتیک کے نام پر قحبہ خانہ چلا رہی تھی۔وہاں موجود تمام ملازم خواتین یا لڑکیاں کٹھ پتلیوں کی طرح اس کے اشاروں پر ناچتی تھیں۔اس لیے کہ وہ ان کی عزتوں کا سودا کرنے کے بعد ویڈیو کیسٹس میں اور کیمرہ کے ذریعے ان کی قابل اعتراض تصاویر لے لیتی تھی اور بعد میں انہیں بلیک میل کر کے اپنی مرضی کے مطابق دھندہ کروالی تھی۔سو ایسے لوگ جو دھرتی کا بوجھ ہوں انہیں ختم ہی ہو جانا چاہیے۔مجھے اس بات پر کوئی افسوس نہیں کہ میں نے سیٹھ حبیب الرحمٰن اور میڈم نظامانی کے گندے خون سے اپنے ہاتھ رنگے بلکہ اس بات کی خوشی ہے کہ بہت سی لڑکیوں کی عزت پر حرف آنے سے رہ گیا۔بہت سی بہنیں درندوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئیں۔میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں بہت عظیم انسان ہوں۔ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جو بھی سیٹھ یا میڈم کے نقش قدم پر چلے گا۔میرے ہاتھ سے بچے گا نہیں۔

آخر میں صرف ایک بات۔تم نے میری آفر قبول نہیں کی۔میں تمہاری خودار طبیعت کو مانتا ہوں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اب محلے والے تم لوگوں کو اور بھی زیادہ تنگ کرنے لگے ہیں۔اس لیے میری آفر پر غور ضرور کرنا۔

خیر اندیش

بلیک مین

ماہ نور نے خط کو تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں ڈال دیا۔اماں، شاہین اور راہین ابھی تک حیرت کا شکار تھیں۔کتنی بڑی مصیبت سے اللہ میاں نے کتنی آسانی سے بچا لیا۔

''یہ بلیک مین تو رحمت کا فرشتہ ہے۔'' شاہین کہہ رہی تھی۔

''ویسے آپی آپ کو اس کی آفر قبول کر لینی چاہیے۔'' شاہین نے کہا تو اماں نے بھی تائید میں سر ہلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں بیٹا جب کوئی اس قدر خیال رکھتا ہو تو جواب میں ہمیں بھی چاہیے کہ اس کا دل نہ توڑیں۔یوں بھی ہم گھر کے لیے پریشان ہی ہیں۔اللہ نے گھر بیٹھے بیٹھے ہی سبب پیدا کر دیا۔'' ماہ نور

نے اماں کی طرف بہت عجیب سے انداز سے دیکھا۔

"اماں لگتا ہے آپ ابو جی کا کہا بھول گئیں۔ یاد ہے کہ وہ کیا کہا کرتے تھے؟ احسان لینے سے کہیں بہتر ہے محروم رہنا۔ کیا ہم جانتے ہیں کہ یہ بلیک مین کون ہے؟ ممکن ہے وہ انڈر ورلڈ کا کوئی چلتا پُرزہ ہو۔ کوئی چور، ڈاکو یا ڈکیت بھی تو ہو سکتا ہے۔ خدا جانے کن ذرائع سے کمائی ہوئی دولت ہے جو اتنی آسانی سے بانٹتا پھر رہا ہے۔ ایک بار کسی کے کام آ جانے والا انسان ضروری نہیں اتنا ہی مخلص ہو کہ ہمیشہ کام آتا رہے۔ وہ تو امدادِ غیبی تھی لیکن مجھے اس کے فلیٹ اور ان نوٹوں سے کوئی غرض نہیں۔"

ماہ نور نے پختہ لہجے میں کہا۔ اس کے انداز میں باپ کی تربیت بول رہی تھی۔ وہی باپ جنہوں نے زندگی بھر انہیں گرم لو کے تھپیڑوں سے اور سرد ہواؤں کی چیرہ دستیوں سے بچائے رکھا اور جن کے دنیا سے چلے جانے کے بعد وہ سب یکلخت بے سایہ ہو کر کڑی دھوپ تلے آ کھڑے ہوئے تھے۔ ماہ نور کے چہرے پر پھیلا عزم سب ہی کے حوصلوں کو بلند کر گیا۔ زندگی پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہونے جا رہی تھی لیکن لگ رہا تھا کہ ماہ نور کے حوصلے اور عزم کے راستے میں آنے والی ہر مشکل ہر پریشانی ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔

☆..........☆..........☆

چوہدری الیاس کی حویلی کے مین گیٹ کے سامنے ایک سیاہ رنگ کی شیراڈ رُکی اور اس میں سے وہ باہر نکلا۔ بلیک لیدر کی پینٹ شرٹ، بلیک لانگ شوز اور آنکھوں پر بھی بلیک گلاسز لگائے وہ دھیمی رفتار سے چلتا ہوا چوکیدار کے قریب آ گیا۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر اُس نے ادھ جلا سگریٹ نیچے پھینک کر مسل دیا۔

"اندر جا کر چوہدری صاحب سے کہو بلیک مین آیا ہے۔" چوکیدار اس کی ظاہری پوزیشن اور حلیے سے مرعوب سے ہو گیا۔ اُس نے انٹر کام پر اس کے آنے کی اطلاع دی۔

"سرکار کہہ رہے ہیں فوراً اندر چلے جائیں۔" چوکیدار چوہدری کی ڈانٹ سے خائف ہو کر بولا۔ وہ جان گیا تھا کہ بلیک مین کوئی خاص آدمی ہی ہے۔ جسے گیٹ پر روک کر اُس نے غلطی کی ہے۔ بلیک مین نے ایک تمسخرانہ نظر اُس کی سمت اُچھالی اور مسکراتا ہوا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

"ارے بلیک مین..... ادھر کا راستہ کیسے بھول گئے؟" مردان خانے کے دروازے پر ہی چوہدری اُسے اپنے استقبال میں کھڑا نظر آ گیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے اُسے گلے لگا کر پوچھا۔

"بس چوہدری صاحب ایک دو کام نمٹانے کے لیے گاؤں آیا تھا۔ ریاض نے بتایا کہ آپ یاد کر رہے تھے تو سوچا جاتے جاتے آپ سے بھی ملتا چلوں اور پوچھتا چلوں کہ مجھے کس سلسلے میں یاد کیا

ہے آپ نے؟"

بلیک مین بے تکلفی سے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔ چوہدری صاحب جس صوفے پر بیٹھے تھے ان کے ہمراہ ایک اور بھاری بھرکم شخصیت بھی تشریف فرما تھی۔

"خان صاحب یہ ہے بلیک مین، جس کا میں اکثر تذکرہ کرتا رہتا ہوں۔" چوہدری الیاس کے کہنے پر خان صاحب نے دلچسپی بھری نظروں سے اس کو دیکھا لیکن وہ تھا کہ بالکل بے نیاز بنا بیٹھا تھا۔

"بلیک مین! چھ سال پہلے کا واقعہ یاد ہے؟"

"بالکل یاد ہے....." بلیک مین قدرے سیدھا ہو بیٹھا۔ ابھی اگلی بات چوہدری کے منہ میں ہی تھی کہ وہ معاملے کی نوعیت کو کسی حد تک سمجھ گیا۔

"اُسی کالج میں اُسی پوسٹ پر جس پہ ہماری مدد سے تم منتخب ہوئے تھے اب میرا بیٹا الیکشن میں کھڑا ہے۔ تم تو جانتے ہو حماد کس قدر ضدی اور غصہ ور ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس کی کمپین تم چلاؤ۔ اُسے ہر حالت میں جیتنا چاہیے۔" چوہدری کے لہجے سے غرور اور رعونت ٹپک رہی تھی۔ اپنے انتہائی بگڑے ہوئے بیٹے کو وہ کالج یونین کا صدر دیکھنا چاہ رہا تھا۔

"بلیک مین! اس وقت تمہارے ساتھ ہماری مکمل مدد تھی اب ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"اُس مدد کے عوض کتنی خدمات لے چکے ہو مجھ سے تمہاری نیت سیر نہیں ہوتی۔" بلیک مین کے دماغ میں سوچ کی لہر اُبھری۔

"چوہدری صاحب اتنے سے کام کے لیے آپ اس قدر پریشان ہیں؟"

"نہیں، میں صرف حماد کی طبیعت سے خائف ہوں۔ اگر نتیجہ اس کی سوچ اور مرضی کے برعکس نکلا تو ایسا فساد ہوگا کہ دنیا دیکھے گی۔ میں اُس سے اچھی طرح واقف ہوں وہ معاف کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ اُس نے مخالفوں کے بندے پھڑکا دینے ہیں اور مصیبت میرے گلے پڑ جانی ہے جبکہ اس وقت میں کسی قسم کی مصیبت اور پریشانی افورڈ نہیں کر سکتا۔" چوہدری حقے کی نے کو منہ میں لے کر کش لینے کے ساتھ ساتھ بلیک مین کو تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ بلیک مین کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کس قدر بااختیار اور چلتا پرزہ ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ ہر شعبے کے بڑے بڑے افسروں سے اس کی اچھی خاصی علیک سلیک تھی۔ اُلٹے کاموں کو سیدھے طریقے سے کرنے میں وہ انتہائی مہارت رکھتا تھا۔

"چوہدری صاحب مخالف سیٹ پر کون ہے؟"

"ملک شہسوار..... ملک معظم کو تو تم جانتے ہی ہو ملک ٹیکسٹائل ملز کا مالک، اُس کا چھوٹا بھائی ہے۔ حماد بتا رہا تھا کہ شہسوار کے جیتنے کے چانسز زیادہ ہیں۔ جتنی رقم لگے، لگا دینا۔ بس نتیجہ ہمارے حق

میں ہونا چاہیے۔'' چوہدری صوفے سے اُٹھ کر سیف کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ سیف کھول کر بریف کیس نکالا اور لا کر بلیک مین کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''پانچ لاکھ پیشگی رکھ لو اور ہاں' آتے جاتے رہنا تا کہ الیکشن کی کمپین کے سلسلے میں تفصیلات سے آگاہی ہوتی رہی۔''

''او کے چوہدری صاحب...... اب میں چلتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ اب سارا کام میرا ہے۔ آپ سمجھ لیں کام ہو گیا۔'' بلیک مین بریف کیس اُٹھا کر مردان خانے سے نکل گیا۔

خان صاحب اس تمام عرصے میں خاموش تماشائی بنے صرف سب کچھ سنتے رہے تھے، انہیں بلیک مین کے اندر بہت صلاحیتیں دکھائی دی تھیں۔ سب سے بڑی خوبی اس کا اعتماد اور اس کی بارعب شخصیت کا وقار تھا۔

''خان صاحب' دیکھا آپ نے اس لڑکے کو۔ پیار سے اسے میں بلیک مین پکارتا ہوں اسے اپنا اصل نام نہیں پسند۔ اپنے خاندان سے شدید نفرت ہے اسے۔ گھر بار چھوڑ کر ادھر ادھر رُلتا پھرا۔ پھر کسی کی سرپرستی اور مدد سے اور کچھ اپنی محنت سے کالج لیول تک پہنچ گیا۔ آج سے چھ سال پہلے یہ ہیرا سڑکوں پر یوں رُل رہا تھا جیسے کوئلہ۔ میں نے اس کی ظاہری کالک کے اندر چھپی چمک دیکھ لی تھی۔ صرف تھوڑا سا جھاڑنا پڑا اور یہ یوں چمک اُٹھا کہ ان چھ سالوں میں جو کام میرے سانڈ جیسے پلے ہوئے غنڈے نہیں کر سکے یہ محض دماغ سے کام لے کر وہ کام سرانجام دیتا ہے۔''

''چوہدری صاحب آپ کے کیا کہنے آپ تو جوہر شناس ہیں۔'' خان صاحب واقعی بلیک مین سے متاثر ہوئے تھے۔ ''کیا یہ میرے لیے بھی کام کرے گا؟''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں معاوضے پر یہ کسی کا بھی کام کر سکتا ہے۔'' چوہدری اپنی اور اپنے بندے کی تعریف پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ چھ سال پہلے ایک چھوٹے سے احسان کے بدلے بلیک مین کتنی ہی بار اس کے کام آیا تھا اور چوہدری نے بھی معاوضہ دینے میں کوئی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ اس لیے کہ وہ بلیک مین جیسے بندوں سے بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

☆..........☆..........☆

صبح آٹھ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ ماہین، گڈو اور راہین چند لمحے پہلے سکول کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ شاہین کو ہی مجبوراً دروازے پر آنا پڑا۔ عام حالات میں ماہ نور نے شاہین اور راہین کو دروازے پر جانے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ اماں کمرے میں بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ صبح کا ناشتہ بنانا ماہ نور کی ذمہ داری تھی سو وہ رسوئی میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ باقی سب کو ناشتہ کروا دیا تھا۔

''کون ہے؟'' دروازے کے اندر سے ہی شاہین نے پوچھا۔

''بی بی میں ہوں شرفو...... ماہ نور بی بی کو لینے آیا ہوں۔'' باہر سے آواز آئی تھی۔ شاہین نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر ایک اُدھیڑ عمر باوردی ڈرائیور کھڑا تھا۔ ''جی اچھا۔'' شاہین پلٹ کر رسوئی کی طرف آ گئی۔

''آپی آپ کو لینے کے لیے گاڑی آ گئی ہے۔'' ماہ نور نے شاہین کی آواز سنتے ہی چائے کا کپ نیچے رکھا اور جلدی سے اُٹھ کر کمرے کے اندر آ گئی۔ چادر اچھی طرح اوڑھ کر اماں کے قریب چلی آئی۔

''اچھا اماں اجازت دیں دعا کیجئے گا۔'' ماہ نور نے اپنا سر اماں کے آگے کر دیا۔ اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کچھ پڑھ کر پھونکا۔ جواباً اُس نے بھی اماں کے گال پر پیار کیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی باہر نکل گئی۔ گلی کے نکڑ پر حسب معمول اور حسب توقع لوفروں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔

''اوئے ارشد اب کیا کوئی نیا چاند چڑھانا ہے۔''

''اوئے نہیں اوئے...... تم کیا جانو لمبی گاڑیوں میں بیٹھنے کا تو سواد ہی اور ہے۔'' عامر اور ارشد کے قہقہے لگا کر اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح انہیں نظر انداز کرتی وہ ڈرائیور کے ساتھ گلی کا موڑ مڑ گئی۔ شرفو نے گاڑی کا پچھلا دروازہ اس کے لیے کھولا وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور خود پلٹ کر ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولنے لگا۔

''اوئے یار امجد اب تو بھلا کہاں ہماری طرف دیکھے گا۔'' شرفو نے آواز کے تعاقب میں دیکھا۔ اس کے سامنے پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر اُس نے دروازہ بند کیا اور زن سے گاڑی آگے بڑھ گئی۔

ماہ نور بڑے شرفو کے سامنے واضح شرمندگی محسوس کی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ ان لوفروں نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ شرفو نے سن لیا تھا۔ تمام راستے گاڑی میں خاموشی رہی جس وقت کوٹھی میں ان کی گاڑی داخل ہو رہی تھی گرے کر ولا گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ ماہ نور نے طمانیت بھرا سانس لیا۔ شرفو نے گاڑی پورچ میں کھڑی کر دی۔ ماہ نور خود ہی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ کل کی طرح آج بھی کوٹھی پر سناٹے کا راج تھا۔ وہ سہج سہج قدم اٹھاتی کوریڈور کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ گرے تھری پیس سوٹ میں اپنی پروقار شخصیت کے ساتھ ملک معظم جاہ لاؤنج میں بیٹھے یقیناً اُسی کے منتظر تھے۔

''اسلام علیکم سر۔'' ماہ نور نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''آیئے مس ماہ نور میں آپ کو ماما کی روٹین سمجھا دوں۔ تا کہ آپ کو کسی قسم کی دقت نہ ہو۔'' وہ

اُس سے آگے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے کھڑے رہے تھے۔ ماہ نور نے جواب میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی والدہ کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ماہ نور نے بھی ان کی تقلید کی۔ کل کی طرح آج بھی وہ سینے تک کمبل لیے چت لیٹی تھیں۔

''ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے مما خود جاگ جاتی ہیں، نہار منہ ان کو یہ ٹیبلٹ دینی ہے۔ اس کے آدھے گھنٹے کے بعد دو سلائس ڈبل روٹی ایک گلاس دودھ کے ساتھ۔ ٹھیک دس بجے ماما کی ٹانگ اور بازو کا مساج۔ بارہ بجے ان کو لنچ چاہیے ہوتا ہے' تب تک خالہ زیتون آ جاتی ہیں۔ لنچ کا مینو وہ جانتی ہیں۔ لنچ کے بعد دوائی۔ پھر ایک بجے سے لے کر تین بجے تک ماما سوئیں گی۔ اس دوران آپ اپنی مرضی اور دلچسپی کے مطابق کوئی کتاب بھی پڑھ سکتی ہیں۔ چاہیں تو فلم دیکھ لیں یا پھر آرام کر لیں۔ تین بجے ماما کو اُٹھا کر یہ میرون کلر کا کیپسول ملک شیک کے ساتھ دینا ہے۔ اس کے بعد رات تک وہ کچھ نہیں کھائیں پئیں گی۔ البتہ آٹھ بجے رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ کچھ دیر باتیں کرنا پسند کرتی ہیں۔ اس وقت تک شہسوار بھی آ جاتا ہے۔ وہ بھی کمپنی دے گا۔ کھانے کے بعد دوا کھلا کے آپ کا آف ہو جایا کرے گا۔'' ماہ نور نے ان کے میکانکی انداز سے روٹین بتانے پر بمشکل ہونٹوں میں آئی ہنسی کو قید کیا۔ شاید آج اُنہیں اس کی وجہ سے آفس سے دیر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بغیر کوئی بات کیے سیدھا سیدھا اُسے روٹین سمجھانے لگے تھے۔ ماہ نور کچھ حیران بھی تھی کہ ان کی ماما کی زندگی تو فوجیوں سے بھی زیادہ ڈسپلنڈ تھی۔

''اور آخری بات۔ ماما کو بنا پوچھے' بنا بتائے آپ گھر سے باہر نہیں لے جائیں گی اگر یہ ضد کریں تب بھی نہیں اور اس روٹین میں بھی کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہونا چاہیے۔'' اپنے ازلی نرم مدہم لہجے میں مزاج کی سختی شامل کیے وہ بول رہے تھے۔

''جی سر...'' ماہ نور نے قدرے مؤدب انداز میں کہا۔ اعتماد اپنی جگہ لیکن اس وقت وہ ایک ماتحت تھی۔

''اوکے مس ماہ نور میں اب چلتا ہوں .... آپ کے انتظار میں' میں آفس سے تو کافی لیٹ ہو گیا ہوں۔ بہرحال ہیو آ نائس ڈے ود مائی مدر۔'' وہ پلٹ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ماہ نور کمرے میں ادھر اُدھر کا جائزہ لینے لگی اور پھر بیڈ سے قدرے ہٹ کر رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ابھی سوا آٹھ بجے تھے اور اس کی پیشنٹ کے جاگنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اُس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا رسالہ اُٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

''ب... بیٹا... م... مجھے... او... ٹھا... دو۔'' لرزتی ہوئی تمکنت آمیز آواز میں یقیناً اُسے ہی مخاطب کیا گیا تھا۔ اُس نے رسالہ ایک طرف رکھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر ان کے قریب

بیٹھ گئی۔ پشت سے ان کا سر اور کندھے قدرے اونچے کر کے اُس نے گاؤ تکیہ کا سہارا دیا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُسے دیکھ کر اُن خاتون کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی پرچھائی اُبھری تھی۔

''تم... تم...'' وہ ہاتھ کا اشارہ اس کی طرف کر کے جو کہنا چاہ رہی تھی وہ جان گئی تھی۔

''جی... میں وہی ہوں۔ جسے آپ نے شاہ بوگو جی تک ڈراپ کیا تھا چند دن پہلے۔'' اس کے جواب پر ان کے چہرے کے کھنچے تنے ہوئے نقوش جن کی جاذبیت میں بے حد کمی آ گئی تھی جیسے دھیرے سے مسکرا اُٹھے ہوں۔ ماہ نور ان کے پاس سے اُٹھ کر باتھ روم میں گئی اور ایک تولیہ بھگو کر لے آئی۔ دھیرے دھیرے ان کے چہرے اور گردن اور پھر ہاتھوں کو اس نے بھیگے ہوئے تولیے سے صاف کیا۔ پھر ایک گولی ان کے منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ گولی نگل لینے کے بعد انہوں نے سر کو تکیے پر رکھ دیا۔ اتنی سی ہی دیر میں وہ یوں ہانپ گئی تھیں جیسے میلوں پیدل سفر کر کے آئی ہوں۔

''آنٹی... آپ کے بالوں میں کنگھی کر دوں؟'' ان کے سلکی بال عجیب بے ہنگم سے انداز میں اُلجھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کئی دنوں سے سلجھائے ہی نہ گئے ہوں۔ اس کے سوال کے جواب میں انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ہیئر برش لے کر ان کے سرہانے بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے ان کے بال سلجھانے لگی۔

''آنٹی میں نے جب پہلی بار آپ کو دیکھا تھا ناں تو اس وقت آپ کی پرسنالٹی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ مجھے آپ میں اپنی اماں کی جھلک دکھائی دی تھی اور اب مجھے آپ سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کا موقع مل گیا ہے۔ آنٹی آپ کو بھوک تو نہیں لگی؟'' باتیں کرتے کرتے اُسے احساس ہوا کہ آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے۔ پہلے ہی دن کو تاہی ہونے لگی تھی۔

''ہ... ہاں... لل... لگی ہے... لل... لیکن... مم... میں... دو... دودھ نہیں... پیوں... گی۔'' ان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''لیکن آنٹی ملک صاحب تو کہہ کر گئے تھے کہ آپ کو دو سلائس ڈبل روٹی ایک گلاس دودھ کے ساتھ دینے ہیں۔''

''نن... نہیں... پھ... پھر میں... ن... ناش... تہ... نہیں... کروں... گی۔''

''آنٹی پھر آپ کیا لینا پسند کریں گی؟''

''ایک... کپ... چ... چائے... ایک... انڈہ...'' ماہ نور کے نزدیک ان کی فرمائش ایسی خطرناک بھی نہیں تھی کہ جسے پورا کرنے سے کسی نقصان کا احتمال ہو۔ وہ کچن میں گئی اور ان کے لیے ان کی مرضی کا ناشتہ بنا لائی۔ آنٹی نے شوق سے ناشتہ کیا۔ البتہ چائے پیتے وقت ماہ نور کو ان کا

زیادہ خیال رکھنا پڑا ان کے چہرے پر داہنی جانب مخصوص کھینچاؤ تھا جو ان کے کھانے پینے اور بول چال کے وقت زیادہ نمایاں اور رکاوٹ کا باعث تھا۔ ناشتے کے بعد ان کا منہ صاف کر کے ماہ نور نے ان کی پشت پر گاؤ تکیہ لگا دیا تاکہ وہ سہولت سے لیٹ سکیں۔

''آنٹی مجھ سے پہلے آپ کے پاس کون تھا۔ یعنی کون آپ کی دیکھ بھال کرتا تھا؟''

''ایک لل لڑکی... تھی لیکن میری بیماری ... سے گھبرا... کر... تت تیسرے ہی دن... چھو... ز... کر... چلی... گئی...'' وہ اٹک اٹک کر بتا رہی تھیں۔

''اس کے جانے... کے بعد... معظم... میری دیکھ بھال کک کر کرتا تھا۔ جب... تک... زیتون... نہیں آ... جاتی تھی۔ تت... تمہا را نام تو میں نے... پوچھا ہی... نن نہیں۔''

''ماہ نور علی نام ہے میرا آنٹی۔''

''نور... تم... یہاں آنے سے پہلے... کیا... کرتی... تھی؟''

''ایک بوتیک میں جاب کرتی تھی آنٹی لیکن چھوڑ دی۔''

''اچھ... چھا... کیا۔'' جیسے وہ اس کے فیصلے سے بہت خوش ہوگئی تھیں۔ ماہ نور کے لیے یہ ایک شاک ہی تھا۔ اس قدر مہربان خاتون اس وقت کتنی تکلیف میں تھیں۔

''نور... میں... میں بیٹھنا چاہتی... ہوں۔'' نور نے دوبارہ انہیں تکیے کا سہارا دے کر بٹھا دیا۔

''آنٹی آپ سارا دن بور نہیں ہوتیں یوں اکیلی؟''

''نہیں میری... تنہائی ہی.... میری... اچھ چھی... دوست ہے۔''

''آنٹی مطالعے سے لگاؤ ہے آپ کو؟''

''ہا... ہاں...'' اُس نے ان کا مثبت جواب سن کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا کوئی خواتین کا رسالہ اُٹھا لیا اور پھر کتنی ہی دیر انہیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں، حکایتیں، لطائف سناتی رہی۔ ان کی دلچسپ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ وہ اس کے انداز بیاں سے بہت محظوظ ہو رہی تھیں۔ ماہ نور نے ان کے چہرے پر پھیلے لطف کے رنگ دیکھ لیے تھے۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ مہربان خاتون تنہائی کو دوست تو کہہ رہی ہے لیکن درحقیقت وہ اپنی تنہائی سے اُکتائی ہوئی ہے۔ اُسے بھرپور توجہ اور محبت کی ضرورت تھی اور ماہ نور نے سچے دل اور خلوص کے ساتھ اُن خاتون کا ساتھ قبول کیا تھا۔ پھر ان کے بازو اور ٹانگ کا مساج کرنے کے دوران بھی وہ اسی طرح اُن سے گپیں لگاتی رہی اور اس کی ادث پٹانگ باتوں کو بھی خصوصی توجہ سے سنتی رہی۔

خالہ زیتون آ گئی تھیں اور اب باہر اُٹھا پٹخ کھٹر پٹر کی آوازیں شروع ہو گئی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ آتے ہی صفائی میں جت گئی ہیں۔ جس وقت ماہ نور مسز ملک کو ایکسرسائز کروا رہی تھی۔ اس وقت خالہ زیتون نے تقریباً تین ایک دفعہ کمرے میں جھانک کر دیکھا اور ہر دفعہ حیران تقریں لیے واپس ہولیں۔ ماہ نور کو ان کا حیرت زدہ ہونق سا چہرہ دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

''آنٹی۔ یہ خالہ زیتون کس بات پر اتنا حیران و پریشان ہو رہی ہیں؟'' جواب میں مسز ملک بمشکل مسکرائیں۔

''دراصل میں نے کک کبھی اس سے بات... نن... نہیں کی ناں تو اس لیے۔'' وہ معصوم سے انداز میں بولیں۔

''کیا یہ شروع سے یہاں ملازمت کرتی ہیں؟''

''شاید پپ پانچ یا چھ چھ سال ہو گئے ہیں۔''

''آنٹی آپ دن کے وقت کیا لیتی ہیں؟''

''اُبلے ہوئے چچ چاول اور سوپ۔'' اس بار بھی انہیں نے بہت بُرا سا منہ بنایا۔

''چلیں آنٹی میں آپ کے لیے کھانا تیار کروں گی۔'' ماہ نور نے انہیں سیدھا لٹاتے ہوئے کہا تو ان کی آنکھوں میں روشنی سی اتر آئی۔ جیسے وہ روزمرہ کے معمول سے تنگ تھیں۔ ماہ نور نے کچن میں جھانک کر دیکھا۔ خالہ زیتون نہایت تندہی سے برتن مانجھنے میں معروف تھیں۔

''خالہ آنٹی کا کھانا تو ابھی تیار نہیں؟''

''تیار ہے۔ فریج میں رکھا ہے۔'' خالہ زیتون کی بات سن کر ماہ نور نے فریج کھول کر دیکھا۔ کل کے بچے اُبلے ہوئے چاول اور ایک کٹوری میں سوپ رکھا تھا۔

''خالہ یہ تو یوں لگتا ہے جیسے کل کے تیار شدہ ہیں۔''

''ارے تو کیا ہو گیا۔ ذرا سا چاولوں کو پانی کا چھینٹا دے کر دم لگا دو۔ تازہ دم ہو جائیں گے اور سوپ تو خراب ہوتا نہیں۔'' اُسے کام چور خالہ زیتون پر شدید غصہ آیا۔ کم از کم مریض کو تازہ کھانا ملنا چاہیے۔

''خالہ آئندہ سے آنٹی کے لیے کھانا میں خود تیار کروں گی۔''

''آئے ہائے تو بھلا میں کیا زہر ملا دیتی ہوں۔'' خالہ تو اچھی خاصی تیز مرچ مزاج تھی۔

''خالہ بیمار کو تو بہت زیادہ صفائی اور اچھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ باسی کھانے سے بھلا اُن میں کیا قوت مدافعت پیدا ہوگی۔''

''ایک تو آج کل کی چھوکریاں دو جماعتیں کیا پڑھ لیتی ہیں بڑوں کو تو احمق سمجھنے لگتی ہیں۔''

خالہ خود کلامی کے سے انداز میں بآواز بلند گویا تھی لیکن ماہ نور نے پھر توجہ نہ دی۔ بیس منٹ رہ گئے تھے مسز ملک کے لنچ میں۔ سو اُس نے تیزی سے فریزر میں سے چکن نکال کر اُس کی یخنی تیار کی۔ بوٹیاں الگ کر کے ایک چمچ آئل میں نمک، سیاہ مرچ، سویا ساس ڈال کر ہلکی ہلکی فرائی کر لیں۔ اور دوسری طرف یخنی میں ایک کیوب ڈال کر ایک کپ چاول اُبال لیے۔ گرم گرم اور ساتھ میں ہلکا فرائی شدہ گوشت پلیٹ میں نکال کر وہ آنٹی کے کمرے میں آ گئی۔

تکیے کا سہارا دے کر انہیں بٹھایا۔ گردن کے اردگرد رومال پھیلا کر اُس نے انہیں کھانا کھلانا شروع کیا۔ پہلا چمچ لیتے ہی جیسے انہوں نے توصیفی بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا لیکن بولی کچھ نہیں اور وہ جو تین چار چمچ بمشکل کھا کر کھانا واپس کر دیتی تھیں۔ چاولوں کی بھری ہوئی پلیٹ بمعہ فرائی چکن دھیرے دھیرے کھا لیا۔ یقیناً انہیں کھانے کے لیے بدذائقہ چیزیں ملتی تھیں۔ اسی لیے وہ کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ پھر جب وہ برتن کچن میں واپس رکھنے آئی تو خالہ زیتون پلیٹ گوشت سے بھرے سٹول پر بیٹھی ہبڑ ہبڑ کھانے میں مصروف تھیں۔ اُسے دیکھ کر قدرے کھسیا گئیں۔

''کیا چاہیے؟'' جھینپ مٹانے کے لیے نہایت مستعدی سے انہوں نے پوچھا۔

''کوئی پھل یا پھر جوس۔''

''فریج میں جوس رکھا ہے۔''

ماہ نور نے دیکھا تو ایک بار پھر اُسے کوفت ہونے لگی جانے کب کا جوس جگ میں رکھا ہوا تھا۔ جوس کے کنارے پر سفید سی کائی جمی ہوئی تھی۔

''خالہ یہ جوس تو خراب ہے۔''

''ارے کاہے کا خراب ہے ٹھیک ٹھاک ہے چکھ کر دیکھو۔'' خالہ نے شیلف پر جو پلیٹ رکھ دی تھی، دوبارہ سے اُٹھائی اور کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

''کمال ہے خالہ۔'' ماہ نور اتنا ہی کہہ سکی۔ پھر اُس نے ایک سیب اور چند اسٹرابیریز لے کر دودھ میں ڈالے اور جوسر میں ڈال کر بلینڈ کر کے ایک گلاس بھر لیا اور آنٹی کو لا کر پکڑا دیا۔ آنٹی نیم درازی اُلٹے ہاتھ میں گلاس تھامے ایک ایک سپ لینے لگیں۔

''نور... یقین جانو... دس دن کے بعد... آج... پہلی بار... میں نے کھانا کھایا... ہے۔ پتہ نہیں... یہ ز... تو... ن کس... طرح کھ... کھانا بناتی... تھی... کہ... دل ہی... نہیں چاہتا... تھا کھانے کو۔''

''آنٹی اب آپ کا کھانا میں بنایا کروں گی۔'' وہ انہیں یہ نہ بتا سکی کہ آپ کا کھانا تو نارمل لوگوں کا بھی کھانے کو جی نہ چاہے۔ آپ تو پھر بیمار ہیں اور بیماری میں تو ویسے کھایا نہیں جاتا۔

''ٹھ... ٹھیک... ہے۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ دوائی کھانے کے بعد وہ کچھ دیر تو اس کے ساتھ باتیں کرتی رہیں۔ پھر جب اُن کو نیند آنے لگی تو ماہ نور نے انہیں سہولت سے لٹایا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ خالہ زیتون ٹھیک ساڑھے بارہ بجے کسی اور گھر میں کام کرنے کے لیے چلی جاتی تھیں۔ سو اس وقت بھی وہ جا چکی تھیں۔ صبح سے تو ماہ نور کو کوئی بوریت نہیں ہوئی تھی لیکن اب آنٹی کے سو جانے کے بعد اس کے پاس کرنے کو کچھ کام تھا ہی نہیں۔ وہ گھوم پھر کر کوٹھی کا اندرونی حصہ دیکھنے لگی۔ ہر کمرے کی ڈیکوریشن اپنی مثال آپ تھی۔ وہ دل ہی دل میں اہل خانہ کے ذوق کو سراہ رہی تھی۔ گھومتے گھماتے ایک کمرے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ یہ کوئی اسٹڈی روم تھا یا شاید بیڈ روم تھا؟ ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو پایا۔ ایک طرف بڑا سا جہازی سائز بیڈ لگا تھا جس کے بالکل ساتھ ہی ٹرالی میں ٹی وی سیٹ رکھا تھا اور ڈیک سیٹ کیا ہوا تھا۔ تین اطراف دیوار گیر الماریوں میں کتابوں کو نہایت نفاست اور ترتیب سے لگایا گیا تھا۔ ایک طرف رائٹنگ ٹیبل پر کمپیوٹر بمعہ پرنٹر اور سکینر رکھا ہوا تھا۔ وال ٹو وال گرے کارپٹ، ڈارک گرے پردوں اور بیڈ شیٹ نے کمرے کی سجاوٹ کو ایک عجیب طرح کی جاذبیت بخشی تھی۔ ماہ نور کچھ دیر تو کتابوں کی الماریوں کے گرد منڈلاتی رہی، پھر کمپیوٹر کی طرف بڑھ گئی۔ کمپیوٹر آن کر کے وہ چیئر پر آ بیٹھی، ماؤس کو ہینڈل کرنے لگی۔ آج سے پہلے اُس نے کمپیوٹر کو محض دیکھا تھا، کبھی اسے آپریٹ نہیں کیا تھا نا! سے وہ ایک دلچسپ سی چیز لگی اور وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''محترمہ یہ کھلونا کمپیوٹر نہیں اور نہ ہی یہاں کمپیوٹر گیمز کھیلنے کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس میں میرے انتہائی اہم پروگرامز ہیں یقیناً گڑبڑ ہو گئی ہو گی۔'' ماہ نور کے لیے آواز والے کی سمت دیکھنا مشکل ہو گیا۔

''اور یوں بھی بغیر اجازت کسی کے کمرے میں داخل ہونا بھی غیر اخلاقی حرکت ہے۔''

''سوری۔'' اُس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہہ کر کرسی سے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔

''جسٹ اے منٹ پلیز... اگر آپ کیوریس ہیں کمپیوٹر لرننگ کے لیے تو شام کو میں گھر پر ہی ہوتا ہوں اُس وقت آپ کو سکھا دیا کروں گا۔ اُس سے پہلے براہ کرم اس کو مت چھیڑیئے گا۔ بہت سے پروگرامز ڈیلیٹ ہو جاتے ہیں اس طرح۔ البتہ بکس لے کر پڑھ سکتی ہیں۔'' اس کے شرمندہ شرمندہ سے چہرے کو دیکھ کر جیسے شہسوار کو ترس آ گیا تھا۔ بے اختیار ہی لہجے میں نرمی در آئی تھی۔ ماہ نور نے بھی موقع غنیمت جانتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی۔ بعد کا وقت پھر وہ مسز ملک کے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ ٹھیک نو بجے ان کو دوائی دینے کے بعد انہیں خدا حافظ کہہ کر جس وقت وہ کوٹھی سے باہر آ رہی تھی، شہسوار لاؤنج میں بیٹھا غالباً اپنی یونیورسٹی کے کسی کام میں مگن تھا۔

"او کے مس شاہو گڑھی...... کہیں تو میں ڈراپ کر دوں؟"

"نہیں سر...... تھینک یو...... شرفو چاچا مجھے چھوڑ آئیں گے۔" اور حسب معمول وہ کندھے اُچکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ماہ نور جب پورچ کی طرف آئی تو شرفو پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا مستعدی سے اس کے لیے پچھلا دروازہ کھولا اور جب وہ بیٹھ گئی تو خود بھی بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ گلی کی شروعات پر اُسے اتارنے کی بجائے شرفو چاچا خود بھی اس کے ساتھ اُتر گئے۔

"بی بی ...... میں گھر تک آپ کے ساتھ چلوں؟"

"نہیں چاچا میں چلی جاؤں گی۔" ماہ نور جانتی تھی کہ شرفو چاچا صبح والی بات سے کھٹک گئے تھے۔

"جیسے آپ کی مرضی......" وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور ماہ نور گلی کا موڑ مڑ گئی۔ اندھیرے کے باوجود اُس نے چاچے ساجے کی بند دکان کے تھڑے پر غیاث کو بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ وہ اس محلے کے لوفر لفنگوں کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی۔ اُسے تیز قدموں سے چلتا دیکھ کر غیاث سُرعت سے اُٹھ کر اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ ماہ نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کو اتنی جرأت ہوئی ہو۔ رات کی تاریکی اور گلی کی ویران نے اُسے حوصلہ بخش دیا۔ اُس نے دونوں بازو پھیلا کر اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ ماہ نور نے تیز نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ ہمیشہ سے اس کی سرخ آنکھوں کی تپش اس کو خوفزدہ کر دیتی تھیں لیکن آج اس کی آنکھوں میں کچھ اور ہی تاثرات تھے۔ ماہ نور کو اپنے پورے وجود میں لرزش سی محسوس ہوئی۔

"میرا راستہ چھوڑو۔" خفیف سی سرگوشی اُبھری تھی اور جیسے غیاث کو بھی ہوش آ گیا۔ وہ یک لخت یوں پرے ہٹا جیسے اُس نے سینکڑوں بچھو ایک ساتھ دیکھ لیے ہوں۔ اس کے ایک طرف ہٹتے ہی ماہ نور تیزی سے اپنے گھر کی جانب بڑھی۔ دروازہ بند تھا۔ اُس نے دستک دیتے ہوئے دوبارہ پلٹ کر دیکھا۔ غیاث کی سرخ لو دیتی نگاہیں اب بھی اس کے تعاقب میں تھیں۔ تیسری دستک پر دروازہ کھلا۔ گڈو تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے سب لوگ......؟ کتنی دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں۔" ماہ نور کو کوفت تو غیاث پر تھی لیکن بے چارہ گڈو ہدف بن گیا۔

"کہیں نہیں آپی دراصل سب ڈرامے پر تبصرے میں مصروف تھے۔ سو دستک کی آواز سنائی نہیں دی۔" گڈو صفائیاں پیش کرنے لگا۔ ماہ نور اندر کمرے میں چلی آئی۔ سب ابھی نیچے چٹائی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ رات کا کھانا سب نیچے بیٹھ کر کھاتے تھے۔ برتن ایک طرف رکھے ہوئے تھے اور زور و شور سے شاہین اور راہین کے مابین ڈرامے پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ ماہ نور کو

دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ایک لمحے کو ماحول پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ماہ نور نے سب کو مشترکہ سلام کرنے کے بعد چادر اتار کر ایک طرف رکھی اور خود چارپائی پر دراز ہو گئی۔

"کیا بات ہے بیٹا......؟ تھک گئی ہو؟"

"نہیں اماں بس یونہی۔ اچھے گھر کی دیکھیں بات ہی کچھ اور ہے۔ وہاں ہر چیز میری دسترس میں ہونے کے باوجود مجھے ایک عجیب سی غیریت اور اجنبیت کا احساس ہوتا رہا۔"

"یہ تو ہے۔ اپنی جھونپڑی بھی پرائے محل سے بھلی۔" اماں نے گویا اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اماں کیا بتاؤں ان کی جو نوکرانی آئی ہے ناں اتنے دنوں سے وہ مسز ملک کو باسی تباسی کھانا دیتی رہی اور دس دن سے یعنی جب سے وہ بیمار ہیں تب سے بھوکی ہی ہیں بہت کم کھانا کھاتی رہیں۔ آج پھر میں نے اپنے ہاتھ سے تینوں وقت ان کے لیے کھانا بنایا اور انہوں نے شوق سے کھایا۔"

"یہ نوکر اسی طرح کرتے ہیں بیٹا۔ کوئی نگرانی کرنے والا نہیں ہو گا ناں اسی لیے کام چوری کرتی رہی ہے۔"

"اماں ویسے اتنے امیر لوگ اور وہ خاتون اتنی کسمپرسی کی حالت میں...... دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔"

"بس بیٹا سب نصیبوں کے پھیر ہیں۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ کھانا وانا کھا لیا ہے یا کھانا ہے۔"

"نہیں اماں...... کھانا میں نے کھا لیا تھا۔ ویسے پکا کیا ہے۔"

"آج شاہین کا دل چاہ رہا تھا کابلی کباب بنانے کو۔ سو بازار سے نان منگوا لیے اور کباب شاہین نے گھر پر تیار کر لیے تھے۔"

"چلیں پھر کباب ٹیسٹ کروا دیں۔" ماہ نور چارپائی پر پاؤں پسار کر لیٹ گئی تھی۔ شاہین پلیٹ میں کباب لینے کے لیے چلی گئی اور وہ اماں کو سارے دن کی روداد سنانے لگی۔

☆.........☆.........☆

اس کے گھر کی واحد بتی جل رہی تھی۔ چوپٹ کھلا دروازہ بتا رہا تھا کہ مکین گھر سے کس حد تک لاپرواہ ہے۔ خالہ کلثوم نے گھر کے اندر جھانک کر دیکھا۔ ہمسائے کی لڑکی شبو صحن میں کوڑا پھینکنے آئی ہوئی تھی۔

"اری شبو تجھے کوڑا پھینکنے کو یہی جگہ ملی ہے۔" خالہ فہمائشی انداز میں اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

"تو خالہ محلے بھر کے لوگ یہیں تو پھینکتے ہیں کوڑا۔ میں نے پھینک دیا تو کیا برائی کی؟" شبو نے بھی دوبدو جواب دیا۔

"اری بے وقوف...... کبھی کسی اور کے صحن میں بھی جا کر کوڑا پھینکا ہے تو نے؟ گھر تو صاف ستھرے رکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔"

''خالہ جب وہ ہمیں منع نہیں کرتا تو تمہیں کاہے کی مصیبت۔''

''اری چل جا بد تہذیب کہیں کی...... یہاں تو نصیحت کا بھی برا مانا جاتا ہے۔'' خالہ صحن سے ہو کر کمرے کے اندر داخل ہو گئیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن پنکھے کی گھرر گھرر کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کمرے کے اندر کوئی موجود ہے۔ خالہ نے دیوار پر سوئچ بورڈ ٹٹول کر لائٹ آن کی۔ وہ سامنے ہی چارپائی پر جت لیٹا ہوا تھا۔ روشنی ہوتے ہی اُس نے آنکھوں پر یوں ہاتھ رکھ لیے جیسے وہ محض اندھیرا شناس ہی رہنا چاہتا ہے۔

''خالہ بتی نہ جلائیں...... روشنی آنکھوں کو اچھی نہیں لگتی۔''

''میں پوچھتی ہوں یہ کوئی طریقہ ہے۔ محلے بھر کے لوگ تمہارے گھر کو ڈسٹ بن سمجھ کر کوڑا پھینکتے رہتے ہیں اور تم منع بھی نہیں کرتے۔ کس قدر خیال رکھا کرتی تھی تمہاری ماں گھر کا ایک ایک چیز کو...!''

''خالہ......'' اس کی آنکھوں میں اضطراب اُمڈ آیا تھا۔

''جانتی ہوں ناپسند ہے تجھے یہ موضوع...... لیکن بیٹا وہ بے گناہ ہے۔ تمہیں یقین کیوں نہیں؟'' خالہ کی بات سننے کی بجائے اُس نے ایک دم چارپائی سے اُٹھ کر پاؤں میں سلیپر اُڑسے اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ خالہ کلثوم جانتی تھیں کہ اب وہ کہاں جائے گا۔ گھر سے نکل کر اس کا واحد ٹھکانہ وہ بے آباد سا پارک تھا جو کب کا متروک ہو چکا تھا۔ اس پارک کے کسی گوشے میں بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پیئے گا اور خود کو جلائے گا۔ خالہ پر جیسے یکدم ایک انجانی سی کیفیت آ کر گزر گئی۔ انہوں نے مردنی سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اُس تصویر پر نگاہیں گاڑ دیں۔

''اری مُنی...... ارے پپو کیوں لڑ رہے ہو آپس میں۔'' فرش پر دائپر چلاتی ہوئی رابعہ بچوں سے مخاطب ہوئیں۔ کلثوم نے دیوار پر سے جھانک کر دیکھا۔

''رابی...... کیا پکایا ہے آج؟''

''مٹر قیمہ۔'' مختصر جواب دے کر وہ پھر اپنے کام میں جت گئی۔

''اماں کہہ رہی ہیں تھوڑا سا سالن دے دو۔ کدو پکائے تھے اماں کو پسند نہیں۔''

''اچھا۔'' انہوں نے کچن میں آ کر ایک کٹوری میں سالن اور ایک میں دہی ڈال اور لا کر اُسے پکڑا دیا۔

''شکریہ۔'' یہ کہہ کر وہ دیوار پر سے اُتر گئی۔

''ظومی، پپو جلدی سے اپنے اپنے بیگ لے کر آ جاؤ۔ صرف ایک گھنٹہ ہے میرے پاس۔ تمہیں ہوم ورک کروا دوں۔'' رابعہ دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتی کمرے میں چلی آئی۔ ظومی ایک طرف چڑیوں کے پنجرے کے پاس بیٹھا بغور ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پپو نے جب دیکھا کہ اُس نے اماں

کی بات نہیں سنی تو جاتے جاتے اس کا شانہ ہلایا۔

''بھیا...... ماما بلا رہی ہیں کہ آ کر ہوم ورک کر لو۔'' ظومی نے ایک نظر بغور چڑیوں کو دیکھا اور کمرے کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز پر اُس نے پلٹ کر گلی والا دروازہ دیکھا اور کھولنے چلا گیا۔ کوئی بھاری بھرکم قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔ دروازے کی بدحواس دھڑ دھڑاہٹ سے کلثوم نے پریشان ہو کر دیوار کے پار جھانکا تھا۔ اُسے اور تو کچھ علم نہ ہوا۔ البتہ اُس نے اپنی آنکھوں سے رابعہ کی پٹائی ہوتے دیکھی۔ بچے ایک کونے میں دُبکے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ماں کو کس قصور کی پاداش میں سزا ملی ہے۔

کھڑ کھڑ کی آواز سے پھر کچھ گرا تھا۔ خالہ کلثوم نے چونک کر کمرے کے کھلے دروازے سے باہر دیکھا۔ پڑوس کی ہائی رقیہ نے صحن میں کوڑا پھینکا تھا۔

''ارے چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں بڑے میاں سبحان اللہ۔ چھوٹوں کو کیا سمجھائیں؟ جب آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔'' خالہ بولتی بولتی صحن کے درمیان پہنچ گئی تھیں۔

''اری خالہ پورے محلے کو پرواہ نہیں اور تم پتہ نہیں کیوں اس لڑکے کے غم میں دُبلی ہوتی رہتی ہو۔''

''اس لیے کہ محلے والے وہ نہیں جانتے جو میں جانتی ہوں۔'' یہ خالہ نے اُس سے نہیں خود سے کہا تھا اور پھر بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکلیں اور دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر اپنے گھر کی طرف چل دیں۔

''کہاں جا رہی ہیں خالہ؟'' سامنے سے آتے ارشد نے انہیں دیکھ کر سلام دعا کی۔

''بس بیٹا گھر جا رہی ہوں۔'' مختصر سا جواب دے کر خالہ اپنے گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔ خالہ کلثوم بھی اُس کی طرح یک و تنہا تھیں۔ ساری زندگی بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرتے گزار دی تھی۔ بیمار ماں کی خاطر شادی بھی نہ کی۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر انہوں نے برقع اتار کر ایک طرف رکھا اور خود چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

''نصیب کیا ہوتے ہیں؟ اور اوپر والا کس کے بھاگ کیسے لکھ دے کون جانے؟ کہنے کو تو امیر زادے سے بیاہی تھی ماں باپ نے، پر چند ہی سالوں میں قلاش ہو کر رہ گیا۔ بھلا کمی کیا تھی رابعہ میں خوبصورت، خوب سیرت، پڑھی لکھی، سلیقہ شعار لیکن شاید مقدر کی ماری تھی کہ میاں نے کبھی قدر ہی نہیں کی۔ کیا کچھ نہ ہوا تھا اس کے ساتھ' سہتی رہی بے چاری لیکن آخری بار جو زیادتی رابعہ کے ساتھ ہوئی اس کے بعد اس قلاش کے ہاں رہنے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ مجھ سے پوچھتا کیوں نہیں اپنی ماں کے بارے میں؟ کیوں ہر بار میری زبان روک دیتا ہے۔ اس کی بے گناہی کی گواہی کیوں نہیں لینا چاہتا۔ کیا اسے اپنی ماں، اپنی بہن، اپنے بھائی کبھی یاد نہ آئے ہوں گے۔'' ہمیشہ

کی طرح خالہ کلثوم اس کے رویے سے دلبرداشتہ سی بس اپنی سوچوں میں ہی اُس سے شکوہ کناں تھیں۔ اگر وہ ایک بار اصل حقیقت جان لیتا تو شاید پچھلے پندرہ سال سے اس کے دل میں پنپتی نفرت دم توڑ دیتی اور خالہ کلثوم بھی اپنی اور کسی کی نظروں میں سرخرو ہو جاتیں۔

☆..........☆..........☆

وہ اس وقت آفس میں بیٹھے ہوئے تھے جب فون کی بیل بجی انہوں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کیا۔

''س...... سر...... وہ...... وہ آنٹی۔'' بات ماہ نور کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ دوسری طرف ریسیور تھامے ملک معظم پر جانے کتنے ہی کڑے امتحان گزر گئے۔

''کک...... کیا ہوا ماما کو...... کیا ہوا؟''

''کچھ پتہ نہیں سر...... یکدم ان کی طبیعت بہت بگڑ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا انہیں کیا ہوا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تو میں نے آپ کو فون کر دیا۔''

''اوکے میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر پہنچتا ہوں۔'' انہوں نے عجلت میں کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور تیزی سے آفس سے نکلتے چلے گئے۔ موبائل پر ڈاکٹر آصف کو تیار رہنے کا کہہ کر انہوں نے جلدی سے پارکنگ سے گاڑی نکال کر روڈ پر ڈال دی۔

''ماما آپ کو کچھ بھی نہیں ہوگا...... آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔ ماما آپ کے سوا کیا ہے ہمارا...... ہم تو پہلے سے اُجڑے دامن والے لوگ ہیں۔ ماما خدا کے لیے جلدی میں کوئی ایسا فیصلہ نہ کر لیجیے گا کہ ہمارا شیرازہ ہی بکھر جائے۔'' ملک معظم سوچ کے پردے پر اپنی ہنستی مسکراتی ماں سے مخاطب تھے۔ وہ ماں جسے انہوں نے کسی قیمتی متاع کی طرح دل سے لگا کر رکھا تھا۔ آج جانے وہ کس حال میں تھیں۔ ہسپتال کے گیٹ پر ڈاکٹر آصف انہیں اپنے منتظر ملے۔

''معظم...... کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے ناں؟'' ڈاکٹر آصف فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی بولے۔

''دعا کرو آصف خیریت ہو۔'' نم آلود آواز میں کہہ کر ملک معظم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دل تھا کہ انجانے وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کوٹھی کا مین گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن پورچ میں اس وقت کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔

''کہیں ماما کو کسی ہسپتال تو نہیں لے گئے؟'' ذہن میں سوال اُبھرا تو گاڑی انہوں نے گیٹ سے باہر ہی روک دی اور خود تقریباً بھاگتے ہوئے درمیانی روش عبور کر کے کوریڈور میں داخل ہو گئے۔ سارا گھر سناٹے میں گھرا ہوا تھا۔ صرف کچن سے کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کچن کی طرف تیزی سے بڑھے لیکن دروازے پر ہی ٹھٹک کر رُک گئے۔ کچن میں ماہ نور جانے کیا پکانے میں مصروف تھی۔

''ماہ نور! ماما...... کہاں ہیں ماما؟'' ان کی آواز بھی سناٹوں میں گھری ہوئی تھی۔

''آنٹی سو رہی ہیں...... ٹھیک ہیں وہ اس وقت۔'' ماہ نور کی آواز میں قدرے ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ ملک معظم ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔ پھر جیسے یکدم انہیں کچھ یاد آیا تو تیزی سے پلٹ گئے۔ کچھ دیر بعد ماہ نور نے انہیں کسی سوٹڈ بوٹڈ شخص کے ہمراہ مسز ملک کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ماہ نور بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ شخص اب مسز ملک کو اسٹیتھی سکوپ سے چیک کر رہا تھا۔

''شی از پرفیکٹلی آل رائٹ ناؤ...... مس کیا آپ ان کی اٹینڈنٹ ہیں؟''

''جی ہاں......''

''کیا ہوا تھا انہیں......؟''

''آنٹی میرے ساتھ بالکل نارمل انداز میں بات چیت کر رہی تھیں۔ یکدم ان کے سر میں شدید درد اٹھا چہرے کی رنگت سرخ پڑ گئی۔ آنکھوں سے یوں لگتا تھا جیسے خون چھلک اُٹھے گا۔ کچھ دیر اس کیفیت میں رہنے کے بعد بے ہوش ہو گئیں۔''

''ہوں...... انہیں کیا ٹریٹمنٹ دی ہے آپ نے؟''

''سر ان کی کوئی میڈیسن تھی جو خالہ زیتون نے ڈراپس کی صورت میں دی تھی۔ اس کے بعد یہ نارمل ہو گئیں اور اب سوئی ہوئی ہیں۔''

''مسٹر معظم! انہیں کھانے پینے میں کچھ ایسا دیا گیا ہے جس کے باعث بلڈ پریشر انتہا کو پہنچ گیا۔ مس ماہ نور! معظم کی ماما انتہائی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں اور انہیں فالج کا اٹیک بھی اسی باعث ہوا ہے۔ ان کی خوراک کا سیٹ اپ کس کے پاس ہے؟''

''سر دو دن پہلے تک تو خالہ زیتون ہی ان کے لیے کھانا بناتی تھیں لیکن مجھے ان کا طریقہ پسند نہیں آیا۔ سو اب ان کا کھانا میں تیار کرتی ہوں۔''

''آج مینو میں ان کے لیے کیا تھا؟''

''سر صبح ناشتے میں آنٹی کی خواہش کے مطابق ایک اُبلا انڈا، ایک گلاس دودھ اور دو سلائس ڈبل روٹی بمعہ مکھن۔ اور دن میں ان کے لیے بوائلڈ رائس ہاف فرائی چکن کے ساتھ۔''

''ہوں...... معظم! انڈا، مکھن، فرائی چکن۔ خود دیکھ لو آنٹی کی بے احتیاطیاں' میں نے چکنائی اور گرم چیزوں سے سختی پرہیز کہی ہے۔ آنٹی اتنی بداحتیاطی پر اُتر آئی ہیں تو پھر انہیں بیمار تو پڑنا ہی تھا۔ بہرحال میں یہ کچھ میڈیسن لکھ کے دے رہا ہوں فوری طور پر دینا شروع کر دیں۔'' ڈاکٹر آصف نے نسخہ لکھ کر ملک معظم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کچھ دیر تک تو ڈاکٹر آصف اور ملک معظم کے درمیان گفت و شنید رہی پھر وہ دونوں ہی کمرے سے باہر چلے گئے۔

ماہ نور مسز ملک کے بیڈ کے دائیں جانب رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں ملک معظم اُس پر ناراض نہ ہوں۔ اُس نے تو مسز ملک کے لیے جو بہتر سمجھا کیا اب اُسے کیا خبر کہ وہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ بہرحال اگر انہوں نے ڈانٹا تو وہ بھی بتا دے گی کہ اصل بات کیا ہے۔ وہ صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کھٹکے پر سر اُٹھا کر دیکھا۔ دروازے پر ملک معظم کھڑے اسی کی سمت دیکھ رہے تھے۔

''مس ماہ نور کیا خالہ زیتون نے آپ کو ماما کے لیے مینو سمجھایا نہیں؟'' انداز حسبِ معمول سخت اور لہجہ نرم تھا۔

''سر انہوں نے مجھے کچھ خاص نہیں بتایا۔ اگر میں نے آنٹی کے لیے کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی تو صرف اور صرف اس لیے کہ وہ بیمار ہیں اور خالہ زیتون انہیں دو دو دن کا باسی کھانا دیتی رہیں جس کے باعث وہ کچھ کھاتی پیتی نہیں تھیں۔ انہیں صاف ستھری اور تازہ غذا کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں ان کے لیے کھانا تیار کرنے لگی لیکن مجھے یہ کسی نے نہیں بتایا کہ آنٹی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔''

''اسے میں اپنی غلطی تسلیم کروں گا اور خالہ زیتون سے بھی باز پُرس کر لیتا ہوں کہ اُن کو گھر کا سارا ذمہ دینے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا جو دل چاہے کرتی پھریں۔ بہرحال اب تو آپ کو علم ہو ہی گیا ہے۔ آپ پلیز اب ان کا دھیان رکھیئے گا۔'' ملک معظم نے ماہ نور سے کہا۔

''سر میری بھرپور کوشش ہوگی کہ آپ کو شکایت نہ ہو، یہ بھی جو کچھ ہوا انجانے میں ہوا۔ آپ ڈاکٹر کا پریسکرائب کیا ہوا غذائی چارٹ مجھے دے دیں۔ میں آنٹی کا کھانا اُسی کے مطابق تیار کر لیا کروں گی۔''

''او کے میں اب چلتا ہوں۔ آفس میں ضروری اپوائنٹ منٹس نہ ہوتیں تو ماما کے جاگنے تک رُک جاتا۔ بہرحال ماما کے جاگنے کے بعد سوائے جوس کے انہیں کچھ مت دیجیئے گا۔''

''سر جی وہ چوہدری الیاس آئے بیٹھے ہیں۔'' ان کے کمرے سے نکلنے سے پہلے ہی حمدو نے آ کر اطلاع دی۔

''اس وقت...... وہ یہاں کیا کرنے آ گئے؟'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ چوہدری الیاس ڈرائینگ روم کے دروازے کے بالکل سامنے والے صوفے پر براجمان تھا۔ ملک معظم کو دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آؤ جی...... آؤ جی کب سے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ وڈیری کی سنا ہے نصیب دشمناں طبیعت ناساز ہے۔'' چوہدری، ملک معظم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''بس چوہدری صاحب کیا کہیں بیماری تو جان سے ہی جیسے چپک گئی ہے۔ خیر آپ بیٹھیں۔'' ملک معظم چوہدری کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''کیسے آنا ہوا؟ بلکہ ٹھہریں پہلے یہ بتائیں کہ کیا چلے گا چائے یا ٹھنڈا؟''

''اوہو تکلفات کو چھوڑ دیں۔''

''نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ آپ پلیز بتائیں۔''

''چلیں ٹھنڈا ہی پلا دیں۔'' چوہدری کا جواب سن کر ملک معظم نے حمدو کو آواز دے کر کولڈ ڈرنک لانے کو کہا اور پھر چوہدری الیاس کی جانب متوجہ ہوئے۔

''جی۔''

''دراصل میں بات یہ ہے کہ اس بار آپ کی کمپنی کا ٹینڈر میں خریدنا چاہتا ہوں جبکہ دوسری طرف میرا حریف اسی کوشش میں ہے۔ سنا ہے وہ دس لاکھ میں یہ ٹینڈر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کے آپ کو پندرہ لاکھ دینے کو تیار ہوں لیکن یہ ٹینڈر ہر حال میں مجھے ملنا چاہیے۔'' ملک معظم نہایت توجہ اور تحمل سے اس کی بات سن رہے تھے۔

''لیکن چوہدری صاحب آفس کی باتیں اور ڈیلنگز میں آفس تک ہی محدود رکھنا پسند کرتا ہوں۔ بہرحال اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو کل آفس تشریف لے آئیں، دیکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں اللہ بیلی۔'' چوہدری الیاس جانے کے لیے کھڑا ہو تو ملک معظم اس کے ساتھ ہی باہر کی سمت چلے آئے۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے پورچ کی طرف آئے۔ چوہدری الیاس اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ بیرونی گیٹ کھلا اور گرے کرولا اندر داخل ہوئی۔ چوہدری رک گیا۔ گاڑی کے اندر سے شہسوار کو برآمد ہوتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رُک گیا۔

''یہ......'' چوہدری نے استفہامیہ نظروں سے شہسوار کی طرف دیکھا۔

''میرا چھوٹا بھائی ہے ملک شہسوار۔'' ملک معظم نے جواب دیا۔

چوہدری کی کینہ توز نظروں نے شہسوار کو اُس وقت تک حصار میں لیے رکھا جب تک وہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل نہیں ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اُتر آئی تھی جو ملک معظم کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکلی تھیں۔

چوہدری کے ہاتھ میں موبائل تھا اور اس کی انگلیاں کچھ نمبروں کے بٹن پش کر رہی تھیں اور وہ نمبر بلیک مین کا تھا۔ چوہدری کے ہاتھ میں اب تُرپ کا پتہ تھا اور وہ انتہائی شاطرانہ انداز میں اس پتے کو کھیلنا چاہتا تھا۔

☆..........☆..........☆

حویلی کے پھاٹک پر ہارن بجاتی گاڑی کو دیکھ کر چوکیدار نے نہایت تیزی اور مستعدی سے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر آ گئی۔ بلیک مین اپنی شخصیت کی تمام تر پراسراریت سمیت گاڑی سے برآمد ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مردان خانے کی طرف جانے لگا۔ مردان خانے کے دروازے پر کھڑے دو سکیورٹی گارڈ پہلے تو حیرت سے اس کے پُراعتماد انداز کو دیکھ رہے تھے۔ پھر جب وہ بالکل ان کے قریب پہنچ گیا تو یکدم جیسے وہ ہوش میں آ گئے۔ انہوں نے جلدی سے اس کا راستہ روکا۔ بلیک مین نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

''کون ہو تم؟'' ایک سکیورٹی گارڈ نے پوچھا۔

''میں کون ہوں یہ بتانا ضروری نہیں البتہ تم نے مزید کوئی لیت ولعل کی تو پھر تم کون ہو یہ تم خود بھی نہیں پہچان سکو گے۔'' بلیک مین کے لہجے میں برفانی ٹھنڈک اُتر آئی۔ سکیورٹی گارڈ نے عجیب سے انداز میں اُسے دیکھا۔

''اپنا نام بتاؤ... اور کس سے ملنا ہے؟ جب تک تم اپنا تعارف نہیں کرواؤ گے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔'' سکیورٹی گارڈ کے غیر متوقع جواب نے بلیک مین کو سیخ پا کر کے رکھ دیا۔ اُس نے دزدیدہ نگاہوں سے دونوں گارڈز کا جائزہ لیا۔ وہ جان اور صحت میں اُس سے دوگنے لگ رہے تھے لیکن بلیک مین نے مشتعل ہو کر جب دونوں کی گردنوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیا تو ایک پل کو ان دونوں نے پریشان کن حیرت سے اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھا جو جثہ و جسم میں کسی طور پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن جس کے فولادی شکنجے میں ان کی گردنیں یوں پھنسی ہوئی تھیں کہ کسی بھی لمحے گردن کی ہڈی ٹوٹ کر بلیک مین کے ہاتھوں کی زینت بن جاتی تھی۔ بلیک مین دونوں کو دھکیلتا ہوا وسیع و عریض لاؤنج کے اندر داخل ہو گیا۔ ان کی گردنیں بدستور اس کے ہاتھوں میں تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھے چوہدری الیاس، حماد اور چوہدری الیاس کے چچا زاد پیرو استاد نے یکدم چونک کر دیکھا تھا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔ بلیک مین نے ایک جھٹکے کے ساتھ ان کی گردنیں آزاد کر دیں۔ ان دونوں کے وجود جھنجھنا کر رہ گئے تھے۔ دماغ کی سن ہوتی کیفیت کے ساتھ وہ دونوں جیسے انگشت بدنداں اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''او۔ یا الیاس ایہہ کی ہو رہیا اے۔'' پیرو استاد نے چوہدری سے پوچھا جو خاموش نگاہوں سے بلیک مین کو دیکھ رہا تھا۔ گویا منتظر تھا کہ یہ عقدہ بلیک مین اپنی زبان سے ہی کھولے۔ لاؤنج میں ایک جامد چپ کا راج تھا اور اس چپ کو تاراج بلیک مین کی بھاری بھرکم آواز نے کیا۔

''چوہدری صاحب! کتا وفادار تو ہوتا ہی ہے لیکن وہ صرف مالک کو نہیں مالک کے وفاداروں کو بھی پہچانتا ہے۔ آپ کے ہاں کے کتے بلاوجہ بھونکنے لگے ہیں۔''

''کیا ہو گیا بلیک مین! یہاں آؤ میرے پاس..... بیٹھو یہاں۔'' چوہدری الیاس معاملے کو سمجھے بنا ہی مفاہمت آمیز لہجے میں بولا۔

''آپ کے یہ سکیورٹی گارڈز شاید ابھی پوری طرح آپ کی حویلی کے اصول نہیں سمجھ پائے۔ انہیں ذرا اپنی زبان میں سمجھا دیں کہ بلیک مین کے سامنے کوئی دروازہ، کوئی دیوار حائل نہیں ہو سکتی۔'' وہ بدستور سرد لہجے میں بول رہا تھا۔ چوہدری کو بھی اس کا لہجہ اور انداز بُری طرح کھل رہا تھا لیکن وہ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سو اس کے ساتھ وہ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بلیک مین تلخ نگاہی سے اس کی طرف دیکھتا ہوا ایک جانب صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اوہو۔ اچھا اچھا سمجھا دوں گا سمجھا دوں گا۔ تم یہ تو بتاؤ ہمارا کام کہاں تک پہنچا؟''

''خاک ہو رہا ہے ہمارا کام وہ ملک شہسوار پورے کالج میں اس طرح ہے جیسے میٹھی کھیر ووٹر مکھیوں کی طرح بس اسی کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ بابا آپ کے آدمی کسی کام کے نہیں۔'' حماد کنکھیوں سے بلیک مین کو دیکھتے ہوئے بظاہر چوہدری الیاس سے مخاطب تھا لیکن انداز ایسا تھا۔ جیسے بلیک مین کو باور کرانا چاہتا ہو کہ اُسے بلیک مین کی کارکردگی پر کوئی بھروسہ نہیں۔

''برخوردار تم ابھی بچے ہو۔ زندگی کے اسرار و رموز کیا ہیں نہیں جانتے۔ جس کا کام ہوتا ہے اُسے بخوبی علم ہوتا ہے کہ اس کام کو کس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ تمہیں اگر میری کارکردگی پر اعتماد نہیں تو کسی اور کی خدمات حاصل کر لو۔ میں برا نہیں مانوں گا۔'' بلیک مین کو حماد کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ سو اس نے کھلم کھلا اس بات کا اظہار بھی کر دیا۔

حماد کے چہرے سے اس کے اندر کی کھولن کا اندازہ ہو رہا تھا لیکن چوہدری نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''چھوڑو بلیک مین! بچہ ہے نا سمجھ ہے نہیں جانتا کہ کب اور کیسے کیا ہوتا ہے۔ تم اپنا کام جس طرح سے کر رہے ہو پورا کرو۔ ہماری طرف سے تمہیں کھلی چھوٹ ہے۔ ہمیں بس یہ اطمینان چاہیے کہ ہمارا بیٹا اس بار کالج یونین کا صدر ضرور بنے گا۔'' چوہدری جان سکتا تھا کہ اس وقت حماد کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اسے حماد کی جولانی طبع اور غصیلی طبیعت کا اچھی طرح اندازہ تھا لیکن یہ وقت بگاڑ پیدا کرنے کا نہیں تھا۔ مصالحت سے کام لینے کا تھا۔ سو اس وقت اس نے اپنے بیٹے کو لیٹ ڈاؤن کر کے بلیک مین کی باتوں کو اور اس کی شخصیت کو اہمیت دی تھی۔

''چوہدری صاحب آپ کو اطمینان دلا سکتا ہوں کہ اس بار صدر کی سیٹ حماد کے حصے میں آئے گی اور میں کیا کر رہا ہوں ؟ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اپنا طریقہ کار کسی کو بتانے سے گریز کرتا ہوں اسے میری عادت سمجھیں یا احتیاط۔ بہر حال میں اب چلتا

ہوں جلد ہی دوبارہ چکر لگاؤں گا۔'' بلیک مین صوفے پر سے اٹھتے ہوئے بولا تو چوہدری بھی اس کو الوداع کہنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے چوہدری نے ایک بار پھر حماد کے رویے کی معذرت چاہی۔ بلیک مین نے دھیرے سے سرہلایا اور تیز تیز ڈگ بھرتا کوریڈور سے نکلتا چلا گیا۔

''بابا آخر اس شخص میں ایسا کیا ہے جو آپ اس کے سامنے یوں نظریں نیچی رکھ کر بات کرتے ہیں۔ ایسے ہزاروں کتے آپ کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔'' حماد کو آخر اپنے اندر کا زہر اگلنے کا موقع مل ہی گیا۔

''یہی تو تمہاری غلطی ہے حماد ... جو تمہیں ڈبونے چلی تھی۔ کالج میں تمہاری ریپوٹیشن کیا ہے' وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ میں نے اسی لیے بلیک مین کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ وہ ناممکن کو ممکن بنانا جانتا ہے۔ وہ ان کتوں میں سے نہیں ہے جو میرے آگے پیچھے دُم ہلاتے پھرتے ہیں۔ وہ شیر ہے جسے سدھا کر بہلا کر میں نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور تم شاید یہ نہیں جانتے کہ غصے کی انتہائی کیفیت میں شیر اپنے مالک کو بھی چیرنے سے باز نہیں رہتا۔ اسی لیے تمہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا کہ تمہارے اس طرح زبان چلانے سے اس کی صحت پر تو کوئی اثر نہ پڑتا لیکن ہماری مٹی پلید ہو جاتی۔'' چوہدری نرم لہجے میں اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ حماد کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے گویا اُسے باپ کا بلیک مین کے سامنے یوں بھیگی بلی بن جانا بہت بُرا لگا ہو لیکن اس بار وہ کچھ بولا نہیں تھا۔ بس جھلائے ہوئے انداز میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا

''پاء... کوئی گل سمجھ اچ نئیں آئی اے.... کیہہ ہو رہیا اے۔'' پیرو استاد جو اتنی دیر سے جانے کیسے خاموش بیٹھا تھا موقع ملتے ہی بول پڑا۔

''بس یار پیرو... ایہہ اولاد بھی کیہو جئے دن وکھاؤندی اے۔ نکے نکے دے لوکاں نال منہ ماریاں کرنیاں پاؤندیاں نے۔''

''کی مطلب؟''

''ایہہ جیہڑا آدمی ہُن آیا سی ناں ... ایس دے کول میری وڈی کمزوری ہے۔ میں اس دے نال دگاڑ نہیں پاؤنڑاں چاہندا۔ پر اے پتر میرا...'' چوہدری الیاس کے لہجے اور انداز میں غیر محسوس سی تھکن تھی۔

''پاء... چنگا کردو تو پتر حماد نوں ملک توں باہر بھیج دیو۔ حماد دے واسطے سوکھا اے تے تالے پتر دا کوئی مستقبل بنڑ جاؤ گا۔''

''ہاں سوچ رہیاواں۔ ایہوای کرنا پاؤ گا۔'' چوہدری کو پیرو استاد کا یہ مشورہ پسند آیا تھا۔ وہ حماد کو اپنے دھندوں اور جھمیلوں سے الگ رکھنا چاہتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب حماد

تعلیم کی غرض سے ملک سے باہر چلا جاتا۔ یقیناً حماد کو بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چوہدری کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔

☆ ...... ☆ ...... ☆

رات کے نو بج رہے تھے جب شرفو ماہ نور کو گلی کے باہر ڈراپ کر کے گیا۔ گلی خلافِ معمول بالکل سنسان تھی۔ یہاں تک کہ آج تو چاچے ساجے کی دکان کا تھڑا بھی ویران تھا۔ ماہ نور کو تنہائی اور اکیلے پن سے وحشت اور خوف محسوس ہوا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتی گھر کے اندر داخل ہوئی گھر پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''اللہ خیر کرے'' بے اختیار ماہ نور کے ہونٹوں نے بے آواز دعا کی۔ سامنے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ماہ نور کمرے میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران سی ہو گئی کہ گھر کے تمام افراد موجود تھے لیکن مثلِ مرگ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''اسلام علیکم ... کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے ناں۔'' ماہ نور ایک ایک کے چہرے کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

اماں ایک طرف رکھی چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھیں۔ آنکھیں ایسی ہو رہی تھیں جیسے کافی دیر روئی رہی ہوں۔ شاہین اور راہین الگ الگ ایک طرف منہ لٹکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ البتہ گڈو اور ماہ جبیں دونوں شاید ابھی ابھی سوئے تھے۔ اس کے سوال کے جواب میں اماں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگ گئیں۔

''شاہین ... راہین تم دونوں ہی کچھ بتاؤ آخر کیا بات ہے؟''

''وہی پرانا مسئلہ ... محلے والے آج پھر آئے تھے۔ مکان چھوڑنے کا کہہ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہمارے یہاں رہنے سے ان کو کیا تکلیف ہے؟'' شاہین کے بتانے پر ماہ نور کا خون کھولنے لگا۔

''یہ لوگ آخر ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ کیوں نہیں سکون سے رہنے دیتے ہمیں؟ ہمارا اپنا گھر ہے۔ ہم اس چھت کو چھوڑ کر دربدر کیسے ہو جائیں؟ کیا یہ لوگ بھی کسی دوسرے کے کہنے پر یوں اپنا گھر بار چھوڑ سکتے ہیں؟ پھر ہم سے ایسی توقع کیوں کرتے ہیں؟''

''ماہ نور بچی ... ہمیں دیس نکالا مل گیا ہے۔ ہمیں یہ گھر ... یہ محلہ ... یہ گلی چھوڑنا ہوگی۔ نہیں تو یہاں کے لوگ لعنت کا جو طوق ہمارے گلے میں ڈالیں گے وہ ہم سب سے برداشت نہیں ہو گا۔ آج تین چار لوگوں نے نازیبا باتیں کیں کل کو پورا محلہ اُٹھ کھڑا ہوگا۔ مارنے والے کا ہاتھ تو روکا جا سکتا ہے۔ بولنے والوں کی زبانیں کون پکڑے گا؟'' اماں کے لہجے میں صدیوں کی تھکان اُتر آئی

تھی۔ آج صحیح معنوں میں علم ہوا تھا کہ بے سائبانی اصل میں ہوتی کیا ہے۔

"لیکن اماں آخر ہم جائیں گے کہاں؟" ماہ نور کو اماں کی منطق سمجھ نہیں آئی تھی۔

"جہاں نصیب لے جائیں۔"

"لیکن اماں یہ تو سخت ناانصافی ہے۔"

"اوپر والا اس ناانصافی کا بدلہ چکا لے گا۔"

"اماں ..... ہمیں ان لوگوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہم کوئی مجرم نہیں جو یوں منہ چھپا کر یہاں سے چلے جائیں۔"

"نہیں بیٹا ہم کمزور ہیں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ جگہ ہی چھوڑ دیں۔" اماں ضرورت سے زیادہ ہی زود حس ہو گئی تھیں۔ ماہ نور کو ان کے فیصلے سے اختلاف تو تھا لیکن اس نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اماں کو اپنی باتوں سے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اماں اماں یاد ہے وہ خط والا آدمی ... جس نے بہت سارے پیسے بھی دیئے تھے۔ اُس نے فلیٹ کی چابی بھی تو دی تھی۔ ہم یہ مکان چھوڑ کر وہاں چلے جاتے ہیں۔" راہین جو اب تک خاموش بیٹھی تھی یکدم کچھ یاد آنے پر قدرے پُرجوش انداز میں بولی۔

"نہیں ہمیں کسی کی دی ہوئی خیرات نہیں چاہیے۔ آج تک اوپر والے پر بھروسہ کیا ہے آئندہ بھی وہی ہمارا مالک ہے۔" ماہ نور نے حتمی انداز میں کہا۔

"اماں آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کل ملک صاحب سے بات کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ کل یا ایک دو روز میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔" ماہ نور نے تسلی آمیز انداز میں کہا لیکن اماں کے فکرمند چہرے پر پڑی پریشانی کی شکنوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ رات تو جیسے سوتے جاگتے کٹ ہی گئی تھی۔ صبح صبح اماں نماز کے لیے اُٹھیں تو سب ہی اُن کے ساتھ اُٹھ بیٹھیں سوائے ماہین اور گڈو کے۔ شاہین اور راہین ابھی کم عمر تھیں لیکن بے وقوف یا ناسمجھ ہرگز نہیں تھیں۔ گھر کی فضا میں گھلی ہوئی پریشانی سے کس طرح نظر چرا سکتی تھیں۔ اماں نے ایک نظر تینوں بہنوں کی طرف دیکھا اور خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔

"آپی اماں بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟" شاہین نے ماہ نور کو مخاطب کیا۔

"شاہین اماں کا پریشان ہونا بجا ہے۔ کسی کے لیے بھی اپنا گھربار چھوڑ کر دربدر ہو جانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر اس گھر سے تو اماں کی کتنی ہی اچھی یادیں وابستہ ہیں۔ ان در و دیوار میں سے ابھی تک ابو جی کی خوشبو چھلکتی ہے۔ اب تک اس گھر کے ایک ایک گوشے سے ان کی ہنسی، ان کی

باتوں کی صدائیں آتی ہیں۔ ایسے میں اماں کے لیے یہ گھر چھوڑنے کا تصور ہی سوہان روح ہے۔" ماہ نور اماں کے احساسات کو سمجھ رہی تھی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ زیادہ عرصے تک محلے والوں کے سامنے ڈٹ کر رہنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان کے مقابلے پر مرد تھے، مرد جو معاشرے کا ایک اہم ستون ہے لیکن جس نے معاشرے پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ وہی اجارہ داری اب ماہ نور اور اس کے خاندان پر مسلط کی جا رہی تھی۔ بات اگر صرف طاقت کی ہوتی تو اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالا جا سکتا تھا لیکن یہاں بات عزت کی آ گئی تھی اور عزت ان کی مجبوری بن گئی تھی۔ جسے بچانے اور قائم رکھنے کی خاطر انہیں فی الحال وہی کرنا تھا جو ان کے محلے کے نام نہاد عزت کے ٹھیکیدار چاہتے تھے۔ اماں نماز پڑھ کر رسوئی کی طرف چلی گئی تھیں۔

ماہ نور نے بھی اپنی تیاری مکمل کر لی تھی۔ راہین، ماہین اور گڈو بھی یونیفارم پہن کر تیار ہو گئے تھے اور اب رسوئی میں بیٹھے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ اماں پہلے کی طرح انتہائی خاموش سی ناشتہ بنانے اور کروانے میں مصروف تھیں۔ ماہ نور کو ان کا اُداس اُداس چہرہ دیکھ کر بیک وقت دکھ بھی ہو رہا تھا اور پیار بھی آ رہا تھا۔

"اماں پلیز ایسے پریشان نہ ہوں۔ اللہ کرے گا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔" اماں کے گلے میں بازو ڈالے وہ انہیں بہلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اماں نے تو جیسے اس بات کو دل سے ہی لگا لیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی نمی کم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

ماہ نور نے ان کی آنکھوں سے آنسو پونچھے، آگے ہو کر ان کے گال پر پیار کیا۔ دروازے پر آٹھ بجے والی مخصوص دستک اُبھری۔ شرفو چاچا اُسے لینے آ پہنچے تھے۔

"اچھا اماں میں چلتی ہوں پریشان نہ ہویئے گا۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئی متبادل انتظام ہو جائے گا۔"

"نور بیٹا ناشتہ تو کرتی جاؤ۔" اماں نے اُسے پیچھے سے آواز دی۔

"نہیں اماں دیر ہو جائے گی۔ میں چلتی ہوں۔" ماں کو جواب دے کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی بیرونی دروازہ پار کر گئی۔ دروازے پر شرفو چاچا اُسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

"اسلام علیکم بی بی۔" اس کے کچھ کہنے یا سلام کرنے سے پہلے ہی شرفو چاچا بول پڑے۔ ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ماہ نور ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔

"بی بی کیا بات ہے؟ آپ آج کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی ہیں۔" شرفو چاچا کی زیرک نگاہوں سے اس کے چہرے کی پریشانی چھپی نہ رہ سکی۔

"نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں۔" ماہ نور نے تفصیل بتانے سے گریز کی۔ اُسے دوسروں سے

ہمدردی اور ترس نہیں چاہیے تھا۔ آج ارشد، عامر اور امجد چاچے ساجے کی دکان کے بجائے گلی کے موڑ پر کھڑے تھے ان میں غیاث موجود نہیں تھا۔ ماہ نور نے کوفت کے عالم میں ان کی طرف ایک نگاہ ڈالی تھی اور چاچا شرفو کی آڑ لے کر چلنے لگی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ان تینوں لوفر آوارہ لڑکوں کی تکہ بوٹی کروا کر کتوں کے آگے ڈال دیتی۔ وہ ایک شریف سلجھی ہوئی خاندانی لڑکی تھی۔ اس لیے خود کو بچا بچا کر سینت سینت کر ایک ایک محتاط قدم اُٹھاتی تھی لیکن پھر بھی جانے ان لوگوں کو تکلیف کیا تھی۔

''اوئے یار تم نے کبھی چاند کی روشنی میں گلابی پھول کھلے ہوئے دیکھے ہیں۔'' یہ ارشد تھا جس نے اس کے سادہ سی تراش کے ہلکے پنک کاٹن کے سوٹ کو نشانہ بنایا تھا۔

''یار یہ پھول بھی ناں قسم خدا کی آنکھوں کو تو کیا روح تک کو معطر کر دیتے ہیں۔ اب دیکھو ناں ایک پھول نے سارے محلے کو مہکا رکھا ہے۔'' امجد نے کنکھیوں سے ماہ نور کی سمت دیکھا جو ان کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ رہی تھی۔ چاچا شرفو ان تین لفنڈروں کو پہلے بھی دیکھ چکے تھے لیکن ماہ نور کی وجہ سے درگزر کر گئے تھے اور اب بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ انہوں نے ماہ نور کے چہرے پر پھیلی شرمندگی کی سرخی دیکھ لی تھی وہ چاہتے تو ان تینوں کی اچھی طرح جھاڑ پٹی کر سکتے تھے لیکن ان کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ سو اس لمحے انہوں نے خاموشی ہی کو بہتر جانا۔ ماہ نور بھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس لیے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموشی سے گاڑی میں آ بیٹھے۔ تمام راستے خاموشی رہی اور ''ملک لاج'' آ گیا۔ شرفو چاچا اسے پورچ میں اُتار کر گاڑی ریورس کر کے دوبارہ واپس لے گئے تھے۔ غالباً کسی کام کے سلسلے میں جانا تھا۔ ماہ نور لان سے ہوتی ہوئی کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئی۔ خاموشی اور سناٹا بتا رہا تھا کہ گھر کے مکین گھر میں موجود نہیں تھے۔ ماہ نور نے چادر تہہ کر کے لاؤنج میں پڑے ٹیبل پر رکھ دی۔ اچھی طرح دوپٹہ پھیلا کر اوڑھتی ہوئی وہ آنٹی کے کمرے کی طرف چل دی۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر سامنے بیڈ پر پڑی۔ خلاف معمول آنٹی نہ صرف جاگ رہی تھیں بلکہ بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگائے دروازے پر یوں نظریں جمائے بیٹھی تھیں گویا اسی کے انتظار میں ہوں۔ اسے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر بہت پیاری سی مسکراہٹ ہلکورے لینے لگی۔ وہ اب پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھیں۔ بولتے ہوئے ہکلاہٹ بھی غیر محسوس سی ہوتی تھی اور اب تو وہ خود کوشش کر کے کسی نہ کسی سہارے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی تھیں اور اس پروگریس کا سارا کریڈٹ وہ ماہ نور کو دیتی تھیں۔ اس کی محنت، خلوص اور توجہ نے بہت جلد ان کے دل میں اس کے لیے ایک گوشہ بنا دیا تھا۔

''اسلام علیکم آنٹی کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں نور! آج تم پورے پانچ منٹ لیٹ ہو۔'' وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس

سے مخاطب ہوئیں۔

''سوری آنٹی آپ کب سے جاگ رہی ہیں؟''

''پندرہ منٹ ہو گئے اور اس طرح بیٹھے ہوئے سخت کوفت سی ہو رہی تھی لیکن خواب ہی ایسا دیکھا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔''

''ٹھہریں آنٹی میں پہلے آپ کے ہاتھ منہ دھلاؤں گی پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' ماہ نور باتھ روم کی طرف بڑھ گئی اور جب واپس ہوئی تو اس کے ہاتھ میں منہ ہاتھ دھلانے کے تمام لوازمات موجود تھے۔ پہلے اُس نے برش پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر آنٹی کو پکڑایا۔ جب وہ دانت صاف کر چکیں تو پھر صابن سے ان کا منہ اور ہاتھ دھلائے۔ پھر دوبارہ ساری چیزیں باتھ روم میں رکھ کر آ گئی۔ اس سے پہلے وہ انہیں تولیہ دینا نہیں بھولی تھی۔ پھر ماہ نور نے آنٹی کے قریب بیٹھ کر ان کے بال سلجھانے شروع کر دیے۔

''نور ایک بات پوچھوں؟''

''جی آنٹی پوچھیں۔''

''نور تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو؟ بلکہ ٹھہرو پہلے میں تمہیں بتاؤں۔ تم مجھے بالکل 'منزہ' میری بیٹی کی طرح لگتی ہو۔ ویسی ہی روشن آنکھیں ہیں تمہاری اور ویسی ہی بے غرض مسکراہٹ۔'' یوں لگ رہا تھا جیسے مسز ملک خیالوں ہی خیالوں میں اپنی بیٹی کے بے حد قریب ہو گئی ہوں۔

''آپ کی بیٹی اس وقت کہاں ہیں وہ؟''

''سترہ سال کی تھی جب اس کی شادی کر دی۔ فرانس میں سیٹل ہے اپنے میاں کے ساتھ۔ فون کرتی رہتی ہے۔ اب کچھ دنوں سے فون نہیں کیا اس نے تو کچھ پریشان ہوں اس کی طرف سے۔ ویسے میں نے معظم کو خود فون کرنے سے منع کیا ہے کہ میری بیماری کا سن کر پریشان ہو گی۔ فوراً بھاگی چلی آئے گی۔ یہ سوچے بنا کہ اس کے میاں کے کام کا کتنا حرج ہو گا۔ بہت بچپنا ہے اُس میں۔'' مسز ملک کے لہجے میں بیٹی کے لیے جو تڑپ اور محبت تھی ماہ نور اس کے لمس سے نا آشنا نہیں تھی۔ اس کے دل میں مسز ملک کا احترام اور بھی بڑھ گیا۔ ان کے چہرے کے تیکھے جاذب نظر نقوش میں اُسے اپنی اماں کا چہرہ نظر آنے لگا۔ یہ ہر ماں ایک جیسی ہی کیوں لگنے لگتی ہے۔ رنگ جیسا بھی ہو نقش جیسے بھی ہوں ماں بس صرف ماں ہی رہ جاتی ہے۔

''نور تم اب مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی۔ دیکھو میں نے جدائیوں کا زہر اتنا پی لیا ہے کہ میری روح تک زہر میں تر ہو چکی ہے۔ مجھے تم سے بہت پیار ہے۔ ہاں یاد آیا میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتی ہو؟''

''آنٹی..... ایک بیٹی اپنی ماں کے بارے میں کیا سوچ سکتی ہے؟ آپ کا خلوص، پیار اور آپ کی ممتا میں سے میرے حصے میں جو آیا ہے میرے لیے قیمتی متاع ہے۔ اب اور کیا کہوں؟''

''اب اور کچھ نہ کہو بس جلدی سے ناشتہ کروا دو، سچ مچ بہت بھوک لگی ہے۔'' آنٹی کے یاد دلانے پر اُسے یاد آیا کہ ان کا ناشتہ آدھا گھنٹہ لیٹ ہو چکا ہے۔ ماہ نور جلدی سے اُن کے لیے ناشتہ بنا کر لے آئی۔ نیپکن ان کے سامنے بچھا کر اُس نے اپنے ہاتھوں سے انہیں ناشتہ کروایا۔ کبھی کبھی اُسے مسز ملک پر بہت پیار آتا تھا۔ وہ اسے کسی فرمانبردار بچے کی مانند لگتی تھیں اور وہ انہیں ٹریٹ بھی اسی انداز میں کرتی تھی لیکن ماہ نور نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ صبح سے لے کر رات تک وہ بالکل تنہا ہونے کے باوجود کبھی شکوہ نہیں کرتی تھیں۔ انہیں اپنے دونوں بیٹوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ماہ نور نے آج تک ان کے ہونٹوں سے اپنے بچوں کے لیے تعریفی جملے ہی سنے تھے۔

''آنٹی! آپ کچھ دیر قبل کسی خواب کا تذکرہ کر رہی تھیں۔'' ماہ نور نے سلسلۂ سخن دوبارہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے ناشتہ کرنے سے پہلے چھوڑا تھا۔

''ہاں نور میں نے اچھا خواب نہیں دیکھا۔ میں نے شاری کو سینکڑوں سانپوں کے بیچ میں بے بس دیکھا ہے۔ اس کے گلے کے گرد لپٹا ہوا سانپ انتہائی خوبصورت سنہرے رنگ کا تھا۔ میں اُس سے کچھ دور کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔ جانے کیوں مجھے شاری سے زیادہ اُس سانپ سے محبت محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ خوف بھی تھا کہ کہیں شاری اُسے مار نہ ڈالے۔ عجیب سی بات ہے ناں؟'' آنٹی متفکر سے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''آنٹی یہ خواب تو انسان کے لاشعور میں چھپے ہوئے خوف ہوتے ہیں جو ہمارے سونے پر آنکھوں میں عکس بن کر در آتے ہیں۔ اس لیے ان پر زیادہ یقین کرنا یا وہم میں مبتلا ہونا ٹھیک نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' ماہ نور تسلی آمیز انداز میں بولی تو آنٹی کے فکر زدہ چہرے پر سے تردد کے آثار قدرے کم ہو گئے۔

''تم کتنی اچھی ہو ماہ نور..... تمہاری سوچیں' تمہاری خیالات' تمہاری عادات بالکل میری منزہ کی طرح ہیں۔ اللہ نے تین بیٹوں کے بعد بڑی دعاؤں اور منت مرادوں سے اُسے گود میں ڈالا تھا لیکن معظم کو جانے کیا جلدی تھی اس کی شادی کی۔ ابھی تو وہ ٹھیک سے دنیا کو سمجھنے کا ڈھنگ بھی نہیں جانتی تھی اور اس پر گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا۔''

''آنٹی..... سر کے والد کہاں ہوتے ہیں؟'' ماہ نور کے سوال پر یکدم انہوں نے اس کی جانب چونک کر عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ جیسے انہیں اس سوال کی توقع ہی نہ ہو۔

''نور..... ٹیبلٹ دے دو بیٹا۔'' آنٹی نے موضوعِ سخن بدل دیا تھا لیکن اپنے سوال کے جواب

میں ان کے چہرے پر پھیلتے کرب کے سائے ماہ نور کی نگاہوں سے نہ چھپے رہ سکے۔ وہ خاموشی سے اُٹھی اور آنٹی کو میڈیسن دینے لگی۔

''نور..... ایک عرصے سے دل کے اندر زخموں کے ناسور بہہ رہے ہیں لیکن کوئی ملا ہی نہیں جو ان زخموں کی رفوگری کرتا' جو ان پر ہمدردی اور محبت کے پھوہے رکھتا۔ جو بھی ملا زخم دینے والا ملا لیکن پتہ نہیں کیوں تمہارے سامنے اپنے دل کے اوراق کھولنے کو جی چاہتا ہے۔'' آنٹی کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔

کیا اُن کے اندر کوئی دکھ ہو سکتا ہے؟ ماہ نور تو آج تک یہی سمجھتی تھی کہ امیر لوگوں کو کوئی دکھ نہیں ہوتا لیکن اب وہ جان گئی تھی کہ امیر ہو یا غریب کوئی انسان دکھوں سے خالی نہیں۔ وہ مسز ملک کے قریب بیٹھ گئی۔

''آنٹی! دنیا ایسی ہی ہے یہاں زخم لگانے والوں کو عظمت اور بڑائی کے ایوارڈ دیے جاتے ہیں اور زخم کھانے والے ہی معتوب ٹھہرتے ہیں۔ آپ بتائیں کیا دکھ ہے آپ کو؟ کون سا کرب' کون سی داستان چھپی ہوئی ہے آپ کے دل میں؟'' اس کا لہجہ اتنا پُراثر اور انداز بیاں میں ایسا خلوص تھا کہ خود بخود مسز ملک کی داستانِ حیات نوکِ زباں پر آ گئی۔

''نور..... چار بھائیوں کی ایک ہی بہن تھی میں۔ اتنا پیار اتنی محبت شاید ہی کسی لڑکی کو ملی ہو جیسی میرا نصیب بنی۔ ہمارے پورے خاندان میں کسی لڑکی کو تعلیم جیسی نعمت نہیں ملتی تھی۔ میرے ماں باپ نے سارے خاندان کی شکایات اور منا ہی کے باوجود مجھے کالج تک تعلیم دلائی۔ پابندیاں تو تھیں لیکن ایسی نہیں جنہیں میں خود پر گراں سمجھتی۔ بی۔ اے کے بعد میں مزید آگے تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن امی اور بابا کے صاف انکار پر خاموش ہو گئی۔ وہ ہر ماں باپ کی طرح اب میری شادی کے لیے فکرمند تھے۔ خاندان کے بہت سے لڑکوں کی نظر مجھ پر تھی۔ آخر قرعہ فال ملک جلال کے نام نکلا۔ جلال عمر میں مجھ سے تقریباً بارہ سال بڑے تھے۔ صورت شکل کے بھی اچھے تھے اور خاندان بھر میں بھی مقبول تھے۔ مجھے اُس دن خبر ہوئی جب میرے ماموں ممانی مجھے انگوٹھی پہنانے آئے۔ کنواری زندگی میں یہ پہلا جذباتی دھچکا تھا جو مجھے لگا۔ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز رکھنے والے' میری ہر آرزو' ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا مان رکھنے والے میرے والدین نے میری زندگی کا فیصلہ کرتے وقت مجھ سے پوچھنا' میری رائے لینا ہی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ اگر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہی بھی بخشتے تو یقیناً میں نے انکار نہیں کرنا تھا کہ ماں باپ کی عزت کا مجھے اپنی ذات سے کہیں زیادہ پاس تھا۔ بہرحال میں نے سر جھکا دیا۔ ان کا فیصلہ مانتے ہوئے ملک جلال کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ کچھ عرصے بعد شادی ہو گئی۔ شادی کے پہلے تین سال بہت اچھے گزرے۔ جلال

پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن سلجھے ہوئے انسان تھے۔ پہلے سال ہی خدا نے گود ہری کر دی۔ معظم کی پیدائش پر جلال اور ان کے تمام گھر کے افراد نے جس طرح خوشیاں منائیں' آج تک بھول نہیں سکتی میں۔ دو سال بعد غازی پیدا ہوا۔ خاندان بھر میں میری وقعت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ میں دو بیٹوں کی ماں تھی۔ انہی دنوں جلال کو شہر آنے کا جنون ہو گیا۔ گاؤں اور حویلی کی سادہ فضا اور رونقیں چھوڑ کر شہر کے شور و غل میں آ کر کئی دن تک ہم دونوں کا ہی جی نہ لگا۔ پھر جلال بزنس کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ شہر میں بہت خوبصورت گھر تھا ہمارا۔ جلال نے اپنے حصے کی جائیداد کے تین حصے فروخت کر کے شہر میں ٹیکسٹائل مل لگائی۔ دنوں میں ہی بزنس ترقی کر گیا۔ پڑھے لکھے نہ ہونے کے باعث انہوں نے اپنے ایک شہری دوست کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن اُس دوست ہی کے باعث ہم کوڑی کوڑی کو محتاج ہوئے۔"

"وہ کیسے آنٹی؟" ماہ نور دلجمعی سے مسز ملک کی داستان سن رہی تھی۔

"اُس شخص نے جلال کے اندر چند ایسی عادات پیدا کر دیں جنہوں نے بالآخر ہمیں تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔ آئے روز گھر پر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چند دوست ہر وقت ڈرائنگ روم میں موجود رہتے۔ شطرنج اور تاش جیسے منحوس کھیل کھیلے جاتے' یہیں سے جلال کو جوئے کی لت پڑ گئی۔ پھر وہ اکثر دوستوں کے ساتھ جوئے کے اڈوں پر جانے لگے۔ بات یہیں تک رہتی تو پھر بھی کچھ نہیں تھی لیکن ایک روز جب وہ گھر آئے تو ان کے لڑکھڑاتے قدم دیکھ کر میری روح تک لرز گئی اور پھر یہ آئے روز کی بات بن گئی۔ مل گھاٹے میں جا رہی تھی لیکن جلال اپنا بہت سا وقت دوستوں کے ساتھ برباد کر دیتے تھے۔ مل کا سارا کام ان کے دوست رانا سرفراز کے سپرد تھا۔ اُس نے بڑی بڑی رقمیں خرد بُرد کرنی شروع کر دیں لیکن جلال کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ پھر ایک دن سرفراز نے مجھ سے آ کر کہا کہ بھابی مل کا ایک بہت بڑا پروجیکٹ نقصان میں چلا گیا ہے۔ کم از کم پندرہ لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔ میں نے جب پوچھا کہ مل کے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے بھی نہیں تو جواب سننے کو ملا کہ جلال جوئے کی مد میں تقریباً کنگال ہو چکے ہیں۔ اُن دنوں شہسوار چند ماہ کا میری گود میں تھا۔ اُس نے مجھ سے کوٹھی بیچ دینے کو کہا۔ میں نے جلال سے مشورہ کرنے کو کہا تو سرفراز نے کہا یہ غیر ضروری ہے۔ جلال کو اپنا ہوش نہیں ہے وہ ان باتوں کو کیا جانے۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا شاک تھا۔ وہ گھر جو ہم دونوں کی باہمی آرزوؤں کی آماجگاہ تھا' چند بے قیمت سکوں کے عوض نیلام ہو گیا۔ اندرون شہر کے ایک تنگ و تاریک محلے میں ایک چھوٹا سا گھر خرید کر سرفراز نے گویا ہم سب پر احسان کیا تھا۔ ہم ایک شاندار کوٹھی سے ایک تاریک سے مکان میں آ گئے تھے لیکن خدا جانے جلال کے اندر اتنی بے حسی کہاں سے آ گئی تھی۔ انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن سرفراز نے آ کر بتایا کہ مل کا دیوالیہ نکل گیا ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر مل کا کام بند کرنا پڑے گا۔ ہمیں اس وقت بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ سرفراز نے ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔ پتہ اس وقت چلا جب سرفراز بیرون ملک چلا گیا۔ مل میں اس کے ساتھ کام کرنے والوں نے سارا کچا چٹھا کھول کر جلال کو بتا دیا لیکن موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جلال میں بھی اب وہ طمطراق نہیں رہا تھا۔ پھر کسی دوست کی مہربانی سے انہیں ہیروئین کی بد عادت لگ گئی۔ اس نشے نے ہمیں خوار کر کے رکھ دیا۔ اُن دنوں معظم گیارہ سال کا تھا اور غازی نو سال کا جبکہ شہسوار کی عمر چھ سال تھی اور منزہ دوسرے سال میں پاؤں رکھ رہی تھی۔ میرے تینوں بچے شہر کے بے حد اچھے سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن گھر کے مخدوش ہوتے حالات کو دیکھ کر میں نے انہیں محلے کے ہی ایک عام سے سکول میں داخل کروا دیا۔ معظم اور غازی سمجھدار تھے۔ گھر کے حالات دیکھ دیکھ کر انتہائی حساس ہو گئے تھے لیکن شہسوار چھوٹا تھا۔ وہ اتنی جلدی اچھے ماحول سے غریبی میں آ کر ایڈجسٹ نہیں ہوا تھا۔ اس کی ضدیں بعض اوقات مجھے بہت زچ کرتی تھیں۔ میں نے تنگ آ کر محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی۔ کسی نہ کسی طرف گھسٹ گھسٹ کر وقت پورا ہونے لگا۔ جلال زیادہ تر گھر سے باہر رہتے تھے۔ عموماً پیسے کی طلب انہیں گھر کا راستہ دکھاتی تھی۔ میرے پاس تو پہلے ہی بہت کم پیسے ہوتے تھے جن میں سے گھر کا خرچ' بچوں کی تعلیم اور ان کی ضروریات۔ ایسے میں جلال آئے روز جب مجھے پریشان کرتے تھے تو مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اپنے بھائیوں سے بھی میں کوئی تذکرہ نہیں کر سکتی تھی کہ جلال نے اُن سے بھی بگاڑی ہوئی تھی۔ انہی دنوں جلال کے اندر ایک اور عادت پیدا ہوئی۔ میرے ذرا سے انکار پر وہ مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے۔ ایک بے انتہا پیار کرنے والے شریک زندگی کا ایسا مسخ روپ میری برداشت سے باہر تھا۔ بارہا میری عزت نفس مجروح ہوئی لیکن میں نے پھر بھی اُف تک نہیں کی۔ میری ایسی حالت اور گھر کی تنگی دیکھ کر معظم اور غازی دونوں نے ہی پڑھائی کے ساتھ ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ اُسی محلے میں ایک تھیٹ بٹل ورکشاپ کا مالک رہتا تھا۔ اُس نے سات روپے یومیہ اجرت پر دونوں بھائیوں کو کام پر رکھ لیا۔ اپنے ننھے منے پیارے پیارے پھول جیسے بچوں کے ہاتھوں میں ہتھوڑے دیکھنا بھی میری برداشت کا ایک کڑا امتحان تھا لیکن ایک دن حد ہی ہو گئی۔ جلال نے مجھ سے پیسے مانگے۔ خدا گواہ ہے اُس دن میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ میرے انکار پر پہلے تو انہوں نے میری بہت پٹائی کی اور اس کے بعد ان کے منہ سے وہ الفاظ نکلے جو کسی بھی عورت کے لیے ذلت کا نشان ہوتے ہیں۔ ان کے منہ سے طلاق کا سن کر پھر ان کے گھر میں ٹھہرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ غازی گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں نے معظم' شہسوار اور منزہ کو لیا اور اپنی ہمسائی کے گھر چلی گئی۔ وہ لڑکی بے حد اچھی اور مخلص تھی۔ میں نے اُس سے چند روپے اُدھار لیے اور لاہور سے واپس اپنے گاؤں شاہ کوٹ

چلی گئی۔ میرے بھائی مجھے اس حال میں دیکھ کر غم و غصے سے جیسے پاگل ہی ہو گئے تھے۔ عباس بھائی نے تو جلال کو قتل تک کر ڈالنے کی بات کہہ دی لیکن میں نے بہت مشکل سے انہیں اس کام سے منع کیا۔ اب چاہے وہ زندہ رہتے یا مر جاتے میرے لیے برابر ہی تھا۔ میرے لیے دنیا میں زندگی میں اب کشش باقی نہیں رہی تھی جو داغ میری پیشانی پر لگا تھا اُسے سات سمندروں کا پانی بھی نہیں دھو سکتا تھا۔ میرے لیے گاؤں کے لوگوں اور اپنے رشتے داروں کا سامنا کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ شادی کے تیرہ سال بعد اپنے بچوں کے ہمراہ میں جس کسمپرسی کی حالت میں گاؤں پہنچی تھی۔ اپنوں کو اذیت ہوئی اور وہ لوگ جو مجھ سے رشتے کی آس لگائے بیٹھے تھے انہیں راحت ملی۔ تابش بھائی اور عباس بھائی نے باہمی مشورہ کے بعد یہ طے کیا کہ مجھے اور بچوں کو فیصل آباد میں موجود اپنے گھر میں شفٹ کر دیں۔ فیصل آباد میں ہی معظم اور شہسوار کو سکول میں داخل کرا دیا۔ میری ایک مربع زمین تھی جس پر سے آنے والی آمدنی سے بہت آسانی کے ساتھ گزارا ہونے لگا۔ مجھے اس مشکل وقت میں اللہ کے بعد اپنے بھائیوں کا آسرا تھا اور نور' میں آج بھی شکر گزار ہوں۔ میں تن تنہا اپنے بچوں کو اس مقام تک نہیں پہنچا پاتی۔ میرے بچوں کو بھی کسی کا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر جب معظم نے ایم۔ بی۔ اے کر لیا تو تابش بھائی نے میرے حصے کی زمین کے بدلے میں مجھے اسی لاکھ روپے کی آفر کی۔ معظم سے جب بات ہوئی تو اُس نے فوراً ہامی بھر لی۔ اس طرح ہم دوبارہ اسی شہر میں واپس آ گئے جہاں سے ایک بار قسمت کی ٹھوکر نے ہمیں دیس نکالا دیا تھا۔ لاہور آ کر معظم نے اسی ٹیکسٹائل مل میں شیئر خریدے جو اس کے باپ نے اپنی ناعاقبت اندیشیوں کے باعث گنوا دی تھی۔ بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کی ہیں میرے بچے نے۔'' مسز ملک کے اُداس لہجے میں یکدم اپنے بیٹے کی محبت کی خوشبو سمٹ آئی تھی۔ ''اور آج معظم اس مل کا مالک ہے' بلا شرکت غیرے۔''

''لیکن آنٹی آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ غازی اور آپ کے ہزبینڈ کا کیا بنا؟؟''

''نور یہ سوال مجھے بہت تکلیف دیتا ہے۔ پچھلے پندرہ سالوں میں' میں غازی کے لیے کتنا تڑپی ہوں' بتانا چاہوں بھی تو نہیں بتا سکتی۔ میرا وہ بچہ اپنے دونوں بھائیوں سے یکسر مختلف تھا۔ اُسے مجھ سے اتنا پیار تھا کہ مجھے دیکھے بنا وہ کھانا نہیں کھاتا تھا۔ کبھی کسی کام سے باہر چلی جاتی تو میرے انتظار میں دروازے کے باہر بیٹھا رہتا۔ ضدی اور غصیلا بھی انتہا کا تھا لیکن پتہ نہیں اب وہ کس حال میں ہو گا۔ مجھے جب معظم اور شہسوار کے بیچ وہ دکھائی نہیں دیتا تو میری اذیت دُگنی ہو جاتی ہے۔ میرے یہ بچے لمبی لمبی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ قیمتی سے قیمتی لباس پہنتے ہیں۔ محض ایک ایک پرفیوم پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں اور پتہ نہیں اس کے پاس دو وقت کی روٹی بھی ہوتی ہو گی یا نہیں۔ جانے اس کی ضرورتیں کون پوری کرتا ہو گا؟ اس کے باپ کو تو اس کی ذرا بھر پرواہ نہیں ہو گی۔ وہ رات کو اکثر ڈر

جایا کرتا تھا۔ میرے بعد اُسے کون سینے سے لگا کر سلاتا ہو گا۔'' مسز ملک کا لہجہ رندھ گیا تھا اور شفاف آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

''آنٹی اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کی پریشانیاں کم کی ہیں یونہی اس کا بھی اوپر والے نے کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیا ہو گا۔'' ماہ نور نے انہیں تسلی دی۔

''جانتی ہوں۔ اوپر والا پتھر میں بھی کیڑے کو رزق عطا کرتا ہے لیکن ماں ہوں ناں صبر نہیں آتا۔'' آنٹی اب باقاعدہ رونے لگی تھیں۔ ماہ نور نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا۔ کس قدر بڑا گھاؤ تھا ان کے سینے میں۔ بھری جوانی میں طلاق کا داغ' اپنے بچے سے جدائی کا دُکھ

''آنٹی پلیز آپ روئیں مت۔ مجھے کامل یقین ہے کہ زندگی میں آپ کا وہ بیٹا آپ سے ضرور ملے گا۔''

''پتہ نہیں اُسے میرے بارے میں کیا بتایا گیا ہو گا۔ وہ دل میں کیا سوچتا ہو گا کہ میں نے اُسے رلنے کے لیے فٹ پاتھ پر چھوڑ دیا۔''

''آنٹی یہ محض ایک اتفاق تھا اس میں بھلا آپ کا کیا دوش؟ آپ یہ سوچیں کہ جو کچھ ہو گیا اسی طرح ہونا تھا اور ہونی کو ٹالنا ہم انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔''

وہ چپ آواز آنسو بہا رہی تھیں۔ پھر جیسے دھیرے دھیرے انہیں صبر آنے لگا۔ ماہ نور جلدی سے کچن میں سے ملک شیک کا گلاس اُٹھا کر لائی۔

''آنٹی اب کوئی فرسٹریٹنگ بات نہیں ہو گی۔ اچھے بچوں کی طرح یہ پورا گلاس پی کر ختم کرنا آپ نے۔'' انہیں گلاس تھما کر وہ ان سے قدرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے گلاس ہاتھ میں تھام لیا اور چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگیں۔ گلاس ختم کر کے اُسے پکڑا دیا۔

''نور... میں تھک گئی ہوں۔ تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔''

''لیکن آنٹی لنچ کا وقت ہوا جا رہا ہے۔''

''نہیں نور... کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ بس کچھ دیر آرام کروں گی تو طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ تم ایسا کرو۔ اے۔ سی آن کر دو اور کھڑکیوں کے پردے گرا دو۔'' ماہ نور نے ان کے کہنے کے مطابق ہی کیا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ خالہ زیتون لاؤنج کی صفائی میں تندہی سے جتی ہوئی تھیں۔ جب سے ملک معظم نے ان کی جھاڑپٹی کی تھی تب سے وہ ہر کام بڑی جانفشانی سے کرنے لگی تھیں۔ گھر بھر میں ایک مثبت تبدیلی آئی تھی۔ نور چلتی چلتی اُسی لائبریری نما کمرے کے باہر آ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر شش و پنج میں رہی کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ پھر کچھ سوچ کر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے پڑی رائٹنگ ٹیبل پر دھرا کمپیوٹر آن تھا۔ دروازے کی جانب پشت ہونے کے باوجود شہسوار کو

خبر ہو گئی تھی کہ کمرے کے اندر کوئی داخل ہوا ہے۔ اُس نے گھوم کر اپنے عقب میں دیکھا۔ ماہ نور کے لیے اس کی اس وقت یہاں موجودگی خلاف توقع تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں چٹخاتی ہوئی یوں سر جھکا کر کھڑی تھی جیسے اُس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ شہسوار نے دلچسپی سے اس کے نادم سے گلابی چہرے کی جانب دیکھا۔

''کیا بات ہے مس ماہ نور......؟ آپ وہاں کیوں کھڑی ہو گئیں؟ آیئے بیٹھیے پلیز۔'' شہسوار کا لہجہ عام حالات کے مقابلے میں کافی بہتر تھا۔ ماہ نور کو کچھ حوصلہ ہوا۔

''وہ دراصل آنٹی سو گئی ہیں تو میں نے سوچا...... میں نے سوچا کہ یہاں سے کوئی بک لے کر پڑھ لوں۔''

''ویلکم......ضرور لیں بلکہ آپ کی پسند کی کلیکشن ضرور ہو گی یہاں' کوئی ہرج نہیں ... جب بھی آپ کے پاس وقت ہو آپ ان بکس سے استفادہ کر سکتی ہیں۔ میں عموماً اس وقت گھر پر نہیں ہوتا۔ آج کل کالج میں الیکشن کی وجہ سے کچھ خاص پڑھائی نہیں ہو رہی۔ دوسرا میں خود بھی الیکشن میں پارٹی سپیٹ کر رہا ہوں۔ سو ادھر ادھر کے سینکڑوں کام نکل آتے ہیں۔'' وہ آج پتہ نہیں کس موڈ میں تھا کافی دیر اُس سے باتیں کرتا رہا۔

''دیکھیے مس ماہ نور! میں دانستہ کبھی کسی کا دل نہیں دُکھاتا اگر میری کسی شرارت یا بات سے آپ کا دل دُکھا ہو تو معذرت۔ بہر حال ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح بھی رہ سکتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی نرمی تھی۔ ماہ نور کے خیالات میں اس کی ذات کا جو عکس بنا ہوا تھا اس میں کافی حد تک تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اس قسم کی دوستی کے حق میں تو نہیں تھی لیکن اس کے لیے یہی بہت تھا کہ شہسوار آج انسانوں کی جون میں بات کر رہا تھا۔ ماہ نور نے آگے بڑھ کر ایک بک کا جائزہ لیا۔ علیم الحق حقی کی ''عشق کا عین'' پر نگاہ پڑی تو وہی اُٹھالی۔ شہسوار نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کو دیکھا۔

''آپ حقی کو پڑھتی ہیں؟''

''جی ہاں حقی میرے پسندیدہ رائٹرز میں سے ہیں اور ان کا یہ ناول پہلے بھی دو بار پڑھ چکی ہوں لیکن ہر بار اس تحریر کو پڑھتے ہوئے ایک انوکھا سا احساس ہوتا ہے۔'' شہسوار اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی میں ایسا کیا تھا' جو کچھ خاص تھا۔ وہ دوسروں جیسی ہی تھی لیکن ہر بار اُسے دیکھ کر وہ کسی نامعلوم احساس میں گھر جاتا تھا۔

وہ اسے محبت نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ محبت کا لفظ تو اس کی ڈکشنری میں ہی نہیں تھا۔ بس وہ اُسے اچھی لگتی تھی۔ ماہ نور نے ایک لحظہ کو اُسے خاموش اپنی جانب دیکھتے پایا پھر کمرے سے باہر نکل

گئی۔ کمرے سے نکل کر جب اُس نے خالہ زیتون کو بدستور لاؤنج میں کام کرتے پایا تو وہاں بیٹھنے کی بجائے ایک اور کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ یہ کمرہ بھی کافی بڑا تھا اور انتہائی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کے ایک سائیڈ پر جہازی سائز بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ منقش صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ مغلیہ طرز کے فرنیچر نے کمرے کو عجیب سا شاہانہ پن بخش رکھا تھا۔ بیڈ کے سرہانے دیوار پر اعلیٰ درجے کی اوئی ملک معظم جاہ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یعنی وہ اس وقت ملک معظم کے بیڈ روم میں کھڑی تھی۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کے بیڈ روم کی ایک ایک چیز سے وقار جھلک رہا تھا۔ ماہ نور کے لیے وہاں کھڑا ہونا دوبھر ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی لیکن ملک معظم سے اُسے ڈر لگتا تھا۔ حالانکہ انہوں نے آج تک اُسے کچھ نہیں کہا تھا لیکن ان کی شخصیت کے سامنے جانے کیوں وہ خود کو دبا دبا سا محسوس کرتی تھی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو ٹھٹک کر رُک گئی۔ ملک معظم اپنی شخصیت کے تمام تر سحر کے ساتھ دروازے پر ایستادہ تھے۔ ماہ نور کو جانے کیوں غصہ سا آ گیا۔ یہ آج اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ مسلسل شرمندگی ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ کیا سمجھتے ہوں گے مجھے کوئی چھچھوری سی لڑکی جو ان کی عدم موجودگی میں ان کے گھر کی چیزوں کو ندیدوں کی طرح دیکھتی رہتی ہے۔ وہ ان کے قریب سے ہو کر باہر جانے کو تھی کہ انہوں نے ٹوک کر پکار لیا۔

''جسٹ اے منٹ مس ماہ نور۔'' وہ رُک گئی۔

''کیا آپ کے پاس کچھ وقت ہو گا؟ اگر ہے تو پلیز بیٹھیے۔ میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ماہ نور نے پلٹ کر ان کا سنجیدگی سے مزین چہرہ دیکھا اور پھر واپس پلٹ کر صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''جی سر......''

''پہلے آپ یہ بتائیں کہ اگر میں آپ کے کسی گھریلو میٹر میں انٹرفیئر کروں تو آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟''

''کیا مطلب سر؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔'' ماہ نور قدرے حیرت سے ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

''مس ماہ نور! شرفو چاچا بتا رہے تھے کہ محلے کے چند لڑکے آپ کو تنگ کرتے ہیں۔'' ان کی بات سن کر ایک لمحے کو ماہ نور نے بے حد شرمندگی محسوس کی لیکن اگلے ہی پل جیسے اس کے ذہن میں ایک بات آ گئی۔

''جی سر! چاچا شرفو نے صحیح بتایا ہے آپ کو لیکن بات صرف یہیں تک نہیں ہے۔ محلے کے اور بھی چند گھر ایسے ہیں جو ان لوگوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ آئے روز ہمارے گھر کے دروازے پر آ کر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہم وہ گھر' وہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ سر میرے والد حیات نہیں۔

بھائی ابھی بہت چھوٹا ہے۔ پھر یکدم کس طرح اپنا گھربار چھوڑ دیں لیکن یہ بات اُن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"ماہ نور...... کیا وہ گھر آپ کی ذاتی ملکیت ہے؟"

"جی سر...... اچھے وقتوں میں ابو جی نے وہ گھر بنایا تھا اور ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ کم از کم سر کی چھت تو ہے اور مسائل اپنی جگہ لیکن اب وہ چھت بھی ہم سے چھنی جا رہی ہے۔" ماہ نور کے لہجے میں محسوس کی جانے والی اُداسی در آئی تھی۔

"مس ماہ نور! پھر اب آپ نے کیا سوچا؟ کوئی متبادل انتظام کیا یا نہیں؟" ان کے پوچھنے پر ماہ نور ایک لمحے کو خاموش ہوگئی۔ پھر بولی۔

"سر...... اماں نے کہا تھا کہ آپ سے بات کروں ممکن ہے آپ اس مسئلے کا کوئی حل بتا سکیں کیونکہ میرے لیے گھر تلاش کرنا مشکل ہے۔ اتنے بڑے شہر میں میری کسی سے کوئی خاص جان پہچان بھی نہیں۔ رشتوں کے معاملے میں ہم پہلے ہی کنگال ہیں۔"

"ماہ نور...... میرے لیے تو یہ مشکل ہے کہ کوئی گھر ڈھونڈ سکوں۔ چاچا شرفو یا شہسوار سے کہوں گا۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں...... بلکہ آپ ایسا ہی کریں۔ ہماری انیکسی طویل عرصے سے بے آباد پڑی ہے، آپ وہاں شفٹ ہو جائیں۔"

"سر...... یہاں......؟" ماہ نور کے سوالیہ لہجے میں حیرت بھری تھی۔

"جی ہاں کیوں......؟ کیا قباحت ہے؟" ملک معظم نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سر...... کیا میرا یہاں رہنا مناسب لگتا ہے۔ ایک ملازم کا پے انگ گیسٹ کے طور پر رہنا؟"

"دیکھیے ماہ نور آپ ملازم نہیں ہیں۔ ہم نے پہلے دن سے ہی آپ کو اپنے گھر کے فرد کی سی حیثیت دی ہے۔ رہی بات مناسب، نامناسب کی تو اس میں بھی میری اپنی غرض پوشیدہ ہے۔ ماما کو چوبیس گھنٹے اٹینڈ کرسکیں گی آپ۔ اب بھی مجھے ان کی طرف سے کوئی زیادہ فکر نہیں ہوتی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ ان کا بہت خیال رکھتی ہیں۔" ان کے لہجے میں ماہ نور کے لیے ستائش تھی۔

"سر...... آنٹی اللہ کا شکر ہے بہت جلد امپروو کر رہی ہیں۔ جب وہ ٹھیک ہو جائیں گی تو پھر تو میرا یہاں رہنا بنے گا ہی نہیں۔ گھر تو ہمیں تب بھی تلاش کرنا پڑے گا۔"

"مس ماہ نور، ماما کے ٹھیک ہو جانے کے بعد مل میں آپ کے لیے کوئی بھی پوسٹ آپ کی کوالیفیکشن کے حساب سے آپ کو دے دی جائے گی۔ یوں بھی ماما آپ کو اب جانے نہیں دے گی۔ وہ تو آپ کے جانے کے بعد جب تک سو نہیں جاتیں آپ کا ہی تذکرہ کرتی رہتی ہیں۔" ان کی بات کے جواب میں ماہ نور کے پاس کچھ کہنے کو نہ رہا اور اسے ماننے ہی بنی۔

"ٹھیک ہے سر...... ہم یہاں شفٹ ہو جائیں گے۔ آپ کا بے حد شکریہ۔" ماہ نور یہ کہہ کر جانے کے لیے اُٹھی تو وہ بولے۔

"مس ماہ نور اس کے علاوہ اور تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔" ملک معظم کا لہجہ نرم اور سادہ تھا۔

"نہیں سر اب اور کوئی پریشانی نہیں ہے۔ پچھلے چند دنوں سے جس مسئلے کی ٹینشن تھی وہ اب آپ کے توسط سے حل ہو گیا ہے۔ آپ کا بے حد شکریہ۔" ماہ نور حقیقتاً خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

"تو پھر کب شفٹ ہو رہی ہیں آپ یہاں؟" ملک معظم کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ اُبھر کر معدوم ہوگئی۔

"سر آج اماں سے بات کرلوں گی...... ممکن ہے کل یا پھر پرسوں انشاء اللہ شفٹنگ کرلیں گے۔"

"ٹھیک ہے جب آپ یہاں آنا چاہیں تو مجھے بتا دیجئے گا۔ میں ایک دو ملازموں کو بھیج دوں گا۔ وہ سامان کی لوڈنگ وغیرہ میں ہیلپ کر دیں گے۔"

ماہ نور نے تشکر بھری نظروں سے ملک معظم کی طرف دیکھا۔ ان کے سامنے شکریہ کہنا اُسے بہت عجیب اور رسمی سا لگ رہا تھا۔

"آپ یقیناً کچھ پڑھنے کا سوچ رہی تھیں۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی کتاب دیکھ کر کہا۔

"جی سر...... وہ آنٹی سو رہی ہیں تو میں نے سوچا کہ فارغ وقت میں کچھ پڑھ ہی لیا جائے۔"

"اوکے...... پھر آپ جو کرنا چاہتی ہیں وہ کریں اور میں بھی اب چلتا ہوں۔ چند ضروری فائلیں صبح گھر پر ہی بھول گیا تھا۔ وہ لینے آیا تھا۔" ملک معظم بات ختم کر کے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولنے لگ گئے۔

ماہ نور بھی وہاں سے اُٹھ کر باہر نکل آئی۔ زیتون لاؤنج کا کام ختم کرنے کے بعد کچن سدھار چکی تھیں۔ سارے گھر میں کھانے کی بھینی بھینی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی یعنی وہ دن کا کھانا بھی تیار کر چکی تھیں۔ ماہ نور نے ایک نظر چمچماتے لاؤنج پر دوڑائی اور پھر ایک سمت دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ناول کھول کر پڑھنا شروع کر دیا لیکن زیادہ دیر تک توجہ قائم نہ رکھ سکی۔ خالہ زیتون نے آ کر بتایا کہ آنٹی جاگ گئی ہیں اور اُسے یاد کر رہی ہیں۔ ماہ نور نے ناول ٹیبل پر رکھا اور مسز ملک کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی سوال اُبھر رہا تھا کہ کیا اُن لوگوں کا ملک لاج میں آ کر رہنا ٹھیک ہے؟ ذہن کبھی اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ ٹھیک ہے اور کبھی نہیں۔ اسی اُدھیڑ بن میں جب وہ مسز ملک کے کمرے میں داخل ہوئی تو نیم تاریکی میں ایک پل کو اس کی آنکھیں کچھ نہ دیکھ پائیں۔ جب آنکھیں نیم اندھیرے، نیم اُجالے سے قدرے مانوس ہوئیں تو اُس نے

دیکھا مسز ملک بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی کرب اور آنکھوں میں ہلکورے لیتی نمی بتا رہی تھی کہ وہ سوئی نہیں تھیں۔ انہوں نے تنہائی کا تقاضا اس لیے کیا تھا تا کہ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں۔ ایک لمحے کے لیے ماہ نور کو ان کے دُکھ پر دلی تکلیف ہوئی۔ پھر وہ اُن کے قریب چلی آئی۔

''آنٹی...... یہ فاؤل ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کچھ دیر سونا چاہتی ہوں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ کچھ دیر رونا چاہتی ہوں۔'' اس کی بات پر آنٹی کے لبوں پر زخمی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''نور' تنہائی جانے میرے کتنے ہی آنسوؤں کی امین ہے۔ میں نے زندگی میں بہت کچھ پایا اور بہت کچھ کھویا لیکن جب سے غازی مجھ سے بچھڑا ہے ناں۔ یوں لگتا ہے میں نے سب کچھ کھو دیا ہے۔ کچھ نہیں بچا میرے پاس۔ یہ دامن خالی ہے میرا۔''

''آنٹی...... آپ نے بعد میں غازی کو تلاش نہیں کیا؟''

''کیا...... بہت ڈھونڈا...... بہت تلاش کیا...... لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا۔ جس دن میں پیشانی پر داغ لے کر جلال کے گھر سے رُخصت ہوئی تھی۔ اُسی دن جلال غازی کو لے کر جانے کہاں چلا گیا۔ پھر وقتاً فوقتاً اس کو تلاش کرتے رہے لیکن کہیں سے کوئی پتہ نہ چلا۔ آخر جانے کہاں چلا گیا۔ بھاگوں میں رونا لکھا ہو تو ہونٹوں کی کیا مجال جو اُن پر مسکراہٹ کھیل پائے۔''

''آنٹی آپ اُداس نہ ہوں بچھڑے ہوئے کبھی نہ کبھی ضرور مل جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی آپ کا بیٹا ضرور ملے گا۔''

''اللہ کرے بیٹا...... میری زندگی میں ہی ایسا ہو جائے۔ کم سے کم میں یہ ارمان لے کر دنیا سے نہ جاؤں۔''

''نور...... ذرا سامنے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں سے بڑا والا البم تو نکال لاؤ۔'' آنٹی نے کہا تو ماہ نور جلدی سے اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی اور جب پلٹی تو ہاتھ میں کافی بڑا اور بھاری بھرکم البم تھام رکھا تھا۔ وہ البم اُس نے لا کر آنٹی کے ہاتھ میں دے دیا۔

''تم بھی بیٹھو یہاں میرے پاس...... دیکھو کیسا خوشحال خاندان تھا میرا جسے سرفراز جیسے شقی القلب نے تباہ کر کے رکھ دیا۔'' آنٹی نے البم کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ البم میں سب سے پہلے آنٹی کی شادی کی تصویر تھی۔ انتہائی خوبصورت جوڑا تھا مسز ملک اور ملک جلال کا۔ بعد کی تصویروں میں بچوں کے عقیقوں کی' سالگرہوں کی تصاویر تھیں۔

''ماہ نور یہ جو گروپ فوٹو ہے ناں۔ اس میں غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ معظم کون سا ہے؟'' ماہ نور نے غور سے تصویر کی جانب دیکھا۔ ملک جلال اور مسز ملک کے سامنے دو بچے تھے۔ قد میں تقریباً برابر

ہی تھے۔ ایک بچے کے چہرے پر عجیب سا وقار اور ٹھہراؤ تھا جو اسے اپنی عمر سے زیادہ ظاہر کر رہا تھا جبکہ دوسرا بچہ خوبصورتی میں تو پہلے والے سے قدرے کم تھا لیکن اس کے چہرے پر پھیلی حساسیت اور معصومیت کا ایک انوکھا امتزاج تھا۔ ماہ نور نے بغور دونوں تصویروں کو دیکھا۔ دونوں میں مشابہت نہیں تھی۔ پر جانے کیا بات تھی کہ ماہ نور کو وہ دونوں مانوس سے لگ رہے تھے۔ یوں جیسے اُس نے پہلے بھی انہیں کہیں دیکھا تھا۔ اُس نے اُس بچے کی تصویر پر انگلی رکھ دی جس کے چہرے پر ٹھہراؤ اور وقار تھا۔

''ہاں بالکل ٹھیک پہچانا۔ یہ معظم ہے اور دوسرا والا غازی۔'' آنٹی کی آنکھوں میں اُن دونوں کے لیے اس قدر محبت اور ممتا تھی کہ بے اختیار ماہ نور کے دل نے گواہی دی کہ یہ عورت جو تشنگی کے پل صراط سے گزر رہی ہے۔ اپنے وجود کے ٹکڑے اپنے بیٹے سے ضرور ملے گی۔ جلد یا بدیر۔

پھر مسز ملک اُسے باری باری ساری تصاویر دکھاتی گئیں۔ جانے کیوں اس خاندان کے افراد اُسے شناسا شناسا سے لگ رہے تھے۔ پھر کافی دیر تک آنٹی اپنی ازدواجی زندگی' بچوں کی شرارتوں اور معصومیت کے قصے سناتی رہیں۔ آج طویل مدت کے بعد جیسے انہوں نے اپنے دل میں رکھی ہوئی ہر بات' ہر راز طشت از بام کر دیا تھا۔ ان کے چہرے کے غیر معمولی جاذب نظر نقوش اطمینان کے رنگوں سے مزین ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں ایک سکون سا اُتر آیا تھا۔ ماہ نور سمجھ رہی تھی' جان رہی تھی کہ یادیں تو بوجھ کی مانند ہوتی ہیں۔ انسان تنہائی میں ان یادوں سے پیار بھی کرتا ہے اور ان کے بوجھ سے تھکاوٹ بھی محسوس کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی تو ایسا ہو جو ان یادوں کا آدھا بوجھ بانٹ لے۔ کرب و اذیت اور سرور و خوشی کے لمحوں کو شیئر کرے۔ آج تک مسز ملک تنہائی کی قید میں تھیں۔ ہر رشتے کی موجودگی کے باوجود انہوں نے کبھی رشتوں کو دُکھوں کا آسرا نہیں سمجھا۔ یہ رشتے تو بس نمائشی ہوتے ہیں۔ آپ خوش ہیں' ہنس رہے ہیں تو سب آپ کے ساتھ ہیں۔ جہاں آپ کی آنکھ میں آنسو جھلملائے وہیں ساتھ سہارے چھوٹ جاتے ہیں۔ مسز ملک نے ان رشتوں سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ اپنی تنہائی اور اکیلا پن خود اپنی ذات پر جھیلا تھا۔ اسی لیے کبھی اپنے زخم کسی کو دکھانے کی کوشش نہیں کی لیکن ماہ نور میں انہیں جانے کیا نظر آیا تھا کہ اپنی کتابِ زیست کا ورق ورق اُس پر یوں کھول دیا تھا کہ کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہی تھی اور ماہ نور کو اس وقت اپنے آپ پہ حیرت ہو رہی تھی کہ بھلا مجھ میں ایسا کیا ہے جو مسز ملک نے مجھ پر اس قدر اعتماد کیا۔

☆............☆............☆

گھر آتے ہی ماہ نور نے اماں کو اپنے اور ملک معظم کے مابین ہونے والی گفتگو سنا ڈالی تھی۔ اماں کچھ گومگو کی کیفیت میں تھیں۔ ماہ نور اکثر رات کا کھانا ملک لاج میں ہی کھا لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی گھر کے سب افراد کمرے میں چٹائی بچھائے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ البتہ ماہ نور یونہی

اماں کے پاس بیٹھی تھی اور اُن سے دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھی۔

''لیکن بیٹا تمہارے خیال میں کیا یہ مناسب ہوگا؟'' اماں پوچھ رہی تھیں وہ اماں کے محسوسات کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ آج تک وہ کبھی کسی کے احسانوں کے زیرِ بار نہیں رہی تھیں۔ دوسرا اس گھر کو چھوڑنے کا تصور بھی ان کے لیے انتہائی مشکل تھا۔

''اماں میں نے ملک صاحب سے بات کی تھی لیکن یہ تجویز انہی کی دی ہوئی ہے کہ اس طرح ان کی ماما کی زیادہ بہتر دیکھ بھال ہوگی۔''

''لیکن نور بیٹا میں پھر بھی کہتی ہوں کہ ایک بار اور اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔'' اماں جانے کیوں اس قدر پس و پیش سے کام لے رہی تھیں۔ شاید وہ ملک معظم کی ظاہری جاہ و دولت سے زیادہ مرعوب ہوگئی تھیں۔

''آپی..... چپکے چپکے کیا باتیں ہو رہی ہیں..... ہمیں بھی تو پتہ چلے۔'' شاہین جو کافی دیر سے نور اور اماں کے مابین ہونے والی کھسر پھسر دیکھ رہی تھی' بولی۔

''کچھ نہیں شاہین..... بس شفٹنگ کے سلسلے میں بات کر رہی تھی اماں سے۔''

''شفٹنگ..... مگر کہاں؟'' شاہین گہری دلچسپی کا مظاہر کرتے ہوئے ذرا قریب ہوتے ہوئے بولی۔ اس کی بات سن کر ماہین' راہین اور گڈو بھی متوجہ ہوگئے۔

''جہاں میں کام کرتی ہوں اسی کوٹھی میں۔''

''کوٹھی میں۔'' ماہین پُراشتیاق انداز میں گویا ہوئی۔

''آپی..... کیا وہ کوٹھی بہت بڑی ہے؟ کیا اُس میں بہت سارے کمرے ہیں؟'' یہ گڈو تھا۔

''ہاں گڈو..... اس میں بہت سارے کمرے ہیں۔''

''آپی..... کیا وہاں مور بھی ہیں؟'' معصوم ماہین کے پوچھنے پر سب ہی کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ آ گئی۔

''بے وقوف..... آپی کسی کوٹھی کے بارے میں بتا رہی ہیں چڑیا گھر کے بارے میں نہیں۔'' گڈو نے اپنی دانست میں اُسے شرمندہ کیا۔

''ارے بیٹا۔ بھلا اسے کیا خبر.....'' اماں نے منہ بسورتی راہین کو قریب بٹھا کر چمکارتے ہوئے کہا۔

''بس آپی اب سوچنا بند..... جلدی سے شفٹ کریں۔ ہم بھی تو دیکھیں کہ کوٹھی میں رہنے والوں کے کیا ٹھاٹ ہوتے ہیں۔ پھر ہم بھی اپنی سہیلوں کو اپنے گھر لا سکیں گے۔'' شاہین کی بات سن کر ماہ نور نے ایک گہری نگاہ اُس پر ڈالی۔

''شاہین..... ہمارا گھر کسی لحاظ سے بھی کسی سے کم نہیں۔ گھر وہی ہے جہاں سکون ہے' آرام ہے' جہاں ہمارے بچپن کی یادیں ہیں' ہمارے ابو جی کی پیاری پیاری باتوں کی بازگشت ہے۔ وہ ہمارا گھر نہیں ہے' دوسروں کا ہے۔ کسی کی چیز خواہ کتنی ہی قیمتی اور خوبصورت ہو' چند دن مستعمل رہنے کے بعد ہماری نہیں ہو سکتی' اسی کی رہے گی۔ ہمارا گھر کل بھی یہی رہے گا اور آج بھی یہی ہے۔'' ماہ نور کے سمجھانے پر شاہین خاموش سی ہوگئی۔ ماہ نور شاہین کے خیالات سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شاہین اونچے خواب دیکھنے کی عادی ہے لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا کہ اس کے خوابوں کو تعبیر دے سکے۔ اس کی خواہش ضرور تھی کہ اس کی بہنیں جس چیز کی خواہش کریں وہ انہیں مل جائے اور اس کے لیے کوشاں بھی رہتی تھی لیکن کچھ چیزیں اس کے اختیار میں نہیں تھیں۔

''آپی ہم دوسرے گھر کب جائیں گے؟'' ماہین نے پوچھا۔

''بس ایک دو دن میں چلے جائیں گے۔''

''آپی میرا سکول تو دور ہو جائے گا۔ میں پھر وہاں سے سکول کیسے آیا جایا کروں گا۔'' گڈو پریشانی سے بولا۔

''ارے گڈو..... کوئی مسئلہ نہیں تم تینوں کو شرفو چاچا سکول چھوڑ بھی دیا کریں گے اور واپس گھر بھی لے جایا کریں گے گاڑی پر۔'' ماہ نور کے جواب پر ماہین اور گڈو تو خوشی کے مارے اُچھلنے لگے۔

''آہا..... پھر تو بہت مزہ آئے گا۔'' بچوں کی معصوم آنکھوں میں خوشی کا تاثر دیکھ کر چند لمحے کو ماہ نور کے دل میں بے حد سکون محسوس کیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد شاہین نے برتن سمیٹے اور راہین نے صحن میں بستر بچھا دیے۔ اماں عشاء کی نماز کے لیے اُٹھ گئیں۔ ماہ نور سارے دن کی تھکی ہوئی تھی۔ اُس نے فوراً اپنا بستر سنبھال لیا۔ ماہین اور گڈو بھی اپنے اپنے بستروں پر لیٹے۔ ایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ ہی دیر بعد گھر بھر پر ایک سکوت سا طاری ہوگیا۔ سب سو چکے تھے۔ سوائے اماں کے جو ہاتھ میں تسبیح لیے صحن میں ٹہل رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں یہ گھر چھوڑنے کو ان کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اندر ہی اندر جیسے کچھ کٹ رہا تھا۔ جس کی اذیت وہ اپنی روح پر محسوس کر رہی تھیں لیکن انہیں یہ گھر چھوڑنا تھا۔ تین جوان خوبصورت بچوں کی ماں تھیں وہ۔ اب تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ کم تو نہیں تھا۔ ان کی پھول جیسی بچی کملا گئی تھی حالات کی کڑی دھوپ کی تمازت تلے اور انہیں اب ان سب کو بچانا تھا۔ بستر پر جانے سے پہلے انہوں نے اپنے دل کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کر کے منا لیا تھا۔

صبح ماہ نور کی آنکھ چڑیوں کے چہچہانے کی آواز سے کھلی۔ اُس نے گردن موڑ کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ سامنے تخت پوش پر اماں حسبِ معمول قرآن پاک پڑھنے میں مشغول تھیں۔ اُس نے بھی اُٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ جتنی دیر میں وہ نماز سے فارغ ہوئی۔

اماں رسوئی میں جا چکی تھیں۔ اُس نے سب کو جگایا۔ شاہین اور راہین نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد سب بستر تہہ کیے۔ ماہ نور نے ماہین اور گڈو کو سکول کی تیاری میں مدد دی اور ابھی وہ سب ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نامانوس دستک پر ماہ نور قدرے حیران سی ہوئی۔

''گڈو...... جاؤ دیکھو جا کر کون ہے؟'' گڈو بھاگا بھاگا دروازے کی طرف گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آیا۔

''آپی باہر کوئی بھائی آئے ہیں آپ کا پوچھ رہے ہیں۔''

''بھائی......؟ میرا پوچھ رہے ہیں؟ کون ہو سکتا ہے؟'' ماہ نور حیران حیران سی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کی جھری سے باہر دیکھا تو دروازے پر شہسوار کو دیکھ کر کسی قدر متعجب ہوئی۔ ہلکا سا دروازہ کھولا۔

''آپ......؟''

''وہ اصل میں شرفو چاچا کے گاؤں سے تار آیا تھا وہ کل شام دو دن کی چھٹی لے کر گاؤں چلے گئے ہیں تو بھائی نے آپ کے پک اینڈ ڈراپ کی ذمے داری مجھے سونپی ہے۔'' شہسوار اس وقت خاصے مہذب انداز میں گویا تھا۔

''آپ اندر آ جائیں۔'' ماہ نور نے اخلاقاً کہا۔

''نہیں...... دیر ہو رہی ہے آپ نے ابھی تیار ہونا ہے۔''

''جی نہیں میں تیار ہوں۔''

''تو پھر چلیے......''

''ایک منٹ میں اماں کو بتا کر آتی ہوں۔'' ماہ نور نے جا کر اماں کو بتایا اور چادر اچھی طرح اوڑھ کر باہر آ گئی۔ اس کے دروازے سے نکلتے ہی شہسوار نے بھی قدم آگے بڑھا دیے۔

''شرفو چاچا گئے تو خیریت سے ہی ہیں ناں؟''

''جی نہیں ان کی بیوی دمے کی مریضہ ہے۔ اکثر جب وہ زیادہ بیمار ہو جاتی ہے تو تار دے کر شرفو چاچا کو بلوا لیتی ہے۔'' وہ دونوں آگے پیچھے قدم اُٹھاتے بڑھ رہے تھے۔ چاچے ساجے کی دکان حسبِ معمول کھلی ہوئی تھی اور تھڑے پر اوباش لڑکوں کا جمگھٹا بھی حسبِ معمول لگا ہوا تھا۔ آج غیاث بھی اُن میں موجود تھا۔ ماہ نور کے لیے یہ سوچ ہی شرمندگی کا باعث تھی کہ اگر آج ان لڑکوں نے شہسوار کے سامنے اُسے کچھ کہہ دیا تو کیا عزت رہ جائے گی اس کی۔ وہ کان لپیٹ کر شہسوار کی قدرے اوٹ لیے تیز تیز قدم اُٹھانے لگی کہ یکدم سیٹی کی آواز نے جیسے اس کے کانوں کے پردے ہلا دیئے۔

''اوئے کیا پیس ہے......؟''

''ارے پیس نہیں ڈیکوریشن پیس کہو۔'' امجد نے بائیں آنکھ دبا کر شہسوار کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے میری جان...... ہم مر گئے تھے کیا؟''

''ویسے یار ہمارے جیتے جی ایسا ہوتا تو ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ بے چاری کو جانے کتنا تلاش کرنا پڑا ہو گا۔'' عامر طنزیہ نظروں سے ماہ نور اور شہسوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''او یار ذرا سنبھل کے... دیکھ نہیں رہے سوٹڈ بوٹڈ باڈی گارڈ کو۔'' امجد نے ارشد کو ٹہوکا دیا۔

یہ سب ایک سے بڑھ کر ایک بے ہودہ گوئی میں مصروف تھے لیکن غیاث بالکل خاموش تھا۔ اس کی گہری سرخ آنکھوں میں حسبِ معمول ماہ نور کو دیکھ کر سرخی بڑھ گئی تھی۔ ماہ نور کو بھدے ہاتھوں اور سرخ آنکھوں والے اس شخص سے شروع دن سے ایک خوف اور چڑ سی تھی اور دن بدن اس میں اضافہ ہی ہوا تھا کمی نہیں۔ وہ محلے کے ان اوباش لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا سو ماہ نور کی نفرت اس کے لیے بھی اتنی ہی تھی جتنی باقی سب کے لیے۔

''یار بڑے اونچے خواب دیکھ رہے ہو آج کل کہیں منہ کے بل نہ گر جانا۔''

''ارے ہم سے حسینوں کو ایک چھوڑ دس دس ہاتھ تھامنے کو آ جائیں گے۔ تم ہماری فکر میں کیوں دُبلے ہوئے جا رہے ہو؟''

''یار وہ جیسے اونچے لمبے جسے میں کیا کمی تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' ارشد کی گھٹیا بات سن کر یکدم شہسوار کے بڑھتے قدم تھم گئے۔ ماہ نور نے چونک کر اُسے رُکتے دیکھا تھا۔ ایک سرسراتا ہوا خیال اس کے ذہن میں کنڈلی کا مار کر بیٹھ گیا۔

''اگر یہاں جھگڑا ہو جائے تو یہ اچھا نہیں ہو گا۔'' اُس نے شہسوار کے چہرے پر پھیلتی خشونت اور غصہ دیکھ لیا تھا۔

''سر آپ چلیں...... پلیز۔ خوامخواہ ان گھٹیا لوگوں کے منہ نہ لگیں۔''

''لیکن ماہ نور یہ کس قدر اخلاق سے گری ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے کم از کم انہیں سمجھ تو لینے دیں۔''

''رہنے دیں سر ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ یوں بھی ہم ایک دو دن میں یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے۔ دفع کریں۔ جھگڑا مول لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' ماہ نور نے اُسے سمجھا بجھا کر آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا لیکن اس کے وجود کے اندر غصے کے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ جانے کس طرح اُس نے اُن کی یہ سب بے ہودہ گوئی برداشت کر لی تھی۔ وہ دونوں گلی کی نکڑ سے مڑ کر گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

''صدقے میں جانواں اُنھاں توں...... جنھاں دیاں بانکیاں ٹوراں۔ ساڈے نال غصے

رہیندے ۔ تے درشن دیندے ہوراں ۔ ۔'' امجد نے تان کھینچی۔ شہسوار کے قدم ٹھٹک کر رُک گئے۔

امجد کے خاموش ہوتے ہی ارشد نے بآواز بلند اگلا مصرع کہا۔

'' سانوں انھاں جیہا نئیں لبھنا ں۔ انھاں نوں لکھ کروڑاں۔ صدقے میں جانواں ۔ ۔ ۔''

''سر چلیں ۔ چھوڑیں آپ چلیں بات بڑھے گی۔''

''مگر ماہ نور ۔ ۔ مجھے پوچھنے تو دو کہ انہیں تکلیف کیا ہو رہی ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے سر کچھ بھی پوچھنے کی۔ میں نے شام کو واپس اسی محلے میں لوٹ کر آنا ہے اور پھر صبح یہیں سے گزر کر جانا ہے۔ یہ روز کا معمول ہے کتے بھونکتے ہیں' بھونکتے رہیں' آپ چلیں۔''

شہسوار ایک نظر قہر بار ان پر ڈالتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔

''ماہ نور' کتے بلاوجہ بھونکیں تو اینٹ اُٹھا کر ان کے سر میں دے مارنا چاہیے۔'' شہسوار نے عقبی دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''پاگل کتے ہیں یہ۔ ان پر اینٹ اُٹھائیں گے تو کاٹنے کو بھی آ سکتے ہیں۔'' ماہ نور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شہسوار نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گیا۔

''کتا اگر پاگل ہو جائے تو اس کی کھوپڑی میں بندوق کی گولی اتار دینی چاہیے۔'' شہسوار نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ترش لہجے میں کہا۔ اس نے چابی اگنیشن میں لگائی ہی تھی کہ ایک تیز آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اُترتی چلی گئی۔

''اوہ بابو جی چار دن کی چاندنی ہے یہ' کوئی دو دن اس چاندنی میں ہمیں بھی نہانے کے لیے دے دو ۔ ول بانٹ کر کھانا نہانا چاہیے۔'' باقی کے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ شہسوار کی رگوں میں لاوا سا کھول کر اُٹھا اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ماہ نور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ شہسوار نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور گاڑی سے نیچے اُتر گیا۔

''سس سر '' ماہ نور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے مگر شہسوار اس کی آواز کہاں سن رہا تھا۔

''بابو جی ہمیں اپنا بھائی ہی سمجھو۔'' امجد نے قریب آتے ہوئے شہسوار کو مخاطب کیا۔ ''حصہ دے دو معاملہ جیسے مرضی ہے طے کر۔ '' شہسوار نے جاتے ہی امجد کو گردن سے دبوچا اور دھکیلتا ہوا لے گیا۔

''اوہ ۔ او ۔ ب' بھائی!'' امجد نے بولنا چاہا تو شہسوار نے اس کے منہ پر ٹکر مار دی۔ امجد کو یوں لگا جیسے کسی نے پورا پہاڑ اُٹھا کر اس کے منہ پر مار دیا ہو۔ ایک ہی ٹکر نے اس کی ناک کی ہڈی کا سرمہ بنا دیا تھا۔ باقی کے سب اپنی جگہ مبہوت کھڑے تھے شاید انہیں ایسی صورت حال کی توقع نہیں

تھی۔ پھر سب سے پہلے غیاث ہی وحشت انگیز عالم میں ان کی طرف لپکا تھا۔ غیاث کو شہسوار کی طرف بڑھتے دیکھ کر ماہ نور کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔

شہسوار پر تو جیسے جنون طاری تھا۔ جب تک دوسرے شہسوار پر جھپٹے اتنے میں شہسوار نے امجد کا منہ سر ایک برابر کر دیا تھا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ آنکھ سے نچلی ہڈی پر ضرب کی شدت سے نیلاہٹ پھیل گئی تھی۔

غیاث نے آگے بڑھ کر عقب سے اس کی گردن کے گرد بازو حائل کر دیا جبکہ عامر اور ارشد نے جھٹکے سے امجد کی گردن شہسوار کی آہنی گرفت سے آزاد کرائی۔ امجد جو منہ پر پڑنے والی چوٹوں سے کافی نڈھال ہو گیا تھا۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑے وہیں بیٹھ گیا۔ غیاث نے شہسوار کو اُٹھا کر پٹخ دیا مگر شہسوار نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے قریب آتے غیاث کو گریبان سے پکڑا اور اس کے منہ پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ غیاث کی وحشیانہ ٹکر سے شہسوار کے ہونٹ پھٹ گئے۔ اتنے میں عامر اور ارشد آ کر شہسوار سے گتھم گتھا ہو گئے اور اندھا دھند اُسے پیٹنے لگے۔ وہ ان کے حملوں سے بچاؤ کی کوشش بھی کر رہا تھا اور جوابی وار بھی کر رہا تھا مگر وہ ایک تھا اور مقابل تین!

اچانک اس کی دائیں ران میں جیسے کسی نے دہکتے ہوئے انگارے بھر دیئے تھے۔ ہزار ضبط کے باوجود بھی بے ساختہ اس کے حلق سے کربناک چیخ آزاد ہو گئی۔

امجد جس کے حواس قدرے مجتمع ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی چوٹوں کا انتقام لینے کی غرض سے شہسوار کی ران میں چاقو اتار دیا تھا۔ اس نے پلٹتے ہوئے لاشعوری طور پر کہنی گھمائی تھی جو عامر کی گردن پر پڑی اور وہ دار نے بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

اس مار دھاڑ اور شور شرابے سے کئی گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھل گئے تھے اور کھلے ہوئے دروازے اور کھڑکیوں سے جھانکتی متجسس آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے اردگرد محلے کے کافی افراد کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ تمام محلے کے افراد انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے کوئی بھی ان کے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑانا چاہتا تھا۔ سو سب خاموش تماشائی بنے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ شہسوار کی ٹھوڑی اس کے ہونٹوں سے بہتے خون سے تر ہو چکی تھی اور ٹانگ سے بھل بھل بہنے والے خون نے اس کے پیروں کو بھی تر کر دیا تھا۔ امجد تو شہسوار کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا تھا جبکہ ارشد اور عامر بھی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے شہسوار کی طرف بڑھتے ہوئے غیاث کو بازوؤں سے تھام کر روکنے کی کوشش کی مگر اس کے دماغ پر جنون و وحشت نے پنجے گاڑ رکھے تھے۔

''چھوڑو مجھے ۔ ۔ خبیث کے بچو!'' غیاث دھاڑا۔

''غیاث...... نکل چلو...... چاقو لگ گیا ہے اسے۔ مسئلہ ہو جائے گا۔ ہمارا یہاں رُکنا ٹھیک نہیں۔'' عامر نے تیز لہجے میں کہا۔

''ایسی کی تیسی مسئلے کی...... پہل اس نے کی ہے۔'' غیاث نے آگے کی جانب زور لگایا اور شہسوار کی پسلی میں لات جما دی۔ شہسوار جواب تک کھڑے رہنے کی کوشش کر رہا تھا' لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اسے گرتے دیکھ کر عامر اور ارشد' غیاث کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے قریبی چھوٹی گلی میں داخل ہو گئے۔

ماہ نور بوکھلا کر شہسوار کی طرف بڑھی جس پر اب نیم غشی سی طاری تھی۔

''شہسوار...... پلیز...... پلیز آنکھیں کھولیں۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ کر اُسے جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ چہرے پر ندامت کے تاثرات رقم تھے کہ وہ اس حال کو محض اس کی وجہ سے پہنچا تھا۔ اس کے پکارنے پر ایک لحظہ کو شہسوار نے آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں دھند اُتر آئی تھی از خود اس کی بوجھل پلکیں آنکھوں پر جھک آئیں۔

''آؤ بھائی...... دیکھیں ذرا اسے۔''

''ابے رُک...... دماغ تو نہیں خراب تیرا۔''

''بے چارہ بہت زخمی ہے۔ اسے ہسپتال تو پہنچاؤ۔''

''کیا ضرورت پڑی ہے۔ پولیس کیس ہے ایسے ہی کوئی مصیبت ہمارے گلے پڑ جائے گی۔''

''ہاں...... ہاں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔''

''ابھی پولیس آتی ہی ہو گی ہٹو یہاں سے کہیں ایسا نہ ہو ہم ہی دھر لیے جائیں۔'' ماہ نور نے جھلملاتی آنکھیں اُٹھا کر دیکھا جو چند افراد کھڑے تھے اب وہ ایک ایک کر کے وہاں سے ہٹنے لگے تھے۔ گلی میں اس کے گھر کی طرف جیسے ہی نظر اُٹھی تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک اُٹھے۔ سامنے سے اماں' اسد اور اسد کی امی تینوں کو حیران پریشان تیز تیز اپنی طرف آتے دیکھ کر جیسے وہ حوصلہ ہی ہار بیٹھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس تک پہنچ آئے۔

''نور بچی...... یہ...... یہ سب کیا ہے؟'' اماں کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔

''اماں...... وہ...... وہ'' ماہ نور کی زبان تو جیسے اس کا ساتھ ہی چھوڑ گئی تھی۔ آنکھوں سے لگاتار بہتے آنسوؤں کے درمیان وہ محض ہکلا کر رہ گئی۔

''خالہ جان یہ وقت باتوں کا نہیں ہے۔ یہ بہت زخمی ہیں اور انہیں بروقت ہسپتال پہنچانا چاہیے۔'' اسد جھک کر شہسوار کو دیکھ رہا تھا۔

''اماں...... وہ۔ وہی لڑکے جو روزانہ تنگ کرتے ہیں اُنہی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔'' ماہ نور کی

آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اماں شہسوار کی طرف متوجہ تھیں۔

''خالہ جان آپ آپی کو لے کر گھر جائیں۔ میں انہیں ہسپتال پہنچاتا ہوں۔'' اسد نے جھک کر شہسوار کو اُٹھایا اور اس طرف بڑھ گیا جہاں شہسوار کی گاڑی کھڑی تھی۔

''نہیں اسد...... ہم...... ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔'' ماہ نور نے بھی تیزی سے اسد کے پیچھے قدم بڑھائے۔ اماں اور اسد کی امی نے پل بھر کو سوچا اور پھر وہ بھی ساتھ ہو لیں۔

☆............☆............☆

ہسپتال کے ایک پرائیویٹ روم میں ماہ نور، اماں، اسد کی امی اور شہسوار موجود تھے۔ شہسوار کو خون دیا جا رہا تھا، بیرونی چوٹوں سے اس کا کافی خون ضائع ہو گیا تھا۔ اس کا اور ماہ نور کا بلڈ گروپ ایک ہی تھا۔ سو اس وقت دونوں برابر بستروں پر پڑے تھے۔ ایک طرف بنچ پر اماں اور اسد کی امی خاموش نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ارے بہن! یہ آج کل کے لڑکے بھی بس جان ہتھیلی پہ رکھے ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر چاقو چھریاں نکال لیتے ہیں۔ ذرا جو ان کو خیال ہو کہ مائیں کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھا کر پالتی ہیں' بڑا کرتی ہیں۔ خدا جانے کس ماں کا بچہ ہے ظالموں نے کیا حال کر دیا۔'' اسد کی امی کے لہجے اور انداز میں ہمدردی اور نرمی تھی۔

''آپا! بڑا اچھا خاندان ہے یہ۔ ماں ان کی فالج کی مریضہ ہے، یہ اپنی ماہ نور اُسی کے پاس ہوتی ہے۔ بڑا اچھا بچہ ہے یہ۔ خدا زندگی اور صحت دے اسے۔'' اماں کے چہرے پر بھی محبت بھرے تاثرات بکھرے ہوئے تھے۔ ماہ نور خاموشی سے لیٹی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''ویسے بہن ہوا کیا تھا......؟'' اسد کی امی، اماں کے قریب سرک کر رازداری سے بولیں۔

''بس کیا بتاؤں آپا' بھائی اشرف اور بھائی یوسف کے بیٹے اللہ جانے ہم سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہیں۔ ہم نے تو آج تک انہیں کوئی تکلیف نہیں دی۔ اللہ بخشے ماہ نور کے ابا کو۔ سارے محلے والوں سے بنا کر رکھی ہوئی تھی انہوں نے۔ اُن کے جانے کے بعد سوچا تھا کہ محلے والے پرانی آنکھوں کا لحاظ رکھیں گے لیکن انہوں نے تو ہماری راہوں میں پتھر ڈال دیئے۔ جی بھر کے ذلیل کر دیا ہمیں۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنے کو ایک چار دیواری بنا گئے تھے وہ۔ یہ لوگ وہ بھی ہم سے چھیننے کی کوشش کرتے رہے اور ہم نے بھی یہ سوچ کر کہ عزت سے جو چار دن زندگی کے ہیں گزار لیں' یہ گھر یہ محلہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔'' اماں کے چہرے پر اُداسی اور لہجے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔

''ارے بہن تو کیا تم محلہ چھوڑ رہی ہو...... کہاں جا رہی ہو؟'' اسد کی امی کے لہجے میں تجسس تھا اور آنکھیں بڑی تیزی سے ماہ نور کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''ماہ نور کے باس نے ہی کوئی جگہ کرائے پر دلوائی ہے۔'' اماں دانستہ اُن سے اصل بات چھپا گئیں۔ اس لیے کہ اسد کی امی لاکھ اچھی سہی لیکن تھی تو عام سی عورت۔ جانے وہ اس بات کو کس رنگ میں لیتی کہ ماہ نور کو اس کے باس نے اپنے گھر میں رہنے کی پیشکش کی ہے۔

''اچھا.....!!'' انہوں نے اچھا کو کافی لمبا کیا۔ اسد کافی دیر سے گیا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں ڈھیر سارے فروٹ کے ساتھ جوس کے ڈبے اور بھنے چھلکے سنیکس بھی تھے۔ اُس نے وہ سب چیزیں لاکر ٹیبل پر رکھیں۔

''آپی۔ آپ نے جو مجھے ملک صاحب کے فون نمبر دیئے ان سب پر میں نے باری باری ٹرائی کیا۔ گھر میں تو کسی ملازمہ نے ریسیو کیا۔ اُس سے پھر میں نے کوئی بات نہیں کی۔ آفس میں وہ پہنچے نہیں تھے البتہ موبائل پر مل گئے۔ کہیں جا رہے تھے اب یہیں آ رہے ہیں۔'' اسد بات ختم کر کے شہسوار کے بیڈ کے قریب آ گیا۔

''بھائی کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''اب تو کافی بہتر ہے پہلے سے... اسد یہ بھائی اشرف اور یوسف کے بیٹے کرتے کیا ہیں؟'' اسد کی امی نے پوچھا۔

''کیا کرتا ہے ایک کی تو ویڈیو کی دکان ہے۔ سارا دن آوارہ لوفر لفنگے دکان میں جمع رہتے ہیں اور چاچا یوسف کے دونوں بیٹے بیکار ہیں۔ وہ بھی اچھے کردار کے نہیں ہیں۔ کیوں پوچھ رہی ہیں آپ؟''

''بیٹا انہی نے تو جھگڑا کیا ہے۔''

''کون امجد، ارشد وغیرہ نے۔''

''ہاں... ویسے آپا میں غیاث کو بھلا مانس سمجھتی تھی لیکن وہ بھی اُنہی کی طرح ہی نکلا۔'' اماں کے کہنے پر اسد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''کون... غیاث بھائی...''

''ہاں... وہ لڑکے روزانہ میری بچی کو تنگ کرتے رہے اُس پر آوازے کستے رہے اور وہ بھی اُن میں شامل رہا۔''

''آپی کیا غیاث بھائی نے بھی کبھی ان لڑکوں کی طرح چھچھوری حرکت کی؟'' اسد ماہ نور کی طرف پوری طرح متوجہ تھا۔ ماہ نور کی آنکھوں کے سامنے بھدے ہاتھوں پیروں والا اونچا لمبا شخص گھوم گیا۔ جس کی سرخ آنکھوں سے وہ ہمیشہ ڈرتی تھی۔ ان آنکھوں میں چھپی وحشت اور گرسنگی اُسے خوفزدہ کر دیا کرتی تھی لیکن اُس نے آج تک ماہ نور کو تنگ نہیں کیا تھا۔ نہ اُس پر آوازیں کسی تھی۔ بس

وہ اس کو صرف اس لیے برا سمجھتی تھی کہ وہ اسے ایک ٹک دیکھے چلا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی ناتمام آرزوئیں اُسے کوفت میں مبتلا کر دیتی تھیں۔

''نہیں..... لیکن وہ بھی اُنہی کے ساتھ تھا۔'' ماہ نور کی دھیمی آواز میں کی گئی بات پر اسد نے غیر محسوس طریقے سے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

دروازے پر پھر کھٹکا ہوا اور اگلے ہی لمحے دروازے میں سے ڈاکٹر سلیم اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے پہلے تو ماہ نور کو سوئی کی قید سے آزاد کیا۔ پھر شہسوار کی طرف بڑھ گئے۔

''مس آپ کچھ دیر آرام کریں۔ کوئی جوس وغیرہ پی لیں تاکہ چکر نہ آئیں۔'' انہوں نے پلٹ کر ماہ نور کو ہدایت کی تو اسد نے تیزی سے آگے بڑھ کر جوس کا ایک ڈبہ ماہ نور کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''نہیں اسد میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' ماہ نور تھکے تھکے سے انداز میں بولی۔

''آپی ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کریں اور فٹافٹ پی جائیں۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ماہ نور نے گہری مگر محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ مسلسل اُن کے ساتھ تھا۔ اس کی محنت اور توجہ قابلِ قدر تھی۔ ماہ نور کے دل میں یکدم اس کے لیے ڈھیروں پیار اُمڈ آیا۔

''یہ واقعی اس قابل ہے کہ میری بہن کی زندگی کا ساتھی بن سکے۔'' اس کے دماغ میں سوچ کی لہر ابھری اور جیسے وہ شانت ہو گئی۔

''اوہ ینگ مین... جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ تم جیسے نوجوانوں کو یوں بستر پر لیٹا دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے مجھے۔'' ڈاکٹر سلیم خوشدلی سے شہسوار کے ساتھ ہمکلام تھے۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شہسوار نہ صرف ہوش میں آ چکا تھا بلکہ کسی حد تک فریش بھی لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر سلیم کی بات پر اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ چمکی۔ اسی دم دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور حواس باختہ سے ملک معظم روم کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کی گہری چھاپ تھی، انداز میں گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ تھی۔ انہوں نے طائرانہ نگاہوں سے روم کا جائزہ لیا اور تیزی سے شہسوار کے بیڈ کے قریب پہنچ گئے۔

''شاری... شاری کیا ہوا؟ یہ سب کیا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب؟'' ان کی زبان سے لفظ جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے اور نگاہیں شہسوار کے سارے وجود کو ٹٹول رہی تھیں۔ اس کا پھٹا ہوا ہونٹ سوج چکا تھا البتہ زخم سے رستے خون کو صاف کر کے دوائی لگا دی گئی تھی۔ ران پر لگنے والا زخم بہت گہرا تھا۔ ڈاکٹر نے ٹانکے لگانے کے بعد بینڈیج کر دی تھی۔

''بھائی' میں ٹھیک ہوں اب آپ پریشان نہ ہوں۔'' شہسوار نے ملک معظم کے چہرے پر پھیلے گھبراہٹ کے تاثرات دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں کہا۔

"شاری کون لوگ تھے وہ؟ کیا چاہتے تھے تم سے؟"

"بھائی وہ مس ماہ نور کے محلے دار ہیں۔ صبح میں ان کو لینے گیا تو آتے ہوئے انہوں نے ہم پر آوازیں کسیں۔" شہسوار سانس لینے کو رُکا تو ڈاکٹر سلیم آگے بڑھے۔

"ملک صاحب ابھی یہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئے۔ آپ پلیز ابھی فی الحال کچھ مت کہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن مجھے تفصیل معلوم ہونی چاہیے۔ مس ماہ نور آپ بتائیں کیا ہوا تھا؟" انہوں نے اپنا روئے سخن ماہ نور کی جانب موڑا جو چہرے پر ندامت کے تاثرات لیے سر جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے وہی مجرم ہو۔ ملک معظم کے پوچھنے پر اُس نے سر اُٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔

"سر...... وہ وہی تھے جن کے بارے میں آپ کو بتایا تھا۔ وہ لڑکے روزانہ ہی تنگ کرتے تھے لیکن میں اور شرفو چاچا خاموشی سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ کبھی پلٹ کر ان کی گھٹیا باتوں کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ آج بھی انہوں نے وہی کیا۔ میں نے ان کو روکنے کی بہت کوشش کی سر لیکن یہ اُن سے لڑ پڑے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور یہ اکیلے۔ اُن میں سے ایک کے پاس چاقو تھا جس نے انہیں زخمی کیا۔" جوں جوں ماہ نور تفصیل بتا رہی تھی۔ ملک معظم کے انتشار خون میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ چہرے کے جاذب نظر نقوش تناؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک نظر شہسوار کی طرف دیکھا۔

"نام کیا ہیں ان کے؟"

"سر۔ عامر، ارشد، امجد اور غیاث۔"

"ہوں عامر، ارشد، امجد اور غیاث۔" انہوں نے زیر لب دُہرایا۔ پھر شہسوار کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہاتھ میں پکڑے موبائل پر چند نمبر پریس کیے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتے شہسوار نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔

"نہیں بھائی...... پلیز ایسا مت کریں۔ یہ مسئلہ میں خود ہینڈل کر لوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

"اطمینان......؟ شاری بچپن سے لے کر آج تک تمہارے وجود پر ایک خراش تک نہیں دیکھی اور آج...... آج ان سب کی وجہ سے تم یوں بستر پر پڑے دکھائی دے رہے ہو۔ میرے دل کو کیسے سکون مل سکتا ہے۔" ملک معظم کے لہجے میں عجیب سی وحشت سرائیت کر گئی تھی۔ ماہ نور اور شہسوار دونوں کے لیے ان کا رویہ نیا اور انوکھا تھا۔ آج تک شہسوار نے انہیں اس انداز میں اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ غصے کی زیادتی سے ان کے چہرے کا نرم تاثر مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔

"بھائی لیکن آپ اُسے فون مت کریں۔" شہسوار نے ملک معظم کی طرف ملتجی نظروں سے

دیکھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں ملک معظم کال کرنے لگے تھے اگر وہ ایکشن میں آ جاتا تو ان چاروں کی ہڈیاں تک نہیں ملنی تھیں۔ ملک معظم نے جھنجھلا کر شہسوار کی سمت دیکھا۔ دُکھ، غصہ، جھنجھلاہٹ، کوفت۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گئے۔ شہسوار کی آنکھوں میں جانے کیا تاثر تھا جس نے انہیں روک دیا تھا۔

"بھائی...... میرا مسئلہ مجھی تک رہنے دیں۔ آپ خود کو اس میں انوالو مت کریں اور زیادہ پریشان بھی نہ ہوں۔ میں زخمی ہوں لیکن زندہ ہوں۔ آپ سب کے درمیان ہوں۔ پھر اس قدر سٹریس لینے کی کیا ضرورت ہے؟" ماہ نور نے حیرت سے شہسوار کی بات سنی تھی جس قسم کا وہ شخص تھا اور جس طرح کی اس کی نیچر تھی اُس سے اتنے تحمل اور بردباری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کمرے میں موجود تمام افراد نے نہایت خاموشی سے ان کی بات سنی تھی۔ اسد کی امی یعنی آمنہ خالہ اس تمام عرصے میں ملک معظم کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ملک معظم کے لیے ستائش اور پسندیدگی تھی۔ آنکھوں کے سامنے حنا کا چہرہ گھومنے لگا اور وہ روایتی ماؤں کی طرح اپنی بیٹی کے مستقبل کے خواب دیکھنے لگیں۔ ماہ نور بستر سے اُٹھ کر اماں کے قریب آ بیٹھی تھی۔

"اماں...... اب گھر چلیں۔"

"ہاں بچی چلتے ہیں۔" اماں چادر سنبھالتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ملک معظم جو شہسوار کے پاس بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ماہ نور اور اماں کو اُٹھتے دیکھا تو بول اُٹھے۔

"مس ماہ نور...... کیا آپ جا رہی ہیں؟"

"جی سر......" ماہ نور نے مختصر جواب دیا۔

"کہاں......؟ اپنے گھر یا ہماری طرف؟" ان کے سوال پر ماہ نور خاموش سی ہو گئی۔

"آپ ایسا کریں باہر میری گاڑی کھڑی ہے۔ ڈرائیور سے کہیں کہ وہ آپ کو ہمارے ہاں چھوڑ کر آپ کی امی وغیرہ کو آپ کے گھر ڈراپ کر دے۔" بات کرتے کرتے ان کا دھیان اسد پر پڑا جو دروازے کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"تم......؟"

"سر...... یہ اسد ہے۔ اس نے ہماری یہاں آنے تک مدد کی اور اس وقت سے لے کر اب تک یہ مسلسل ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہے۔" اسد کی بجائے ماہ نور نے جواب دیا۔

"ہوں...... بہت بہت شکریہ تمہارا ینگ بوائے۔" ملک معظم نے خصوصی طور پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ حقیقی معنوں میں وہ اس کے شکر گزار تھے جس نے بروقت شہسوار کو ہاسپٹل پہنچا دیا۔ ورنہ اگر دیر ہو جاتی تو خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

شہسوار اب کافی بہتر تھا۔ وہ بیڈ کی بیک سے سر ٹکائے نیم دراز تھا۔

''او کے سر! پھر ہمیں اجازت...'' اسد کم عمر ہونے کے باوجود اعتماد کی دولت سے مالا مال تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا وہ ملک معظم کے قریب آ کر رُکا اور ہاتھ اُن کی طرف بڑھایا۔ اُنہوں نے گرمجوشی کے ساتھ اسد سے مصافحہ کیا۔ پھر اُس نے شہسوار سے ہاتھ ملایا اور اُسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اسی کے پیچھے پیچھے ماہ نور، اماں اور آمنہ خانم نے بھی قدم بڑھا دیئے۔

☆......☆......☆

آج پتہ نہیں کیا بات تھی لیکن اس کا دل بہت دُکھا ہوا تھا۔ نہ گلی کے دوستوں کے ساتھ سکون تھا نہ گھر میں نہ باہر۔ وہ کچھ دیر صحن کے کچے فرش پر بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر کمرے کے دروازے کی کنڈی کھولی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہی تین ٹانگوں والی کرسی' جھلنگا چارپائی' دیوار سے اُکھڑا ہوا پلاسٹر اور ایک خاموش تصویر' کمرے کا نصیب کبھی نہیں بدلے گا۔ اُس نے اُچٹتی نگاہوں سے پورے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر جھلنگا چارپائی پر دراز ہو گیا۔ سامنے لگی ہوئی تصویر بھی اُسے آج ٹوٹی پھوٹی دیوار کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔

''کس قدر بدنما ہو تم بالکل سفید کپڑے پر دھبے کی صورت۔ تم ماں ہو ناں جانتی ہو ماں کیا ہوتی ہے؟ جس کی آغوش میں سمٹ کر سارے دُکھ بھول جایا کرتے ہیں لیکن تم کیسی ماں ہو۔ جب میں روتا ہوں تو تم بے چین نہیں ہوتی دور کھڑی دیکھتی رہتی ہو۔ راتوں کو مجھے نیند نہیں آتی اور تم مجھے اپنی آغوش سے دور رکھتی ہو۔ تمہاری آنکھوں میں میرے لیے پیار نہیں ہوتا' نہ تمہارے ہونٹ میرے لیے دعا کے طالب ہوتے ہیں۔ تم تو ان ماؤں سے بھی بدتر ہو جو رات کے اندھیرے میں اپنا گناہ چھپانے کی خاطر اپنے پھول سے بچوں کو کوڑے کے ڈھیروں کی زینت بنا دیتی ہیں' جن کو ساتھ لے کر گئی تھی کیا وہ مجھ سے زیادہ حقدار تھے۔ ایک بار زندگی میں صرف ایک بار خود مجھ سے میں اوپر والے سے دعا کروں گا وہ مجھے تم سے ضرور ملائے گا۔ پھر میں تم سے پوچھوں گا میرا قصور کیا ہے؟ کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟ ایسا کیوں کیا؟'' آج اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ بلک رہا تھا کسی بچے کی طرح لیکن ہمیشہ کی طرح اسے خاموش کروانے والا تسلی دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی آواز سن کر خالہ کلثوم نے دیوار کے پار سے جھانکا لیکن وہ کمرے میں تھا انہیں دکھائی نہیں دیا تو وہ برقع اوڑھ کر اس کے گھر چلی آئیں۔ صحن سے ہوتی ہوئی جب وہ کمرے کے دروازے تک پہنچیں تو اندر کا منظر دیکھ کر دہل سی گئیں۔ وہ رو رہا تھا دیواروں کے ساتھ ٹکریں مار رہا تھا۔

''غازی... غازی رُک جاؤ بیٹا کیا کر رہے ہو؟ مت کرو ایسا !!'' خالہ کلثوم نے آگے بڑھ کر بمشکل اُسے روکا۔

''خالہ تم کیوں آ جاتی ہو؟ کیوں نہیں مرنے دیتیں مجھے؟'' اُس نے اپنی بے تحاشا سرخ آنکھوں میں غصہ بھر کر خالہ کلثوم کی طرف دیکھا تھا۔

کیا نہیں تھا ان آنکھوں میں رنج' ملال' بے بسی' کچھ کھو دینے کا احساس۔ خالہ کلثوم نے اُس سے نظریں چرا کر سامنے لگی تصویر کو بغور دیکھا۔

''غازی تم نے آج تک کبھی مجھے بات نہیں کرنے دی۔ تمہاری ماں بے قصور تھی بیٹا۔ ایک بار تفصیل سن لو پھر خود انصاف کر لینا۔'' سرخ آنکھوں میں بے چینی کی لہریں بڑھنے لگیں لیکن ہونٹ جانے کیسے آج خاموش ہو گئے تھے۔ شاید آج وہ سب جان لینا چاہتا تھا اُسے بھی تو اپنی روح پر پڑے آبلوں کا علاج کرنا تھا جو اب ناسور بننے لگے تھے۔

''غازی تمہیں تمہارے باپ نے یہی بتایا ہے ناں کہ تمہاری ماں تمہارے بہن بھائیوں کو لے کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ گھر کی ساری جمع پونجی بھی لے گئی اور تم دونوں کو فٹ پاتھ پر رُلنے کے لیے چھوڑ دیا۔'' خالہ کلثوم نے ایک لمحے کو رُک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن جواب میں نہ ہاں نہ ناں نہ تائید کی نہ تردید۔ بس خاموش نگاہوں سے خالہ کی طرف دیکھے گیا۔

''لیکن بیٹے حقیقت کچھ اور تھی۔ تمہاری ماں ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور تمہارا باپ بھی۔ رابعہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی جبکہ جلال بالکل ان پڑھ تھا لیکن تمہارے نانا نانی نے اس کی ظاہری شخصیت اور دولت دیکھ کر اس کے ساتھ رابعہ کا رشتہ کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چند سال تک دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہے لیکن اصل تباہی کی بنیاد اس وقت پڑی جب تمہارے باپ نے ٹیکسٹائل مل لگائی۔ جس آدمی کو اُس نے اپنا پارٹنر بنایا' وہ بظاہر تو اس کا دوست تھا لیکن بہ باطن وہ ایک خود غرض انسان تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے کاروبار میں گھپلے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی ساتھ تمہارے باپ کو بھی جوئے اور شراب جیسی بدعادات پر لگا دیا۔ حالات مخدوش ہوتے چلے گئے۔ اتنے امیر کبیر گھرانے کو وسیع عریض کوٹھی بیچ کر اس تنگ و تاریک گھر میں آنا پڑا لیکن شاباش ہے تمہاری ماں پر اس کی زبان سے اُف تک نہ نکلا۔ پھر جب اخراجات بڑھے اور آمدنی نہ رہی تو تمہارے باپ نے بات بات پر رابعہ کی دُھنائی کرنی شروع کر دی۔ اس پر بھی اُس نے کبھی حرف شکایت نہ کہا۔ یہاں تک کہ اُسے لوگوں کے کپڑے سینے پڑے۔ تمہیں اور ظوی کو شیٹ میٹل ورکشاپ میں کام کرنا پڑا لیکن ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ اللہ جانے کس بات پر تمہارے باپ کو غصہ آیا کہ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اُسے دھن کر رکھ دیا۔ اس پر بھی بس نہیں کی' اور رابعہ کو طلاق دے دی۔

اس کے بعد وہ یہاں کس رشتے سے رہ سکتی تھی۔ وہ بچوں کو لے کر ہمارے گھر آ گئی۔ یہ اُس دن کی بات ہے جس دن تم سکول سے سیدھے ورکشاپ چلے گئے تھے۔ گھر واپس نہیں آئے تھے جب کافی دیر انتظار کے بعد بھی تم نہ آئے تو رابعہ روتی دھوتی بچوں کو لے کر اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی۔ اس کے بعد اُس نے تم سے ملنے کی کوشش کی لیکن اسی رات تمہارا باپ تمہیں لے کر خدا جانے کہاں چلا گیا۔ پورے دس سال بعد تم دوبارہ یہاں آئے تو وہ بھی باپ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد۔ بیٹا میں تو تمہاری واپسی کی منتظر تھی کہ شاید تم نے رابعہ اور اپنے بہن بھائیوں کو تلاش کر لیا ہو لیکن تم آئے تو تنہا تھے اور دل میں اپنی نیک سیرت ماں کے لیے ایسی نفرت کا بیج بو کر کہ میں حیران پریشان رہ گئی۔ پھر میں نے وقتاً فوقتاً تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن تم نے سننا گوارا نہ کیا۔ تمہاری ماں قصوروار نہیں تھی۔ وہ گو اس گھر سے مر کر ہی نکلی لیکن جلال نے جو داغ اس کے ماتھے پر لگایا تھا وہ اس قدر گہرا تھا کہ اس کی تمازت سے رابعہ کی روح تک جھلس ہو گئی تھی۔ غازی! بیٹے مجھے یقین ہے تمہاری ماں اب بھی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔"

خالہ کلثوم تھک کر خاموش ہو گئیں اور اس کی طرف دیکھنے لگیں جس کی ہمیشہ سے سرخ آنکھوں میں کرب و اضطراب کی لالی بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ خاموش تھا شاید اس کے پاس کہنے بولنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ ہاں اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کی ذات کے سمندر میں طوفان آ چکا ہے۔ پچھلے پندرہ سال اُس نے جس شخصیت سے جی بھر کر نفرت کی اُسے برا بھلا کہا۔ پچھلے پندرہ سال سے جس ذات کی وہ نفی کرتا رہا۔ اس کی خاموش تصویر کو طنز و تشنیع کا نشانہ بناتا رہا وہ بے قصور تھی ..... اس کا کوئی دوش نہیں تھا۔ کیا یہ کم کرب آگیں بات تھی۔ ہر گزرتا لمحہ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا مذاق اُڑا کر گزر رہا ہو۔ اُسے یوں لگا کمرے میں موجود ہر چیز' صحن میں' دنیا میں اور کائنات میں جو کچھ بھی ہے سب اُس پر ہنس رہے ہیں۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ اس نے ایک قابل نفرین ہستی سے نفرت کر کے اپنے آپ کو انسان تسلیم کروا لیا ہے لیکن آج وہ خود کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھ رہا تھا۔ وہ اُس محبت بھری آغوش کو کیوں بھول گیا؟

کیوں بھول گیا اندھیری راتوں میں جب وہ خوف سے چلا اُٹھتا تھا تو نرم گرم مامتا بھرے بازوؤں میں سمٹ کر غافل ہو جاتا تھا۔ آج اُسے یاد آ رہا تھا کہ پچھلے پندرہ سال اُس نے جس ماں سے شدید نفرت کی تھی وہ ماں تو سب سے زیادہ اُسی کو چاہتی تھی۔ اسے کانٹا بھی چبھ جاتا تو وہ تڑپ اُٹھتی تھی۔ اُس نے کئی بار اپنے باپ کو ماں کے ساتھ زیادتی کرتے دیکھا تھا۔ پھر اُس نے کس طرح باپ کی جھوٹی باتوں کا یقین کر لیا۔

اُس نے جھکا ہوا سر اُٹھا کر دیکھا۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ خالہ کلثوم جانے کب اُٹھ کر چلی گئی

تھیں۔ وہ چارپائی سے اُٹھا اور دھیمے قدموں سے چلتا ہوا تصویر کے قریب آ گیا۔ "ماں میں دعا کرتا ہوں کہ تیرا میرا زندگی میں کبھی سامنا نہ ہو۔" کچھ دیر وہیں کھڑا رہنے کے بعد وہ نیچے بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر آج وہ اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا جیسے اُس دن رویا تھا جب اُسے یہ خبر ملی تھی کہ اس کی ماں اُسے چھوڑ کر چلی گئی ہے لیکن وہ آنسو ماں کی جدائی میں نہیں بہے تھے بلکہ ہر بہتا آنسو اس کے دل میں ماں کی نفرت کو بڑھا رہا تھا۔ آج اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو دھیرے دھیرے اس کے دل پر جمی نفرت کی کائی اتار رہے تھے۔ اس کا دل رفتہ رفتہ آئینے کی طرح شفاف ہو رہا تھا اور اب اس آئینے میں ماں کی بے داغ شبیہ اُبھر رہی تھی وہ ماں جو سراپا محبت تھی وہ ماں جو محبت کے قابل تھی۔

☆..........☆......   ☆

"رابعہ..... یہ دیکھو میں نے نو مار کے لیے فراک سیا ہے۔ کیسا ہے؟" زری نے رابعہ کے سامنے سرخ رنگ کا فراک پھیلا دیا۔

"بہت اچھا ہے میری رانی کو بھی بنا دینا....."

"کیوں نہیں..... زندگی بہت مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ جلالی کو جب سے نشے کی لت پڑی ہے تب سے گھر بھر کا سسٹم اپ سیٹ ہو گیا ہے۔ مجھے تو جو ٹینشن ہوتی ہے سو ہوتی ہے لیکن ان کے رویے کا بچوں پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ نومی تو خیر بڑا ہے لیکن غازی بالکل خاموش سا ہو گیا ہے۔ اُس دن جلال نے بے وجہ رانی کو تھپڑ لگا دیا اس کے بعد تو غازی بالکل ہی جیسے کٹ سا گیا ہے ہم سب سے۔ اُس سے باپ کا بگڑا ہوا رویہ نہیں برداشت ہو رہا۔" رابعہ کی آنکھوں میں اُداسی ڈیرہ جمانے لگی تھی۔

"رابعہ..... ایسے تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"مشکل ہو جائے گی نہیں..... مشکل ہو گئی ہے۔ خیر مجھے چھوڑو تم اپنی سناؤ چھوٹی راہی کیسی ہے؟ کل تو بہت سخت بخار تھا اُسے۔"

"اب ٹھیک ہے۔ اچھا رابعہ میں اب چلتی ہوں شام میں چکر لگاؤں گی۔ بچیوں کے کچھ کپڑے وغیرہ بنے ہیں چلتی ہوں۔"

"اچھا....." رابعہ اسے رخصت کرنے دروازے تک آئی۔ ابھی دروازہ بند کر کے پلٹی ہی تھی کہ دھاڑ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور ملک جلال اندر داخل ہوئے۔

"کون تھی یہ عورت؟"

"یہیں قریب ہی رہتی ہے اکثر آتی جاتی ہے کیوں؟" رابعہ نے پلٹ کر پوچھا۔ ملک جلال نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں میں نے کہا تھا کہ محلے میں کسی کے ساتھ بنانی نہیں ہے۔ پھر یہ آئے روز عورتیں کیوں آتی جاتی ہیں؟ تم محلے میں مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو۔ دکھانا چاہتی ہو لوگوں کو کہ میں تم پر ظلم کر رہا ہوں''

''نہیں جلال ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو آج تک آپ کی کوئی بات ان عورتوں سے نہیں کی۔''

''جھوٹ بولتی ہے حرافہ ... یہ اردگرد رہنے والی عورتیں ہمارے گھر کی ہر بات جانتی ہیں۔ ان کے مرد مجھے راستہ روک روک کر سمجھاتے ہیں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے ویسا نہیں کرنا چاہیے۔''

''جلال! میں نے ان سے کچھ نہیں کہا میرا یقین کریں۔ گھر میں اٹھنے والی آوازوں سے اندازہ لگا کر وہ خود سے کہہ دیتے ہوں گے۔ میں تو آج تک آپ کی ہر بات کو خود پر سہا ہے۔ اپنے ماں باپ سے بھی کبھی نہیں کہا۔''

''تو اب جا کر کہہ دو ... وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ تمہارے بھائیوں کی تو یوں بھی میرے سامنے سٹی گم ہو جاتی ہے۔'' ان کی بات پر رابعہ نے سر اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ ہیں ... مجھے لگتا ہے جیسے تمہارا دل اب مجھ سے بھر گیا ہے۔'' جلال کی یہ بات سن کر وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''اب آپ حد سے بڑھ رہے ہیں جلال۔'' اور اس کا یہ کہنا ہی بہت تھا۔ چٹاخ کی زوردار آواز کے ساتھ جلال کا بھاری ہاتھ رابعہ کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

اسی لمحے انہوں نے چونک کر دیکھا۔ وسیع و عریض پر تعیش کمرے میں وہ تنہا ہی تھیں کوئی ان کے پاس موجود نہیں تھا۔ وہ بیڈ کی پُشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ اسی پل ماہ نور کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ ماہ نور کے عقب میں ملک معظم کو دیکھ کر وہ چونک گئیں۔

''نظومی ... تم آفس نہیں گئے؟'' انہوں نے پوچھا تو ایک لمحے کو ملک معظم خاموش ہو گئے۔ انہوں نے ایک نظر ماہ نور کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا پھر بول پڑے۔

''گیا تھا ماما۔ وہ صبح مس ماہ نور جلدی نہیں آئیں ناں اس لیے واپس آیا ہوں۔ ڈاکٹر نے آپ کی ٹریٹمنٹ سے متعلق جو نئی ڈیٹیل دی ہے اس کے بارے میں ان سے ڈسکس کرنا تھا۔ دوسرے آپ کے لیے ایک خوشخبری بھی ہے۔'' ملک معظم اپنی اندر کی کیفیت پر بمشکل قابو پاتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ یہ تو ان کا دل ہی جانتا تھا کہ ان کی روح پر ان پر کیا گزر رہی ہے لیکن وہ اپنی بیمار ماں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سو بظاہر خوشدلی کا خول چڑھا لیا تھا۔

''خوشخبری ... میرے لیے ... کیا؟''

''خوشخبری یہ ہے کہ مس ماہ نور ہماری انیکسی میں شفٹ ہو رہی ہیں۔'' ملک معظم کی بات سن کر

مسز جلال کی آنکھوں میں جیسے یک لخت سینکڑوں تارے سے جھلملا اُٹھے۔

''کیا واقعی؟'' انہوں نے ماہ نور کی طرف پیار سے دیکھا۔ جانے کیوں اس کا چہرہ مانوس سا لگتا تھا اس کے خوبصورت نقوش سے شناسائی لگتی تھی انہیں۔

''جی ہاں بالکل سچ ہے یہ۔'' آیئے مس ماہ نور ماما کی نئی رپورٹس بھی دیکھ لیں اور غذائی چارٹ بھی۔ ویسے ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ پچھلے چند دنوں میں ماما نے بہت امپروو کیا ہے۔ قوی امید ہے کہ ایک ماہ کے اندر اندر یہ تھوڑا تھوڑا چلنے لگیں گی۔'' وہ مسز جلال کے بیڈ کے دائیں طرف رکھے صوفہ پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مسز جلال دونوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔ جانے کیوں وہ دونوں انہیں اکٹھے بیٹھے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں ایک نئی سوچ اُبھری جس نے لمحے بھر میں انہیں شادمان کر دیا۔

''نظومی ...''

''جی ماما ...''

''یہ شہسوار کہاں ہے؟ صبح سے نظر ہی نہیں آیا۔''

''وہ ... وہ ماما! اپنے ایک دوست کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد گیا ہوا ہے آجائے گا ایک دو دن تک۔''

''کمال ہے بتا کر تو جاتا خیر اس کے ایگزیمز میں کتنے دن باقی ہیں؟''

''ابھی تو کوئی چھ سات دن''

''چلو تب تک آجائے گا۔ ماہ نور تم نے آج دیر کیوں کی؟''

''وہ آنٹی ... دراصل امی گھر پر نہیں تھیں، چھوٹے بہن بھائیوں کو تیار کر کے سکول بھجوایا۔ گھر کا سارا کام ختم کیا پھر آئی ہوں۔'' اس کی بات سن کر ملک معظم نے تشکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ یوں بھی اب میں اپنے کچھ کام خود کر لیتی ہوں اور زیتون نے مجھے ناشتہ کروا دیا ہے۔ دوائی بھی کھالی ہے میں نے۔''

''ماما میں آفس میں چلتا ہوں۔'' ملک معظم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''او کے بیٹا اللہ حافظ۔'' ان کے کمرے میں نکلتے ہی ماہ نور آنٹی کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''نور ایک بات بتاؤں ...''

''کیا آنٹی ... ؟''

''پتہ ہے جب تم مجھے سڑک کے کنارے بے ہوش پڑی ملی تھی اور میں محض انسانی ہمدردی کے

تحت گاڑی روک کر تم تک پہنچی تھی لیکن تمہاری صورت دیکھنے کے بعد جانے کیوں دل تمہاری طرف بے ساختہ کھنچا تھا۔ تم مجھے بہت مانوس مانوس لگی تھیں جیسے پہلے بھی کہیں ہم ملے ہوں۔ اس کے بعد میرے دل میں تم سے ملنے کی خواہش بھی پیدا ہوئی لیکن دیکھو پروردگار نے خود تمہیں ہماری دہلیز تک پہنچا دیا۔'' وہ نہایت نرم لہجے میں اُس سے گویا تھیں۔

''آنٹی کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہے۔ مجھے بھی آپ کی پوری فیملی یوں لگتی ہے جیسے ایک طویل عرصے سے میں آپ لوگوں کو جانتی ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ان چند دنوں سے پہلے میں نے آپ کو یا اس گھر کے فرد کو نہیں دیکھا تھا۔'' ماہ نور اُن کے ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی اور دھیرے دھیرے اُن کے بال بھی سلجھا رہی تھی۔ بال سمیٹنے کے بعد اُس نے ان کا متاثرہ بازو تھام لیا اور میڈیکیٹڈ لوشن لگا کر نرم ہاتھوں سے مساج کرنے لگی۔ مسز جلال کی آنکھیں بند تھیں۔ ماہ نور نے ان کے صبیح چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

''کیا نہیں تھا اس عورت میں' حسن کی دولت تو اس عمر میں بھی اس کے پاس وافر ہے۔ دولت مند تھی، تعلیم یافتہ تھی، نیک سیرت، باکردار تھی۔ پھر اتنے دُکھ اور طلاق کا داغ کیوں تھا اس کے نصیب میں۔''

''نور...... کبھی کبھی میں سوچتی ہوں جیسے میرے اندر کوئی کمی تھی۔ کوئی ایسی خامی جو دیکھنے والوں کے احاطہ بصارت میں نہیں تھی لیکن تھی ضرور جو اوپر والے کو ناپسند تھی جس کی پاداش میں مجھے اتنی تکلیف اتنی اذیت بھوگنی پڑی۔'' ماہ نور چونک۔ وہ تو جیسے اس کے ذہن کے پرت کھول کر اُن میں چھپے راز جان رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں لیکن سوچ کے دریچوں میں ماضی کی فلم سی چل رہی تھی۔

''لیکن اب میں دُکھی نہیں ہوتی پرانی باتوں پر۔ مجھے صرف غازی سے دوری تکلیف دیتی ہے اور بس میرے بچے ہی میری کل متاع ہیں۔ میں نے انہی کے لیے زندگی کی تکلیف دہ گھڑیاں گزار دیں۔ یہ سوچ کر کہ آج یہ چھوٹے ہیں لیکن کل یہ میری زندگی کی عمارت کے لیے مضبوط ستون ثابت ہوں گے اور نور' میری یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ میرے بچوں کو میرا احساس ہے انہیں یاد ہے کہ ان کی ماں نے کتنے دُکھ سہے اور میری بقیہ زندگی کے لیے یہی اطمینان کافی ہے۔'' پچھلے دنوں کی نسبت آج ان کے چہرے پر ایک اطمینان نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک مثبت تبدیلی تھی اور ماہ نور کے لیے خوشی کا باعث بھی۔

کبھی کبھی مسز ملک اسے بالکل معصوم سی بچی لگتی تھیں۔ اس کے سامنے اپنی ننھی ننھی خواہشوں اور اپنی بیتی ہوئی زندگی کے پل دُہرا کر وہ یوں خوش ہوتی تھیں گویا ہفت اقلیم کی دولت پا لی ہو۔

''آنٹی' اتنے زبردست بادل آ رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے لے چلوں آپ کو باہر؟''

''چلو...... لیکن معظم ناراض ہوگا۔''

''نہیں آنٹی گھر سے باہر نہیں لے کر جانا بس باہر لان تک جائیں گے۔ آپ بھی کمرے میں

بند رہ رہ کر تنگ آ چکی ہوں گی۔''

''ہاں یہ تو ہے اکثر معظم کہتا ہے لیکن ڈاکٹر کہتا ہے کہ مجھے وہیل چیئر پر زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہیے اگر میں سہارے کی عادی ہو گئی تو پھر دیر سے چلنا شروع کروں گی۔''

''اب ایسا بھی نہیں آنٹی۔ آپ بہت جلد ہر کام کر سکیں گی۔ یہ کوئی ایسی تکلیف نہیں جس کا مکمل علاج ممکن نہ ہو۔ بس جتنی مضبوط قوت ارادی ہو گی۔ اسی قدر جلد ٹھیک ہوں گی۔'' ماہ نور نے انہیں وہیل چیئر پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر چیئر دھکیلتی لاؤنج سے ہوتی ہوئی باہر لان میں نکل آئی۔ موسم واقعی بے حد حسین ہو رہا تھا۔ اودے اودے بادلوں نے آسمان کی نیلی چادر کو ڈھانک رکھا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نم آلود ہوا گالوں کو چھو کر ایک عجیب سی روح پرور فرحت کا باعث بن رہی تھی۔ مسز جلال کے چہرے پر خوشی اور تازگی کا تاثر دیکھ کر ماہ نور بھی بہت خوش تھی۔ اُسے لگا جیسے آج تک کی محنت اور لگن کے بعد وہ سرخرو ہو گئی ہو۔ ایک اطمینان سا اس کے دل میں سرائیت کرتا چلا گیا۔

☆......☆.........☆

''بلیک مین! الیکشن میں صرف چھ دن رہ گئے ہیں۔ کس قدر تیزی سے وہ شہسوار آگے آ رہا ہے۔ بڑے بڑے سیاستدانوں کی نظریں ہیں اُس پر اور وہ اس کا بھائی ملک معظم وہ اس کی بیک پر ہے۔ اُن کی جمہوریت سے ہی شہسوار کی پوزیشن اس قدر اسٹرونگ ہے جبکہ حماد تو کسی کھاتے میں ہی نہیں۔ پانچ لاکھ تمہیں دینے کے علاوہ میرا کتنا پیسہ اس الیکشن پر خرچ ہو چکا ہے لیکن نتیجہ وہی صفر۔'' چوہدری الیاس خشک لہجے میں بلیک مین سے مخاطب تھا۔ یقینی طور پر اس کے لیے پریشانی بنتی جا رہی تھی۔ حماد الگ اس کے کان کھائے جا رہا تھا۔ اس کے لیے تو بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ وہ حماد کو سیاست کے میدان کا بے تاج بادشاہ دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے چھوٹے لیول سے ہی اوپر پہنچا جاتا ہے۔

''چوہدری صاحب' آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں بالکل مختلف طریقے سے کام کرنے کا عادی ہوں۔ بندے کو جسمانی نہیں ذہنی اور نفسیاتی اذیت دی جائے تو وہ جرم میں بھی شمار نہیں ہوتی اور کام بھی ہو جاتا ہے۔ میں چاقو چھری اور پستول بندوق کی بجائے دماغ سے کام لیتا ہوں۔'' بلیک مین مضبوط لہجے میں بولا۔

''لیکن یار تم ایکشن کب لو گے؟ اس قدر کم دن رہ گئے ہیں۔ حماد بہت پریشان ہے کالج میں شہسوار کی ریپوٹیشن دیکھ کر۔ تم جلد از جلد کچھ کرو۔''

''چوہدری صاحب' آپ بالکل بے فکر رہیں۔ کل کا دن فیصلہ کن ہے۔ اول تو ناکامی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ایسا کچھ ہو گا بھی تو بلیک مین کے لیے ناکامی کو کامیابی میں بدلنا کوئی مشکل نہیں۔'' اس کے لہجے سے جھلکتا اعتماد چوہدری کو بھی کسی حد تک مطمئن کر گیا۔ اسی پل حماد اپنے

دوستوں کے ہمراہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ چوہدری الیاس کے ہمراہ بلیک مین کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس شخص نے پیسے تو لے لیے تھے لیکن وہ معلوم کر چکا تھا کہ کالج میں اس کی طرف سے کمپین نہیں چلائی گئی تھی۔ کسی قسم کی کوشش نظر نہیں آئی تھی۔ وہ چلتا ہوا چوہدری کے قریب آ گیا اور قریب پڑے صوفے پر بیٹھ کر کینہ توز نظروں سے بلیک مین کی سمت دیکھنے لگا۔ بلیک مین نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ اس کے چہرے اور آنکھوں میں اپنے لیے ابھرنے والے تاثرات بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن فی الوقت اُس نے اُسے نظر انداز کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

''بابا کیا کیا ہے آپ کے مسٹر بلیک مین نے؟ پوچھیں ان سے اب تک کیا کارکردگی شو کی ہے انہوں نے۔ کالج میں ہر طرف شہسوار کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ہر سٹوڈنٹ اسی کے گن گا رہا ہے۔ میرا تو کہیں کوئی نام ہی نہیں۔ کس بات کے پانچ لاکھ روپے دیئے تھے آپ نے؟'' حماد کا لہجہ کرخت سے کرخت تر ہو جا رہا تھا۔ بلیک مین نے ابرو اُچکا کر اس کی سمت دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ بس اس کی گہری نگاہیں حماد کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔

''حماد ٹھنڈے رہو...... ابھی بلیک مین سے اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ الیکشن میں ابھی چند دن ہیں۔''

''چند دن......'' حماد نے چوہدری الیاس کی بات کاٹی۔ ''چھ دن بابا صرف چھ دن رہ گئے ہیں الیکشن میں اور جانتے ہیں الیکشن کی تیاری میں کئی کئی ماہ لگ جاتے ہیں۔ جب مہینوں کی کارکردگی پٹ سکتی ہے تو پھر چھ دن میں یہ کون سے تیر مار لیں گے۔'' حماد کے لہجے میں طنز ہی طنز تھا۔ بلیک مین اب بھی صوفے سے پشت ٹکائے اطمینان و انہماک سے حماد کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے اس طرح دیکھنے سے حماد کو الجھن اور جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔ پھر جیسے اچانک ہی بلیک مین نے کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چوہدری نے پریشان نظروں سے اس کے جناتی تاثرات دیکھے۔

''گرم خون ہو...... جوان ہو اس لیے غصہ جلدی آ جاتا ہے مگر برخوردار شاید تم نہیں جانتے کہ غصہ عقل کا دشمن ہے۔ جنگ میں ہار اور جیت کا فیصلہ آخری لمحے تک نہیں ہو پاتا۔ آخر تک کوئی یہ نہیں جان سکتا کہ کون فریق جیتے گا اور کس کے مقدر میں شکست ہے۔ پھر ابھی تو چھ دن باقی ہیں۔ چھ دن تو کسی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے کافی ہوتے ہیں، یہ تو معمولی سا کام ہے۔'' بلیک مین کے بااعتماد لہجے میں ہلکی سے لچک بھی نہیں تھی۔ اُس نے ایک نظر حماد کے غیر مطمئن چہرے پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا جبکہ چوہدری پرسوچ انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اُس نے آج تک بلیک مین کو ناکام ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر یہاں ناکامی کیسے اس کا مقدر بن سکتی تھی۔

☆..........☆..........☆

ملک معظم اس وقت شہسوار کے پاس ہسپتال میں موجود تھے۔ ان کے بشرے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

''لیکن شہسوار' یکدم تم نے یہ فیصلہ کیوں کر لیا۔ جانتے ہو صرف دو دن ہیں الیکشن میں۔ تمہارے اس فیصلے کا اسٹوڈنٹس پر کیا اثر پڑے گا۔ اس طرح تو تمہاری اپنی ذات بھی ہلکی پڑ جائے گی۔''

''نہیں بھائی' میں نے فیصلہ کر لیا ہے اب اس میں رد و بدل کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''لیکن شہاری! آخر پتہ تو چلے کیوں تم نے ایسا فیصلہ۔ شاید تم نہیں جانتے کہ اس کا تمہارے کیریئر پر کتنا برا اثر پڑے گا۔ شہر کے سارے ہائی سوسائٹی کے افراد جانتے ہیں کہ ملک معظم کا بھائی ملک شہسوار کالج یونین کے الیکشن کے لیے کھڑا ہے۔ تمہاری پوزیشن کس قدر سٹرونگ ہے۔ شہر بھر میں پہچانے جا رہے ہو اس سب کے باوجود تم نے خود کو لیٹ ڈاؤن کرنے کے لیے یہ بے تکا فیصلہ کیا ہے۔'' ملک معظم کی جھنجھلاہٹ اپنے عروج پر تھی۔ پیسہ، وقت، محنت سب کچھ برباد کرنے پر تلا ہوا تھا شہسوار۔ لیکن وہ اسے اتنی آسانی سے اس فیصلے پر کیسے عمل کرنے دیتے کہ انہوں نے اس کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ ابھی تو وہ کالج میں تھا۔ کل وہ شہر کے لیے پھر صوبے کے لیے بھی الیکشن میں حصہ لے سکتا تھا لیکن اُس نے تو پہلا قدم بڑھاتے ہی گویا خود کو منزل پر پا لیا تھا۔ ایسا فیصلہ کر کے وہ نہ صرف اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا رہا تھا بلکہ ملک معظم کا ایک قیمتی خواب بھی چکنا چور کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''دیکھو شہاری! میرے بھائی۔ تم کم از کم مجھے اس فیصلے کا محرک تو بتا سکتے ہو۔ اپنا پوائنٹ آف ویو تو سمجھا سکتے ہو کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟'' وہ اُس سے اگلوانا چاہتے تھے کہ اس کے اس ارادے کے پیچھے کیا چیز کارفرما ہے۔

''بھائی ...کوئی محرک نہیں ہے اس کے پیچھے۔''

''ناممکن ...... آخری حد تک ناممکن چند دن پہلے تک تم خود بڑے پرجوش انداز میں کمپین میں حصہ لے رہے تھے۔ یونین کا صدر بننے کا خواب تھا تمہارا۔ تمہارے کہنے پر میں نے ذہن میں تمہاری خاطر لائحہ عمل بنایا تھا اور اب تم کہتے ہو کہ تم یہ الیکشن نہیں لڑو گے۔ کیا ہوا ان چند دنوں میں؟'' وہ اُسے کرید رہے تھے۔ ان کی تیز معاملہ فہم نظروں نے یہ تو پہلے ہی جان لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے ضرور لیکن ''کہاں ہے اور کیا ہے'' ان کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''بھائی...... کچھ نہیں ہوا...... آپ پلیز کوئی اور ٹاپک لے لیں۔''

''پہلے مجھے اس مسئلے پر تو سیٹسفائی کرو۔ پھر آگے چلیں گے۔'' شہسوار نے کسی قدر بے چینی اور بے بسی کے ساتھ بھائی کی طرف دیکھا اور تکیے سے نکال کر کوئی چیز انہیں تھما دی۔ یہ خاکی رنگ کا درمیانے سائز کا لفافہ تھا۔ ملک معظم نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''دیکھ لیں خود ہی..... آپ کے آنے سے صرف آدھا گھنٹہ پہلے کاؤنٹر پر جمع کروا کے گیا ہے کوئی شخص، یہ کیک اور ساتھ یہ براؤن لفافہ۔'' شہسوار اتنا کہہ کر نیم دراز ہو گیا۔ ملک معظم نے لفافے میں موجود چیز باہر نکلی۔ یہ چند تصویریں تھیں مختلف لڑکیوں کی..... شہسوار کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں.....'' ملک معظم کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ شہسوار نے انکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل رہے تھے۔

''یہ سب .....؟؟؟''

''ان تصویروں کے ساتھ ایک خط بھی ہے۔'' شہسوار کے بتانے پر انہوں نے دیکھا۔ تصویروں کے درمیان میں ایک رقعہ لکھا پڑا تھا۔ ملک معظم نے تذبذب کے سے انداز میں پہلے شہسوار کی طرف دیکھا اور پھر رقعے کی طرف، پھر انہوں نے وہ صفحہ کھول لیا۔

چھوٹے ملک صاحب!

نئی زندگی اور صحت مبارک ہو۔ نصیب دشمناں سنا تھا کہ زخمی ہو گئے تھے آپ۔ آپ کے ٹھیک ہونے کی خوشی کو ہم نے بھی سیلیبریٹ کیا ہے۔ یقیناً دیکھ کر خوشی ہوئی ہو گی آپ کو۔ کیسا لگا ہماری سیلیبریشن کا طریقہ۔ اتنی بڑی خوشی جو آپ کو ہم نے دی ہے جواب میں ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ دو دن بعد ہونے والے الیکشن سے دستبردار ہو جائیں۔ اُمید ہے کہ ہماری اس درخواست پر آپ ضرور عمل کریں گے۔ بصورت دیگر ایسی ہی خوشیاں ہم آپ کے گھر کے ہر فرد کو بانٹ سکتے ہیں اور کالج میں اشتہار بھی لگوا سکتے ہیں۔''

بلیک مین

''بلیک مین .....'' ملک معظم زیرِ لب بڑبڑائے۔ کاغذ کا ٹکڑا ان کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ دیر پہلے کی جھنجلاہٹ اور غصہ نہ جانے کہاں جا سویا تھا۔ وہ شہسوار کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔

''یہ وجہ تھی۔ اب تو جان گئے ناں آپ ..... خود بتائیں ایسی صورتِ حال میں اور کیا کرتا میں؟ مجھے یہی فیصلہ کرنا تھا صرف میری عزت کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن میں اپنے گھرانے کو اس تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ بھائی کیا میں نے غلط کیا؟''

''نہیں ..... لیکن شاری۔ کیا یہ ..... سب چوہدری الیاس نے کروایا ہے؟''

''یقیناً بھائی..... میرے الیکشن سے دستبردار ہونے کا فائدہ حماد علی الیاس کو ہے تو اسی کی

کارستانی ہے یہ۔ بہر حال بھائی..... فی الحال ہمارا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ یہ کوئی آخری منزل نہیں تھی۔ اس بار نہ سہی اگلی بار سہی ..... مواقع زندگی میں آتے رہیں گے۔ وقت گزر جائے تو اس کا بھی کوئی حل نکال لیں گے۔'' شہسوار نہایت تحمل سے گویا تھا۔ ملک معظم نے پُر سوچ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ان کے ذہن میں خط کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''اتنی بڑی خوشی جو آپ کو ہم نے دی ہے جواب میں ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ آپ دو دن بعد ہونے والے الیکشن سے دستبردار ہو جائیں۔

''بلیک مین''

بلیک مین ..... کچھ مانوس سا نام تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس صاحب نام سے آشنا تھے اور پھر جیسے وہ بُری طرح چونکے تھے۔

''بلیک مین ..... ہاں وہ بلیک مین ہی تو تھا۔'' ملک معظم کے ذہن میں وقت روزِ اول کی طرح روشن ہو گیا۔ جب انہوں نے نیا نیا کاروبار شروع کیا تھا۔ ملک ٹیکسٹائل مل میں تین افراد کے شیئرز تھے۔ ملک معظم باقی دونوں پارٹنرز کے مقابلے میں جونیئر بھی تھے اور ناتجربہ کار بھی۔ بے شک انہوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کر رکھا تھا لیکن عملی طور پر انہوں نے اس وقت تک کچھ نہیں کیا تھا۔ ان کے پارٹنرز نے انہیں جونیئر سمجھتے ہوئے کاروبار اپنے ہولڈ میں لے رکھا تھا۔ ملک معظم کا اعتماد آہستہ آہستہ مجروح کیا جانے لگا۔ کاروبار میں گھپلے ہونے لگے۔ ملک معظم ابھی پوری طرح ایڈجسٹ نہیں ہو پائے تھے، سو پریشان ہو گئے۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس مسئلے کا آخر حل کیا کیا جائے۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو انہوں نے مل کے لیگل ایڈوائزر سے رجوع کیا۔ طلحہ نیاز ایک سلجھا ہوا آدمی تھا۔ اُس نے بہت غور سے ملک معظم کی بات سنی اور یہ کہا کہ اگر اُن سے براہِ راست بات کی گئی تو وہ بدگمان ہو کر کوئی اُلٹا سیدھا قدم بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اس کا کوئی اور حل ڈھونڈا جائے کہ سانپ بھی مر جائے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پھر اُس نے ایک ایسے شخص کا موبائل نمبر ملک معظم کو دیا جو کالج اور یونیورسٹی میں طلحہ نیاز کا بہترین دوست تھا لیکن وقت نے دونوں کے درمیان ایک معاشرتی اختلاف پیدا کر دیا۔ ایک دوست اپنی تعلیم کے مکمل ہوتے پر مل کا لیگل ایڈوائزر بن گیا اور دوسرا دوست اپنی تعلیم اور ذہانت کا غلط استعمال کرتے ہوئے غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا اور کچھ ہی عرصے میں انڈر گراؤنڈ مافیا میں جانا پہچانا جانے لگا۔ ملک معظم نے موبائل پر اُس سے بات کی تھی۔ پھر وہ نہیں جان سکے کہ اُس نے کیا کیا تھا کہ دونوں پارٹنرز اپنے شیئرز ان کے حوالے کر کے یوں غائب ہوئے کہ آج تک ان کا نام و نشان تک نہ ملا۔ ملک معظم نے اُس شخص کو دیکھا نہیں تھا لیکن وہ آج تک سمجھ نہ پائے۔ وہ شخص جس کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن اپنی دنیا میں وہ ''بلیک مین'' کے نام سے پہچانا جاتا

تھا۔ وہی بلیک مین جس نے آج شہسوار کے کیریئر کو ایک بہت بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے اس شہر میں قدم جمائے تھے۔ اسی کی وجہ سے ان کی جگ ہنسائی ہونے والی تھی۔

☆............☆............☆

آج کا سارا دن مصروفیت سے کٹ گیا تھا۔ اُس نے گھڑی پر وقت دیکھا شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ یقیناً چوہدری الیاس اس وقت حویلی میں ہی موجود ہوگا۔ یہ سوچ کر اُس نے گاڑی حویلی کی سمت جانے والی سڑک پر موڑ لی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ حویلی کے پھاٹک پر موجود تھا۔ چوکیدار نے اس کی گاڑی پہچان کر مستعدی سے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی پورچ میں آن رُکی۔ بلیک مین نے ڈیش بورڈ پر سے چھوٹا سا بیگ اُٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ مردان خانے پر موجود دونوں سکیورٹی گارڈز نے آج کوئی حیل و حجت نہیں کی لیکن دونوں کی آنکھوں میں اس کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات ہلکورے لے رہے تھے۔ بلیک مین انہیں نظرانداز کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی چوہدری کی نظر سب سے پہلے اُس پر پڑی۔ وہ بے تابی سے اُٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔

''بلیک مین...... میرے دوست کمال کر دیا تم نے...... بلامقابلہ ہی فاتح بنا دیا ہمارے بیٹے کو۔'' اُس نے آگے بڑھ کر بلیک مین کا ہاتھ تھام لیا، خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اُس نے بُری طرح ہونے والی شکست کو جیت میں بدل ڈالا تھا۔ کمرے میں اس وقت چوہدری الیاس اور حماد کے علاوہ ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص بھی موجود تھا جو بہت گہری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ بلیک مین آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ حماد کے چہرے پر حیرت کے تاثرات کے ساتھ ساتھ ندامت بھی تھی اور نادم وہ اپنے چند روز پہلے کے رویے پر تھا۔

''ویسے بلیک مین حیرت کی بات ہے صرف ایک دن پہلے معجزہ ہو گیا۔ وہ خود دستبردار ہو گیا۔''

''بابا پورے کالج میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ اسٹوڈنٹس حیران پریشان ہیں کہ آخر شہسوار کو ایسی کیا پڑی تھی کہ صرف ایک دن پہلے وہ میرے حق میں دستبردار ہو گیا۔ ٹیچرز بھی پریشان ہیں بلکہ اس کے چند دوستوں کا کہنا ہے کہ لازمی طور پر ہم نے اسے پریشرائز کیا ہوگا جو وہ عین وقت پر پیچھے ہٹ گیا۔''

حماد خوشی خوشی تفصیل سنا رہا تھا۔ بلیک مین بس عام سی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا گویا موجودہ سچویشن سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ کمرے میں موجود چوتھا شخص بہت عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بلیک مین یہ سب ہوا کیسے؟ کس طرح وہ پیچھے ہٹ گیا؟ تم نے ایسا کیا حربہ استعمال کیا کہ وہ پیچھے ہٹ گیا؟''

''چوہدری صاحب میرا ایک اصول ہے۔ میں آم کھانے کو دیتا ہوں لیکن پیڑ نہیں گننے دیتا۔ آپ کو کیا چاہیے؟''

''میں سمجھا نہیں......'' چوہدری اتنا بھی نادان نہیں تھا کہ سمجھ نہ سکتا کہ بلیک مین کے کہنے کا اصل کیا ہے لیکن وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

''مطلب یہ کہ میرا طریقہ کار ہے۔ میں دوسروں کو اس میں شریک نہیں کرتا۔ آپ کے لیے اہمیت اس بات کی ہونی چاہیے کہ آپ کا کام ہو گیا۔ میرا معاوضہ مجھے دے دیجیے۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں بھئی...... ابھی لو۔'' چوہدری اُٹھ کر اُس کمرے سے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں بریف کیس تھا۔ اُس نے بریف کیس میز پر رکھ کر کھولا اور لاکھ لاکھ روپے کی پانچ گڈیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔

''گن لو...... پورے پانچ لاکھ ہیں۔''

''میں اعتماد اور بھروسے پر کام کرنے کا عادی ہوں۔ دوسروں کے کاموں کے لیے اپنی ساری کوششیں اور لگن بروئے کار لاتا ہوں۔ اس لیے مجھے یقین ہوتا ہے کہ مجھے دھوکا نہیں دیا جائے گا۔ آج تک کبھی ایسا ہوا تو نہیں لیکن اگر کبھی کسی نے مجھے دھوکا دیا تو پھر وہ زندگی بھر کسی دوسرے کو دھوکا دینے کا سوچے گا نہیں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے نوٹوں کی گڈیاں اُٹھا کر بغیر گنے چھوٹے سے بیگ میں رکھ لیں۔

''چوہدری صاحب...... ان کا تعارف تو کروائیں۔'' سوٹڈ بوٹڈ شخص نے جو نہایت دلچسپی سے انہماک سے ان دونوں کے درمیان ہونے والا مکالمہ سن رہا تھا۔ دھیرے سے چوہدری سے پوچھا۔

''یہ بلیک مین ہے۔ آج تک میں نے جو بھی ناممکن کام اس سے کہا اس نے ممکن کر دکھایا۔ پچھلے دنوں میں جس مسئلے پر شدید الجھن اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس نے محض چار دنوں میں اس مسئلے کو حل کر دیا۔'' چوہدری صاحب کے جواب پر اُس شخص نے بلیک مین کی طرف دیکھا۔ بلیک مین کو اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سی شاطرانہ چمک نظر آئی تھی۔ اُس نے ایک گہری نظر اُس پر ڈالی۔

''بلیک مین' کیا معاوضہ لے کر قتل بھی کر سکتے ہو؟'' وہ شاید دیکھنا چاہتا تھا کہ بلیک مین کتنے پانی میں ہے۔

''میں قتل کسی جواز کی صورت میں کرتا ہوں معاوضہ لے کر نہیں۔'' بلیک مین نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا اور آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔

''او کے چوہدری صاحب میں چلتا ہوں۔''

''پھر کب آؤ گے؟'' چوہدری کے پوچھنے پر اس کی گھنی مونچھوں سے چھپے عنابی لب دھیرے

سے مسکرا اُٹھے۔

''جب آپ نے یاد کیا۔'' اُس نے جواب دیا اور جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ ایک دو قدم چل کر جانے اُسے کیا یاد آیا کہ اُس نے یکدم پلٹ کر اُس شخص کو دوبارہ غور سے دیکھا۔

''چوہدری صاحب!'' بلیک مین نے چوہدری الیاس کو مخاطب کیا۔ ''آپ نے میرا تو بائیوڈیٹا تفصیلاً بتا دیا۔ ان کا تعارف نہیں کروایا آپ نے۔''

''یہ سرفراز علی ہیں...... حال ہی میں لندن سے آئے ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان میں کچھ ضروری کام نمٹانے کی غرض سے۔''

''سرفراز علی...... لندن......'' ذہن میں جیسے پن سی چبھی تھی۔ ''لندن... سرفراز علی۔'' بلیک مین کے دماغ میں انہی دو لفظوں کی تکرار جاری ہو گئی۔ اس کے قدم جیسے زمین کے ساتھ بندھ گئے تھے۔ نہ آگے جا رہے تھے، نہ پیچھے جانے کیوں اسے لگ رہا تھا جیسے یہ نام اور شخصیت کچھ مانوس سی ہے۔

''کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہو گئے؟''

''کوئی بات نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی دن وقت نکال کر ان سے تفصیلی ملاقات کی جائے۔'' اس کے لہجے میں جانے کیا تھا جس نے چوہدری کے ذہن میں خطرے کا الارم بجا دیا۔ وہ چلا گیا تھا۔ چوہدری کی آنکھیں بیرونی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ بلیک مین فالتو بات کرنے کا عادی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ایسی بات کرتا تھا جس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد ہو۔ جانے سرفراز علی میں اُس نے ایسا کیا دیکھا تھا کہ جس کے باعث وہ اس سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ فی الحال چوہدری کے ذہن میں کوئی بات نہ آئی تو اُس نے اپنا رخ سرفراز علی کی طرف کر دیا۔ وہ بھی چوہدری کی طرح ورطہ حیرت میں تھا۔

''اس بندے کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟'' کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا تھا۔

''خبر نہیں۔'' چوہدری نے کندھے اُچکائے۔

''یہ شخص کیا کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے؟'' سرفراز علی کے انداز میں تجسس تھا۔

''اس کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ انڈر گراؤنڈ ورلڈ کا چلتا پرزہ ہے یہ۔ کوئی کام اس کے لیے مشکل نہیں۔ ناممکن کا لفظ اس کی زندگی کے صفحے پر کہیں درج نہیں۔''

''ہوں۔'' سرفراز علی نے ہنکارا ابھرا۔ اس شخص کی ذات اس کے لیے گہری دلچسپی کا باعث بن گئی تھی۔ ممکن ہے آگے چل کر وہ اس کا دست راست ثابت ہو۔ سرفراز علی کو یہاں کے لیے ایسے ہی چند افراد کی ضرورت تھی۔ اُس نے ذہن میں ایک فیصلہ کیا اور اُس پر مطمئن ہو کر چوہدری کے ساتھ

باتوں میں لگ گیا۔

☆..........☆..........☆

علی الصبح دھڑ دھڑایا جانے والا دروازہ اماں کے دل کو دہلا گیا۔ ایک ہی پل میں واہموں کے جانے کتنے ہی ناگ ان کی سوچوں سے سرسرانے لگے۔ دھیمے قدم اُٹھاتی وہ دروازے کے قریب چلی آئیں۔ کچھ گھبراہٹ بھی تھی کہ اتنی صبح صبح کون ہو سکتا ہے۔

''کون...؟'' ہلکی سی آواز میں انھوں نے پوچھا۔

''خالہ... خالہ دروازہ کھولیں......'' اسد کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر اماں نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔

''کیا ہوا...؟'' وہ پریشان سی اُس کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا تھا۔

''غضب ہو گیا خالہ وہ عامر، ارشد، امجد کو کسی نے قتل کر دیا۔ غیاث بھائی کے بائیں کندھے میں گولی لگی ہے انہیں پولیس ابھی ہسپتال لے کر گئی ہے۔''

''یا اللہ۔ یہ کیا ہو گیا؟'' اماں پریشان سی کمرے کی طرف بڑھیں۔ ماہ نور وغیرہ سو رہی تھیں۔ اماں نے ماہ نور کو جگا کر تھوڑی بہت تفصیل بتائی اور چادر اوڑھ کر اسد کے ہمراہ گھر سے نکل آئیں۔ پورے محلے میں قیامت صغریٰ کا سا سماں تھا۔ محلے کے تمام افراد چاچا اشرف اور چاچا یوسف کے گھر کے باہر کھڑے تھے۔ محلے کی عورتیں ان کے گھروں کے اندر موجود تھیں۔ دونوں گھروں سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''یہ کیسے ہوا اسد بیٹا؟'' اماں نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اسد سے پوچھا۔

''پتہ نہیں...... صحیح تفصیل کا تو پتہ نہیں غیاث بھائی سے اتنا ہی پتہ چلا کہ کوئی سیاہ پوش تھا اونچا لمبا۔ جس نے گولیاں چلائیں۔ سوئے اتفاق عامر غیاث بھائی کے گھر پر موجود تھا۔ وہ تو موقع پر ہی ختم ہو گیا البتہ غیاث بھائی کو گولی مارتے ہوئے نشانہ کچھ خطا ہو گیا اور وہ معجزانہ طور پر بچ گئے وگرنہ محلے سے تین کے بجائے چار جنازے اُٹھتے۔''

''تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟''

''کوئی پتہ نہیں خالہ...... ویسے اس طرح کے لوگوں کے دشمن تھوڑے نہیں ہوتے۔'' وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے چاچا اشرف کے گھر کے قریب پہنچ گئے۔ اماں گھر کے اندر داخل ہوئی۔ عامر کی لاش کو صحن کے بیچوں بیچ رکھا گیا تھا۔ ارد گرد عورتوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ خاندان کی عورتیں رونے دھونے میں مصروف تھیں جبکہ محلے کی عورتیں ایک ایک دو دو ٹولیاں بنائے سرگوشیوں میں باتیں بنانے

میں مصروف تھیں۔ ان کے دلوں میں جوانمرگی کا افسوس نہیں تھا بلکہ وہ اس کے قتل کی وجوہات پر غور و فکر کر رہی تھیں۔ اماں گھر کے اندر داخل ہوئیں تو قریب ہی بیٹھی ہوئی عورتوں نے انہیں دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''ارے آپا کیا بتاؤں کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ لڑکیاں ہیں کہ بے نتھے بیل کی طرح ادھر ادھر منہ مارتی پھرتی ہیں۔ کیا چاند جیسی صورت اور جوانی تھی۔ ڈائن کی وجہ سے خاک میں مل گئی۔''

''ارے بہن... ہوا کیا تھا یہ تو بتاؤ ذرا؟''

''ارے کیا بتائیں بھرے محلے نے دیکھا دو دن پہلے جھگڑا ہوا تھا۔ اس لڑکی کی وجہ سے۔ اُسی لڑکے نے مروا دیا ساروں کو۔''

''کون لڑکی؟''

''ارے وہی جو پولیس تھانوں کے چکر کاٹتی پھرتی ہے۔ خدا جانے صبح صبح کہاں منہ مارنے جاتی ہے، آدھی رات کو گھر میں گھستی ہے اللہ کی ماری ایسی لڑکیوں پر۔ کتنوں کو لے ڈوبی۔'' زہر میں بجھے الفاظ بھالوں کی صورت اماں کے سینے میں اُترتے چلے گئے۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ پیروں میں سے جان نکلتی چلی گئی۔ انہوں نے بمشکل ایک دو قدم آگے بڑھ کر دیوار کا سہارا لیا۔ بجھی آنکھوں سے انہوں نے سامنے کا منظر دیکھا اور منوں وزنی پاؤں گھسیٹتی گھر واپس آ گئیں۔ اُن عورتوں نے تو جیسے اماں کا دل ہی نچوڑ لیا تھا۔ کیسے ان کی مریم کی طرح پاک بچی کو بیسواؤں کی لائن میں کھڑا کر دیا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ مشکل سے اپنے گھر تک پہنچیں۔ گھر میں تقریباً سب ہی جاگ گئے تھے اور گڈو محلے کی خبر بھی گھر بھر کو بتا چکا تھا۔ سب ہی پریشان اور کچھ خوفزدہ بھی تھے۔ اماں کو دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی لیکن اماں کی حالت دیکھ کر ماہ نور اور شاہین نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں تھاما اور کمرے کے اندر لے گئیں۔ راحین بھاگ کر اماں کے لیے پانی لے آئی۔

''اماں... اماں کیا ہوا...؟'' ماہ نور کے پوچھنے پر اماں نے ہاتھ سے اُسے روکا۔ اُن کے ہونٹ یوں خشک تھے جیسے صدیوں کی پیاس پپڑی بن کر اُن پر جم گئی ہو۔ یوں جیسے زندگی بھی انہوں پانی کی صورت نہ دیکھی ہو۔ راحین نے ان کے ہونٹوں کے ساتھ گلاس لگایا۔ بمشکل دو گھونٹ پی کر انہوں نے منہ پرے کر لیا۔ ان کی حالت دیکھ کر سب بہن بھائی خاموشی سے ان کے اردگرد بیٹھ گئے۔

''اماں آخر ہوا کیا ہے؟'' کافی دیر گزرنے کے بعد شاہین نے ہمت کر کے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا۔ بس ہمارا دانہ پانی اُٹھ گیا یہاں سے۔ جن لڑکوں نے ماہ نور کو تنگ کیا تھا اُن میں سے تین قتل ہو گئے ہیں اور چوتھا زخمی ہسپتال میں پڑا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ماہ نور کو لینے کے لیے جو لڑکا آیا تھا۔ یہ اُسی کا کام ہے۔'' اماں کی بات سن کر ماہ نور کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اُسے

ملک معظم اور ملک شہسوار کے درمیان ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔

''لیکن جو حلیہ اسد نے بتایا ہے اُس سے تو یہی لگتا ہے کہ جیسے ان کا کوئی اور دشمن تھا۔ اسد بتا رہا تھا کہ اُسے غیاث نے بتایا ہے جس آدمی نے اُن پر فائرنگ کی وہ کوئی سیاہ پوش تھا، سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ لباس میں چھپا ہوا تھا۔''

اماں کی اس بات نے ماہ نور کے اندر کی دنیا تہ و بالا کر دی۔ کچھ عرصہ قبل ہونے والا واقعہ پوری جزئیات سمیت اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

''بلیک مین... کیا اس کی اُن کے ساتھ کوئی دشمنی تھی لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ سیاہ پوش کوئی اور ہو۔'' ماہ نور کے ذہن میں سرعت سے سوچیں بدل رہی تھیں۔

''نور بچی... اب اس محلے میں رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہا۔ وہاں عورتیں جو باتیں کر رہی تھیں وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوئیں۔ نور ہم بے قصور ہیں لیکن یہ بات اوپر والا جانتا ہے۔ دنیا والے تو لفظوں کے پتھروں سے زخمی کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے کہ کون ظالم ہے کون مظلوم۔ مارتے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے بولتے کی زبان نہیں میں نہیں چاہتی کہ ان زبانوں سے نکلنے والی آگ میری معصوم بچیوں کو جھلسا دے۔ ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے... چھوڑ دیں گے یہ گھر یہ محلہ...'' اماں کی بوڑھی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ ماہ نور نے آگے بڑھ کر اماں کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔

''اماں آپ دل چھوٹا مت کریں ہم چلے جائیں گے یہاں سے۔ بندوبست ہو گیا ہے پریشان نہ ہوں۔''

اماں نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کو ان آنکھوں میں ممتا اور محبت کے ساتھ ایک عجیب سی بے بسی جھلکتی نظر آئی تھی۔ اس کا دل دُکھ کر رہ گیا۔

''آپی... آپی باہر دروازے پر کوئی صاحب آئے ہیں۔ ان کے ساتھ دو تین اور بھی آدمی ہیں۔''

گڈو باہر سے تیز تیز قدم اُٹھاتا اندر آیا تھا۔

''یاالٰہی خیر...'' اماں کا دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔ جانے ذلت و خواری انہی کے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی۔ انہوں نے پریشان نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا تو ماہ نور نے ہولے سے ان کا کندھا دبا کر انہیں تسلی دی اور خود آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس چلی گئی۔ دروازے کی جھری سے اُس نے باہر موجود شخصیت کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ باہر تین آدمیوں کے ساتھ ملک معظم کھڑے تھے۔ اُس نے دروازہ کھول دیا۔

''اسلام علیکم سر...'' ماہ نور سلام کرتے ہوئے دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

"آئیے سر..... اندر آ جائیے۔" وہ کسی قدر حیران بھی تھی کیونکہ اسے ملک معظم کی اپنے ہاں آنے کی توقع نہیں تھی۔

"شکریہ مس ماہ نور....." انہوں نے اپنے ساتھ آنے والوں کو باہر رُکنے کا اشارہ کیا اور خود گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ ماہ نور انہیں لیے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ شاہین اور راہین تو سلام کر کے کمرے سے باہر چلی گئیں البتہ ماہ نور اور اماں کمرے میں ہی موجود رہے۔ ماہ نور کی طرح اماں کو بھی ان کی غیر متوقع آمد پر حیرانگی تھی۔

"مس ماہ نور دو تین سے شہسوار کی طرف سے پریشانی تھی۔ اب خدا کا شکر ہے کہ وہ کافی حد تک ٹھیک ہے تو میں نے سوچا کہ آپ کی شفٹنگ کا مسئلہ بھی حل کر دیا جائے۔ میں اپنے ساتھ ملازموں کو لے کر آیا ہوں سامان کی پیکنگ، لوڈنگ وغیرہ وہ خود کر لیں گے۔ ویسے آج محلے میں کوئی خاص بات ہے؟ گلی بھر آمد روفت ہو رہی ہے کیا مسئلہ ہے؟"

"سر وہ جن لڑکوں سے شہسوار کی لڑائی ہوئی تھی۔ ان لڑکوں میں سے تین کو رات کسی نامعلوم شخص نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ البتہ چوتھا زخمی ہے اور ہسپتال میں ہے۔"

"او مائی گڈنیس ..... یہ سب کس وقت ہوا؟"

"سر وقت کا تو صحیح اندازہ نہیں لیکن پولیس کو صبح پانچ بجے اطلاع ملی اور انہوں نے زخمی شخص کو ہسپتال میں پہنچایا اور اس کا بیان لیا۔ اہل محلہ اور ان لڑکوں کے لواحقین کا خیال ہے کہ یہ سب شہسوار کا کام ہے۔ انہوں نے بدلہ لینے کے لیے ان کو قتل کیا ہے۔" ماہ نور کی بات سن کر ملک معظم کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ تیزی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ماہ نور ..... آپ سب کا یہاں رُکنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ لوگ مشتعل ہو کر آپ کو بھی پریشان کر سکتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ چلیں سامان بعد میں ملازم خود لے آئیں گے۔ میرا خیال ہے کہ شہسوار کے ساتھ ساتھ یہ لوگ آپ کو بھی ملوث کرنا چاہتے ہوں گے۔ سو پلیز ہری اپ جو تیاری بھی کرنی ہے جلدی سے کر لیں۔"

"ارے بیٹا کیا تیاری کرنی ہے ہم نے ..... چلے چلتے ہیں اسی حال میں۔" اماں نے اُٹھ کر چادر اچھی طرح لپیٹ لی۔ ماہ نور اور شاہین نے جلدی جلدی چند چیزیں اُٹھا کر ایک بیگ میں سنبھالیں اور وہ بیگ شاہین نے اُٹھا لیا۔ راہین اور گڈو نئے گھر میں جانے کے خیال سے خوش ہو رہے تھے۔ ملک معظم نے ماہ نور کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔ اُسے بٹھا کر باقی سب کو پیچھے بٹھایا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے۔ چلنے سے پہلے انہوں نے ملازموں کو چند ہدایات دیں اور گاڑی کو ٹرن کر کے ہسپتال کی طرف موڑ دیا۔

"چلتے چلتے ذرا شہسوار کی خبر گیری بھی کر لوں اور اسے اس نئے واقعہ سے آگاہ بھی کر دوں۔" ملک معظم نے کہا۔ ماہ نور نے خاموشی سے ان کی بات سنی۔ اس کا ذہن مسلسل اُدھیڑ بن میں تھا کہ آخر یہ سب کس نے کیا۔

ملک شہسوار، ملک معظم، بلیک مین یا کسی چوتھے شخص نے۔ وہ جتنا سوچ رہی تھی اُسی قدر اُلجھی جا رہی تھی۔ گاڑی رکی تو اُس نے چونک کر دیکھا۔ گاڑی ہسپتال کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ ملک معظم گاڑی سے اُترے۔

"آپ سب یہیں بیٹھیں میں بس ابھی گیا اور ابھی آیا۔" انہوں نے جانے کو قدم بڑھائے۔

"ایکسکیوزمی سر ..... ایک منٹ ٹھہریں، میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" ماہ نور بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ جلد ہی وہ دونوں شہسوار کے کمرے میں تھے۔ اس کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ وہ بیڈ کی پشت سے کمر ٹکائے نیم دراز آج کا اخبار پڑھنے سے زیادہ دیکھنے میں مصروف تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر اُس نے اخبار ایک طرف تہہ کر کے رکھا اور انہیں مسکرا کر دیکھنے لگا لیکن وہ دونوں ہی جس پریشانی سے گزر رہے تھے اس کے باعث بالکل خاموش تھے۔ ماہ نور دوسرے بیڈ پر بیٹھ گئی جبکہ ملک معظم چیئر گھسیٹ کر شہسوار کے بیڈ کے قریب رکھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔ شہسوار نے دونوں کی طرف بغور دیکھا۔ یقیناً ان کے غیر معمولی اور خلاف توقع رویئے کے پیچھے کوئی خاص بات تھی۔

"بھائی کیا ہوا ؟ کیا بات ہے؟" شہسوار نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا تم نہیں جانتے شاری کہ کیا بات ہے؟" انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کے جواب میں سوال داغ دیا۔

"کیا مطلب ؟ مجھے کیا پتہ! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کون سی بات کے جاننے کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟" شہسوار حیرت زدہ تھا۔

"شاری تمہیں یاد ہو گا تم نے مجھے کہا تھا کہ معاملہ میرا ہے میں خود ہینڈل کروں گا لیکن یہ ہینڈل تو نہیں ہوا اُلٹا مزید پیچیدہ ہو گیا ہے۔" ملک معظم ہنوز اسی انداز میں بولے۔

"بھائی پلیز ..... پہیلیاں مت بجھوائیں۔ کھل کر بتائیں کون سا معاملہ اور کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟" شہسوار اب بھی شش و پنج میں تھا۔

"شاری..... انجان مت بنو۔ میں اُس جھگڑے کی بات کر رہا ہوں جس کی وجہ سے تم اس وقت ہسپتال میں ہو۔ اُن لڑکوں میں سے تین قتل ہو چکے ہیں جبکہ چوتھا زخمی ہے اور اسی ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔" ملک معظم اس کے چہرے کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ماہ نور بھی ان

دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اُلجھ گئی تھی۔

''بھائی...... کیا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟'' شہسوار کے لہجے میں کچھ افسردگی سی در آئی تھی۔

''نہیں...... میں شک نہیں کر رہا۔ محلے کے لوگوں کا شک تم پر ہے یہ بتانا چاہ رہا ہوں۔'' ملک معظم نے بات ہی بدل دی تھی لیکن ماہ نوران کی ٹون سے سمجھ رہی تھی کہ ملک معظم شہسوار کو براہ راست نہیں کہہ رہے لیکن اسے اس معاملے میں انوالو ضرور کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے شہسوار کے لیے اس طرح کا کام مشکل نہیں ہوگا۔ جبھی تو اُس نے ایسا کیا۔

''لیکن بھائی...... ڈاکٹرز کے خیال کے مطابق زخم بہت گہرا ہے اور مجھے زیادہ چلنا پھرنا نہیں چاہیے۔ پھر میں کیسے یہ کام کر سکتا ہوں۔''

''شہسوار! یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ یوں بھی اس قسم کے کاموں کے لیے بندہ ہائر کیا جاتا ہے۔ پولیس یہ بھی تو کہہ سکتی ہے کہ تم خود ہسپتال میں موجود رہے اور کسی دوسرے کے ذریعے کسی پیشہ ور قاتل کے ذریعے یہ کام کروایا۔'' ملک معظم معاملے کو پوری جزئیات سمیت دیکھ رہے تھے لیکن شہسوار کے چہرے پر پھیلے تاثرات سے وہ اتنا سمجھ گئے تھے کہ وہ اس معاملے میں ملوث نہیں۔ کوئی تیسرا شخص ان دو فریقین کے درمیان موجود ہے۔ جلد یا بدیر کھل کر سامنے ضرور آئے گا۔

''بھائی ایک اور بات بھی تو ہو سکتی ہے......'' اب شہسوار ملک معظم کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

''کیا؟'' انہوں نے سر اونچا کر اس کی سمت دیکھا۔

''کہیں آپ نے اُسے تو فون نہیں کر دیا تھا؟'' اس کے لہجے میں شک کی بو محسوس کر کے ملک معظم کچھ جھنجھلا سے گئے اور انہیں یہ احساس بھی ہوا کہ اسی طرح جب انہوں نے اس پر شک کا اظہار کیا تھا تو اسے ناگوار گزرا ہوگا۔

''شاری' جب تم نے کہا تھا کہ تم خود اس معاملے کو ہینڈل کرو گے تو میں اسی وقت پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اُسے فون کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔''

''بھائی پھر یہ سب کیسے ہوا؟'' شہسوار کنفیوز تھا۔

''فی الحال تو کچھ نہیں کہا سکتا۔ انتظار کرو جلد ہی سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا۔'' ملک معظم نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ان دونوں سے قطع نظر ماہ نور کی اپنی الگ ہی سوچیں تھیں۔ کبھی وہ ملک معظم کو قاتل کے روپ میں دیکھنے لگتی، کبھی شہسوار کو اور کبھی اس کے ذہن پردے پر سیاہ لباس میں ملبوس ایک اونچا لمبا قد آور شخص عکس بن کر جھلملانے لگتا۔ وہ عجیب مخمصے میں تھی۔

''بھائی...... یہ معاملہ زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اب اس کا حل کیا ہونا چاہیے۔''

''فی الحال تو کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا شاری۔'' ملک معظم نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسی پل دروازے پر کھٹکا ہوا تو شہسوار' ماہ نور اور ملک معظم تینوں نے دروازے کی سمت دیکھا۔ اے۔ ایس۔ آئی جہانداد اپنے دو سپاہیوں کے ساتھ دروازے میں موجود تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو ملک معظم کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں اور پھر معدوم ہو گئیں۔

''ملک صاحب! ڈسٹرب کرنے پر معذرت خواہ ہوں لیکن ہمیں آپ کا کچھ وقت درکار ہوگا۔'' انداز نرم لیکن لہجہ حکمیہ تھا۔

''آ جائیے اے۔ ایس۔ آئی صاحب۔'' ملک معظم نے اُٹھ کر اُن سے مصافحہ کیا اور انہیں بیٹھنے کو کہا۔

''کیا بات ہے شہسوار صاحب ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے؟'' اے۔ ایس۔ آئی نے وہاں موجود کرسی پر بیٹھتے ہوئے عجیب سے انداز میں کہا۔ اس کی نظریں کسی ایکسرے مشین کی طرف ملک معظم اور شہسوار کے چہرے کے تاثرات چیک کر رہی تھیں۔

''زخم بہت گہرا ہے ہڈی پر بھی ضرب آئی ہے۔ اس لیے ابھی صحیح طرح سے چل پھر نہیں سکتا۔'' ملک معظم نے اس کے لہجے میں طنز کی رمق محسوس کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔

''ملک صاحب! میرا خیال ہے مجھے اصل مسئلے کی طرف آنا چاہیے کہ آپ کا وقت بھی بہت قیمتی ہے اور ہمارا بھی۔ ہوا یہ ہے کہ محلہ شاہو گڑھی میں آج رات تین قتل ہوئے جبکہ ان کا چوتھا ساتھی سوئے اتفاق بچ گیا۔ اگر گولی چار انچ نیچے لگتی تو یقیناً اس کے دل میں بھی سوراخ ہو چکا ہوتا۔ محلے کے افراد سے پوچھ گچھ کرنے پر یہ بات علم میں آئی کہ شہسوار صاحب چند روز قبل وہاں گئے تھے اور انہی چاروں لڑکوں کے ساتھ ان کا جھگڑا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکے نے ان کی ران پر چاقو سے ضرب لگائی جس کی وجہ سے انہیں ہسپتال میں ایڈمٹ ہونا پڑا۔ کیوں شہسوار صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟'' اے۔ ایس۔ آئی نے جواب طلب نظروں سے شہسوار کی طرف دیکھا جو اسی کی طرف متوجہ تھا۔

''جی ہاں۔'' شہسوار نے مختصراً جواب دیا۔

''سو اس وقت تمام تر شکوک و شبہات آپ کی ذات سے منسلک ہیں۔'' اے۔ ایس۔ آئی نے کہا۔

''لیکن اے۔ ایس۔ آئی صاحب مجھ پر کیسا شک و شبہ میں تو......'' اس کی بات کاٹ دی گئی۔

''دیکھیے ملک صاحب۔ اس قسم کے معاملات میں ہر اُس شخص پر شک جاتا ہے جس سے مقتول کا تھوڑا بہت رابطہ یا تعلق داری ہو۔ پھر آپ کے جھگڑے کے تو کئی چشم دید گواہ موجود ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جس شخص نے یہ کام کیا اُسے ہائر کیا گیا تھا۔'' اے۔ ایس۔ آئی ایک لمحے کو رُکا۔ ملک معظم اور شہسوار کی ساری توجہ اُسی کی طرف تھی۔ اس نے کھنکار کر دوبارہ سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا

جہاں سے منقطع کیا تھا۔

''چوتھا شخص جو زخمی ہے ہم نے اُس سے تفصیلی بیان لیا ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ جو انہیں قتل کرنے آیا تھا۔ سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں، چہرہ اور ہاتھ تک چھپے ہوئے تھے۔ اور یہ شخص جس کا ذکر اُس زخمی نے کیا ہے ہماری فائلوں میں بلیک مین کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آج تک اس نے متعدد قتل کیے لیکن پولیس اس کا کوئی سراغ نہ پا سکی۔ یہ انڈر ورلڈ کا بچھو ہے۔ کہاں رہتا ہے' کوئی نہیں جانتا۔ اسے ایک لحاظ سے کرائے کا قاتل بھی کہا جا سکتا ہے۔ اب تک کی اس کی ساری کارکردگی' ہر جرم ہماری فائلوں میں درج ہے اور جس شخص نے بھی اُسے ہائر کیا ہے' وہ اس کے متعلق یقیناً بہت کچھ جانتا ہوگا۔ ہم اب اُسی کے ذریعے بلیک مین تک پہنچیں گے۔'' اے۔ ایس۔ آئی کنکھیوں سے ملک معظم کی سمت دیکھ کر بولا تھا۔ اس کی باتوں سے تو یہی لگ رہا تھا کہ جیسے اُسے شک نہیں پورا پورا یقین تھا کہ بلیک مین کو یہ کام سپرد کرنے والے ملک معظم ہی ہیں۔ ملک معظم اس کے چہرے پر پھیلے شکوک وشبہات کے تاثرات دیکھ کر بولے۔

''لیکن اے۔ ایس۔ آئی صاحب ہم اس شخص کو نہیں جانتے اور نہ ہی یہ نام ہم نے پہلے کبھی سنا ہے۔ پھر آپ کس بل پر ہمیں مشکوک ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

''ملک صاحب! یہ کوئی چھوٹا موٹا کیس نہیں ہے کہ محض شک کیا جا رہا ہے۔ تین افراد قتل ہوئے۔ تین زندگیاں موت کی تاریک آغوش میں جا سوئیں۔ کیا یہ معمولی بات ہے؟ ان سے جھگڑا کرنے والا آپ کا بھائی ہے۔ آپ کے بھائی کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کے بعد وہ کسی سے لڑے نہیں۔ پھر آپ کس طرح خود کو بری الذمہ کر سکتے ہیں۔''

''اے۔ ایس۔ آئی صاحب! آپ ہمیں نہ جانے کیا سمجھ کر ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ لڑکے ہیں' اکثر معمولی باتوں پر جھگڑ پڑتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی جان لے لی جائے۔ پھر آپ دیکھ رہے ہیں شہسوار مکمل بیڈ ریسٹ پر ہے اور میں ایک بڑی ٹیکسٹائل مل کا اونر ہوں۔ مجھے کیا جہان میں کوئی کام نہیں ہے کہ کرائے کے قاتل ڈھونڈتا پھروں۔'' ملک معظم کے چہرے اور آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا لیکن انہوں نے حتیٰ الامکان کنٹرول کر رکھا تھا۔

''ملک صاحب! زیادہ غصے نہ ہوں۔ ہمارا کام جرم کی تفتیش کرنا ہے۔ اس کے دائرہ کار میں ہر شخص آ سکتا ہے۔ خواہ وہ مل کا مالک ہو یا ایک غریب مزدور۔ بہرحال آپ سے اتنا کہنا ہے کہ بوقت ضرورت ہم آپ کو زحمت دیں گے۔ چلو حکم خان۔'' اُس نے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں میں سے ایک کا نام لے کر گویا چلنے کا حکم دیا اور پھر تینوں آگے پیچھے کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

ماہ نور کا ذہن مزید اُلجھ گیا تھا۔ یہ بات کنفرم ہوگئی تھی کہ ان لڑکوں کو قتل کرنے والا ملک معظم یا

ملک شہسوار نہیں بلیک مین ہے۔

''بلیک مین۔'' اس کے لبوں نے دھیرے سے یہ نام گنگنایا تھا۔ بلیک مین کا ان لڑکوں کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ کیا دشمنی تھی؟ کس لیے اُس نے ان کو قتل کیا؟

''تمہاری خاطر.....'' ماہ نور کے اندر سے آواز اُبھری اور وہ جیسے لرز کر رہ گئی۔ اس کی رگوں میں دوڑتا خون آتشیں سیال میں بدل گیا تھا۔ وجود اندر سے جھلسنے لگا۔

''میری خاطر.....لیکن کیوں؟''

''کیا اس سے پہلے اُس نے تمہاری خاطر سیٹھ حبیب الرحمٰن اور میڈم نظامانی جیسی دو معروف اور دولتمند ہستیوں کو صفحۂ زندگی سے حرفِ غلط کی طرح نہیں مٹایا؟''

''ہاں جانتی ہوں.....لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ وہ میری خبر کیوں رکھتا ہے؟ میری خاطر وہ اس قدر گھناؤنے کام کیوں کرتا ہے؟'' وہ اپنے اندر اُٹھنے والی سوچ کا جواب دے رہی تھی۔

''اس لیے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔'' محبت.....محبت.....دل کے ایوانوں سے اسی لفظ کی بازگشت ٹکرا ٹکرا کر واپس پلٹ رہی تھی۔ ماہ نور اپنے ذہن میں اُبھرنے والی اس نئی سوچ سے گھبرا گئی۔ اس کا دل تو خواہشوں اور خوابوں کا قبرستان تھا۔ وہاں محبت کی کونپل کیسے پھوٹ سکتی ہے؟

''ناممکن.....'' اس نے پہلے دل کی بڑھتی کانپتی دھڑکنوں کی التجا کو رد کر دیا۔ ''نہ کسی کو مجھ سے محبت ہے اور نہ ہی میں کسی سے محبت کرتی ہوں۔'' اُس نے جیسے خود کو تسلی دی تھی۔

''مس ماہ نور.....'' وہ چونک اُٹھی۔ ملک معظم جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ''آپ چلئے میں ذرا ڈاکٹر سلیم اور ڈاکٹر ثاقب سے مل کر شہسوار کی امپروومنٹ پوچھ لوں۔''

''اوکے شہسوار.....تھوڑی دیر میں دوبارہ چکر لگاؤں گا۔ پریشان نہ ہونا میں ابھی ڈی۔ آئی۔ جی سے بھی بات کرتا ہوں یہ کوئی مذاق ہے۔ شہر بھر میں ایک عزت ہے ہماری ایک نام ہے۔ اُسے یوں تو نہیں رولنا۔''

''ٹھیک ہے بھائی آپ ٹینس نہ ہوں میں ٹھیک ہوں اب۔ ہاں البتہ اس بور کمرے کی در و دیوار سے چڑ سی ہونے لگی ہے مجھے۔ ڈاکٹر سے پوچھ لیجئے گا کہ مجھے کب ڈسچارج کرنا ہے۔ میں یہاں سے اتنا بیزار آ گیا ہوں کہ اگر انہوں نے خود مجھے اجازت نہ دی تو میں بنا بتائے گھر چلا جاؤں گا۔''

''ارے نہیں ایسا مت کرنا۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن اور ہے۔ انشاء اللہ پھر تم گھر پر ہو گے۔ اچھا اللہ حافظ۔'' انہوں نے ننھے بچوں کی طرح اس کے گال تھپتھپائے۔ ماہ نور اتنی دیر میں کمرے سے نکل چکی تھی۔ انہوں نے اسے کوریڈور میں جاتے ہوئے دیکھا اور دوسری طرف مڑ گئے جہاں سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے ڈاکٹر سلیم کا چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔

ماہ نور ابھی کوریڈور میں ہی تھی کہ اُس نے سامنے سے آتے ہوئے اسد کو دیکھا جو ہاتھ میں پھلوں کے شاپر پکڑے تیز تیز قدموں سے اسی کی سمت چلا آ رہا تھا۔

''آپی..... آپ یہاں؟ شہسوار صاحب کیا ابھی تک یہیں ہیں؟''

''ہاں ایک آدھ دن میں ڈسچارج ہو جائیں گے۔ تم یہ بتاؤ، تم یہاں کس سے ملنے آئے ہو؟'' ماہ نور نے اُس سے پوچھا۔

''غیاث بھائی سے ملنے آیا ہوں۔ وہ زخمی ہیں ناں۔'' وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے ماہ نور کچھ نہ جانتی ہو۔

''غیاث سے؟'' ماہ نور کے لہجے میں حیرت اور کچھ تلخی بھی تھی۔ ''تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ جانتے بھی ہو کس قماش کا آدمی ہے وہ۔ تم جیسے اچھے لڑکے کو تو اس جیسے انسان سے کوسوں دور رہنا چاہیے لیکن تمہارے رویے سے تو یوں لگ رہا ہے۔ جیسے تمہاری اس کے ساتھ گہری دوستی ہو۔'' ماہ نور کو حقیقی معنوں میں اسد کے غیاث سے میل جول پر افسوس ہوا تھا۔

''لیکن آپی..... آپ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ غیاث بھائی نے کبھی خراب حرکت نہیں کی۔'' اسد نے ماہ نور سے پوچھا۔

''اسد، میرے بھائی، میری اس بات سے تم نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا کہ وہ اچھا ہے۔ بہت بُرا انسان ہے وہ انتہائی بُرا۔ تمہارا اس سے دور رہنا ہی تمہارے لیے اچھا ہے۔ محلے کے سارے لفنگوں کے ساتھ دوستی اور بیٹھنا اُٹھنا ہے اس کا۔ خود سوچو کیا وہ اچھا ہو سکتا ہے؟''

''آپی وہ بُرے نہیں..... بالکل بھی بُرے نہیں۔''

''پتہ نہیں اسد تمہیں اس جاہل، اُجڈ، بدتمیز، بدتہذیب شخص میں کیا خوبی نظر آتی ہے؟'' ماہ نور کا انداز تلخ سے تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر دو سرخ انگاروں جیسی آنکھیں چمک چمک کر اس کے ذہن کو جھلسانے لگی تھیں۔

''جاہل..... اُجڈ..... بدتہذیب' آپی میں پچھلے ڈیڑھ سال سے اُن سے ٹیوشن پڑھ رہا ہوں۔ ان کی گائیڈنس کی وجہ سے مشکل مضامین میں کامیاب ہوا۔'' اسد کے کہنے پر ماہ نور نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''ٹیوشن اور غیاث سے..... تم بی۔ ایس۔ سی کی تیاری کر رہے تھے ناں؟''

''جی ہاں۔''

''تو اس نے تمہیں ٹیوشن کیسے پڑھا لی جو خود چار پانچ جماعتیں بھی مشکل سے پڑھا ہوگا۔''

''آپ سے کس نے کہا آپی کہ وہ چار پانچ جماعت پڑھے ہیں؟ انہوں نے ڈبل ایم۔ اے کر رکھا ہے باٹنی اور میتھ جیسے ٹف مضامین میں۔''

''ڈبل ایم۔ اے۔'' ماہ نور کی آنکھوں کے سامنے بگڑے حلیے والا شخص آ گیا جس نے کبھی اپنا لباس ٹھیک رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بھدے ہاتھ پاؤں جن پر کبھی کبھی گرد بھی جمی ہوتی تھی۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ وہ اتنا ہائی کوالیفائیڈ آدمی تھا۔ ماہ نور کو حیرت زدہ چھوڑ کر اسد آگے بڑھ گیا۔ آج ماہ نور کی باتوں سے اسد کو حقیقی معنوں میں دُکھ ہوا تھا۔ ماہ نور کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ شہسوار کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں اُسے داخل ہوتے دیکھ کر ماہ نور نے بھی قدم آگے بڑھا دیئے۔ گاڑی میں اماں، شاہین، راہین وغیرہ اس کی منتظر تھیں۔

''کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں۔'' اماں کے لہجے سے کچھ خوف سا جھلک رہا تھا۔

''نہیں اماں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔'' مختصر جواب دے کر ماہ نور گاڑی کے اندر بیٹھ گئی۔ ابھی اُسے بیٹھے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ملک معظم بھی آ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ریورس کر کے پارکنگ ایریا سے نکالی اور گھر کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔

''آپ کچھ پریشان ہیں مس ماہ نور؟'' ملک معظم اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات نہ سمجھ سکے تو پوچھ ہی لیا۔

''نہیں سر..... کوئی بات نہیں ہے۔'' اُس نے گردن جھکا کر اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ملک معظم سمجھ گئے کہ وہ ابھی کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ سو انہوں نے خاموشی سے ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف مبذول کر لی۔ ماہ نور نے اماں اور ملک معظم کو تو کوئی نہ کوئی جواب دے کر مطمئن کر دیا تھا لیکن اس کے اپنے ذہن میں لاوا سا پک رہا تھا۔

بلیک مین..... محلے کے تین لڑکوں کا قتل..... غیاث کا زخمی ہونا..... اسد کی غیاث کے ساتھ ہمدردی اور عقیدت..... اور غیاث جیسے شخص کے بارے میں یہ انکشاف کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ یہ سب خیالات ماہ نور کو اُلجھا رہے تھے۔ وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں ایسی اُلجھی کہ ملک لاج پہنچنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ وہ اس وقت چونکی جب راہین نے اس کا کندھا تھام کر ہولے سے ہلایا۔

''آپی..... گھر آ گیا ہے۔'' ماہ نور خاموشی سے گاڑی سے نیچے اُتری۔ ماہ نور اور ملک معظم آگے آگے جا رہے تھے اور اماں اور بچے ان کی تقلید میں قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ پورچ کے ایک طرف پتلی سی گیلری تھی جو کچھ آگے جا کر ختم ہو گئی۔ ماہ نور کوٹھی کے اس طرف کبھی نہیں آئی تھی۔ انیکسی کیا تھی۔ الگ سے ایک چھوٹا سا گھر بنا ہوا تھا۔ چھوٹے سے برآمدے میں سے گزر کر ملک معظم نے بیرونی دروازہ کھولا اور انیکسی کے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے لائن سے دو کمرے بنے ہوئے تھے جو غالباً بیڈ روم تھے۔ دائیں طرف کچن اور سٹور کے ساتھ ایک کمرہ تھا جس کا ایک دروازہ باہر برآمدے

میں کھلتا تھا اور دوسرا انیکسی کے اندر۔ اور چھوٹا سا لاؤنج۔ انیکسی میں کچھ سامان پہلے سے موجود تھا۔

''خالہ جان...... آپ کا سامان کچھ ہی دیر میں آ جائے گا۔ تب تک میں خالہ زیتون اور حمد کو بھیج دیتا ہوں وہ آپ کی مدد کریں گے صفائی ستھرائی میں۔'' ملک معظم اتنا کہہ کر جانے لگے۔

''ارے نہیں بیٹا تم نے اتنی زحمت کی ہماری وجہ سے اتنی پریشانی اُٹھائی۔ ہم شکریہ نہیں ادا کر سکتے۔ اب اور کوئی زحمت نہیں دیں گے تمہیں۔ یہاں ہم نے رہنا ہے سو صفائی ستھرائی خود کر لیں گے۔''

''اوہو خالہ جان کوئی زحمت نہیں چلیں خیر جیسی آپ کی مرضی اور ہاں آج رات کا کھانا آپ ہماری طرف کھائیں گے۔ چلیے مس ماہ نور ماما آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' ملک معظم باہر نکلے تو ماہ نور نے بھی ان کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی شاہین اور راہین اماں کے ساتھ صفائی ستھرائی میں جت گئیں جبکہ گڈو اور ماہین اتنا پیارا گھر پا کر ادھر ادھر چھلیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

☆......☆......☆

''ارے زری...... یہ اپنی نوما تو جیسے جیسے بڑی ہو رہی ہے بہت پیاری نکلتی ہے۔ یوں لگتا ہے آدھے جہان کا حسن سمیٹ لیا ہو اس نے۔'' رابعہ نے اُسے گود میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔ بالکل چینی کی گڑیا سی لگتی تھی وہ ننھی منی ناک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گھنے بالوں کی دو چھوٹی چھوٹی پونیاں کیے۔ چھ سات برس کی تھی لیکن اتنی نازک کہ لگتا سخت ہاتھ لگا تو ٹوٹ جائے گی۔''

''ہاں رابعہ بڑی منتوں مرادوں کے بعد اللہ نے مجھے یہ بچی دی ہے۔ اس کے ابو کی تو اس میں جان ہے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اگر ایسی صورت اور ایسی عادات والی بیٹیاں دیں ہیں تو بے شک اللہ چار اور دے دے۔ تو بہ میں نے کہا کچھ عقل کو ہاتھ ماریں۔ اتنی بیٹیاں پال پوس کر بڑی کریں اور پھر ایک پرایک لوگوں کے حوالے کر دیں۔ مجھے تو اب بس بیٹے کی آرزو ہے۔''

''بیٹا ہو یا بیٹی بس نیک ہو اور کیا چاہیے۔ ویسے بچے تو میرے بھی ذہین اور سمجھدار ہیں لیکن کیا کروں رُل گئے ہیں ان کے باپ کو ان کی ذرہ بھر پرواہ نہیں رہی۔'' رابعہ افسردہ سی ہو گئی۔

''رابعہ...... پریشان نہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ہاں بس اللہ ہی چاہے تو ٹھیک ہو سکتا ہے سب کچھ۔ یقین مانو زری جب میں اپنے ان بیٹوں کو جنہیں کبھی کانٹا نہیں چبھنے دیتی تھی ہتھوڑوں سے شیٹ میٹل ورکشاپ میں لوہا کوٹتے دیکھتی ہوں تو میرا دل کٹ کے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے لیکن میرے بچے بہت سمجھدار ہیں۔ وہ جان گئے ہیں کہ انہوں نے اپنا کل روشن کرنا ہے تو آج اپنے خون سے چراغ جلانے ہوں گے۔'' وہ اب بھی اسی کیفیت میں بول رہی تھی۔ یقیناً ایک ماں کبھی نہیں چاہتی کہ اس کے بچے پڑھنے لکھنے سکول جانے کی

بجائے اپنے ننھے ہاتھوں سے محنت مزدوری کریں۔ پھر اس کے بچوں نے تو آنکھ ہی ایسے ماحول میں کھولی تھی جہاں سونے کو مخمل کے بستر تھے اور کھانے کو ہر وہ چیز جس کی طلب ایک بار بھی ان کے دل میں جاگی ہو گی۔ جانے کیسے انہوں نے خود کو اس ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ کبھی ماں سے فرمائش نہیں کی کبھی تنگ نہیں کیا۔

''ویسے زری ایک بات بتاؤں تمہیں میرے بچوں نے بہت جلد اس ماحول کو اپنا لیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ماں یعنی میں ان کے لیے کچھ زیادہ نہیں کر سکتی۔ سو وہ مجھے پریشان نہیں کرتے لیکن جلال جانے کیوں جلال اس قدر کٹھور ہو گئے ہیں۔ انہیں ذرہ بھر میری پرواہ نہیں رہی اور نہ ہی بچوں کا خیال ہے۔ کیا کروں ماں باپ کے پاس نہیں جا سکتی، بھائیوں سے نہیں مل سکتی۔ سمجھ نہیں آتی آخر جلال چاہتے کیا ہیں؟'' رابعہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''رابعہ غم نہ کرو۔ دیکھو خود کو تنہا نہ سمجھا کرو۔ ہم تمہارا غم نہیں بانٹ سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی تمہاری تنہائی تو بانٹ لیتے ہیں۔ تم ہمیں ہی اپنا سمجھ لو۔ ہم سے تو تمہیں کوئی شکایت نہیں ہے ناں۔''

''ارے نہیں زری تم لوگوں سے کیا شکایت۔ تم نے میرا ساتھ دیا۔ قدم قدم پر میرے کام آئے ہو تم لوگ شکر۔ تمہاری نوما تو مجھے اتنی پیاری ہے کہ میرا دل چاہتا ہے میں اسے اپنے ظومی کی دلہن بنا لوں جھٹ پٹ سے۔'' آخری جملے تک آتے آتے رابعہ کا انداز اور لہجہ بدل گیا۔ افسردگی کی جگہ کچھ کچھ خوشدلی نے لی تھی اس کی آنکھیں کسی خیال سے چمکنے لگی تھیں۔ زری نے اس کی بات پر مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ارے تم بات کرتے کرتے پٹڑی کیوں بدل گئیں؟'' جواب میں رابعہ کھل کر مسکرا دی۔

''اوہو تو کیا ہو گیا۔ ساری زندگی ایسے ہی حالات تھوڑی رہنے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو دیکھنا میرا ظومی دنیا میں ایک مقام بنائے گا۔ ہاں لیکن اُس وقت تم مکر مت جانا۔''

''چلو دیکھیں گے۔'' زری نے گویا سنی ان سُنی کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو زری نالومت۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔''

''ارے رابعہ یہ یکدم تمہیں کیا سوجھی؟'' زری حیران تھی کہ یہ اچانک رابعہ اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئی۔

''زری...... میں جانتی ہوں کہ تمہیں اس وقت یہ بات اچھی نہیں لگ رہی ہو گی لیکن جانے کیوں میرے دل پر ابھی ابھی منکشف ہوا ہے کہ نوما میرے ظومی کے لیے ہے۔ تم بس ہاں کر دو۔'' رابعہ اسی طرح ضدی انداز اپنائے ہوئے تھی۔

''اچھا بھئی ٹھیک ہے...... انہیں بڑا تو ہو لینے دو۔'' زری نے گویا بات ختم کر دی تھی۔

رابعہ اس کے اقرار پر اس قدر خوش ہوئی کہ اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ زری رابعہ کی کیفیت پر حیران تھی لیکن جانے کیوں اس کے بعد وہ اس مسئلے پر کچھ نہ بولی۔ رابعہ کی خوشی دیدنی تھی انجانی خوشی کی الوہی چمک اس کی پلکوں پر خواب بن کر اُتر آئی تھی۔ وہ تیزی سے کمرے کے کونے میں رکھے ٹرنک کی طرف بڑھی اور جب وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی تھی۔ اُس نے دھیرے سے لوما کو قریب بٹھایا اور اس کا بایاں ہاتھ تھام کر تیسری انگلی میں ایک نازک سی انگوٹھی ڈال دی۔ زری بس ارے.....ارے کرتی رہ گئی۔

"تم نہیں جانتیں زری کہ آج تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میری بنجر آنکھوں میں پھر سے خوابوں کے نخلستان آباد ہو گئے ہیں۔ تمہارا بہت شکریہ۔" زری کے دونوں ہاتھ تھام کر اُس نے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"تم کہاں ہو زری..... میری امانت کا کتنا خیال رکھا تم نے۔ کیا ابھی بھی وہ ویسی ہی خوبصورت ہے؟ ویسی ہی حساس؟ کیا اب بھی اس کی آنکھوں میں ستارے چمکتے ہیں؟ کیا کبھی اُس نے مجھے یاد کیا؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک دن یکدم تم میرے سامنے آ جاؤ؟ مجھ سے ملو میری امانت ہمیشہ کے لیے میرے حوالے کرنے۔" ان کی نظریں سامنے دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور ذہن میں خیالات کا ایک تانا بانا بندھا ہوا تھا۔ دروازے میں سے دو وجود کمرے میں در آئے تھے۔ وہ خیالوں میں دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر مسکرا اُٹھیں۔ ملک معظم اور ماہ نور دونوں نے انہیں مسکراتے دیکھا تھا لیکن دونوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ مسکراہٹ ان کی آمد کی وجہ سے نہیں۔ مسز جلال اپنے کسی خیال کے تحت مسکرائی ہیں۔

"ماما..... کیا حال ہے آپ کا؟" ملک معظم کی آواز انہیں حال میں واپس لے آئی تھی۔ انہوں نے چونک کر دونوں کی طرف دیکھا۔

"تم دونوں کب آئے؟"

"جس وقت آپ دروازے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔" ملک معظم نے جواب دیا۔ ان کے لہجے میں ماں کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

ماہ نور آگے بڑھ کر مسز جلال کے پاس بیٹھ گئی۔ "یونہی جانے کون سے خیالات ذہن میں در آئے۔ بہرحال ٹھیک ہوں اب۔" انہوں نے جواب دیا۔

"آنٹی..... یہ تو بتائیے کہ تین چار دن پہلے جو مشق میں نے آپ کو کروائی تھی وہ دوبارہ کی یا نہیں؟"

"وہ مشق میں دن میں چار چار بار کرتی ہوں۔ ماہ نور! اب میں دس سے بارہ قدم بغیر سہارے

کے چل سکتی ہوں۔ ٹیک لگائے بغیر پندرہ سے بیس منٹ تک بیٹھ سکتی ہوں اور پچھلے دنوں جو میری نیند بالکل غائب ہو گئی تھی وہ مسئلہ بھی ٹھیک ہو گیا ہے اب میں مکمل نیند لے رہی ہوں۔" وہ تفصیل سے ماہ نور کو اپنی تیزی سے بڑھتی تندرستی کی رپورٹ دے رہی تھیں۔ اس دورانیے میں ملک معظم بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ البتہ ماں کو جلدی سے صحت یاب دیکھ کر وہ بھی بے حد خوش تھے۔

"معظم بیٹا شہسوار نے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا۔ کچھ بتا کر نہیں گیا تھا کہ آخر کب تک آ جائے گا۔" مسز جلال نے یکدم روئے سخن ملک معظم کی طرف کر دیا اور وہ اچانک ماں کے سوال پر بوکھلا گئے۔ پھر قدرے سنبھل کر بولے۔

"دو تین بار فون کیا ہے اُس نے ماما۔ کہہ رہا تھا ایک دو روز میں واپس آ رہا ہوں۔ اب دیکھیں۔ اچھا ماما اب میں چلتا ہوں۔ خالہ زیتون سے کہہ دیجئے گا کہ رات کے کھانے کا مینیو اچھا ہونا چاہیے۔ رات کو کچھ مہمانوں نے آنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے جبکہ ماہ نور اپنے روزمرہ کی روٹین کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

☆..... .....☆..... .....☆

مسز جلال دن کا کھانا کھانے کے بعد سو چکی تھیں۔ ماہ نور لاؤنج میں آ گئی۔ خالہ زیتون کام نمٹا چکی تھیں اور اب جانے کی تیاری میں تھیں۔

"ماہ نور بی بی..... سارا کام ختم ہو چکا ہے۔ آپ کا کھانا بھی تیار کر کے اوون میں رکھ دیا ہے جس وقت دل کرے کھا لیجئے۔ اب میں چلوں گی۔" ٹوپی والا برقعہ اوڑھ کر ماہ نور کو مطلع کرتی ہوئی وہ چلی گئیں۔ پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ماہ نور کا دل کچھ گھبرا سا گیا لیکن پھر بھی وہ ہمت کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وسیع و عریض کمرے، لاؤنج، ڈرائینگ، ڈائننگ ایک ایک چیز کو بھرپور توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ دل میں کچھ بے چینی بھی تھی کہ اماں، شاہین و رامین کے ساتھ اُسے بھی گھر کی سیٹنگ میں حصہ لینا چاہیے لیکن ڈیوٹی آورز میں وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی۔ سو کچھ دیر گھوم پھر کر وہ دوبارہ لاؤنج میں آ گئی۔ کرنے کو کوئی کام تو تھا نہیں۔ وہ وہیں لاؤنج میں بیٹھ گئی اور میز پر رکھا میگزین اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ لاؤنج کا دروازہ کھلا اور چوکیدار اندر داخل ہوا۔

"کیا بات ہے چوکیدار؟" ماہ نور چوکیدار کی غیر متوقع آمد پر قدرے حیران ہوئی تھی۔

"وہ جی مس صاحبہ باہر کوئی بچہ یہ رُقعہ دے گیا ہے کہہ رہا تھا کہ آپ کو دے دوں۔" چوکیدار نے آگے بڑھ کر رُقعہ ماہ نور کو پکڑایا اور خود واپس چلا گیا۔ ماہ نور نے جلدی سے کاغذ کھولا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں بلیک مین کا لکھا ہوا پروانہ ہے۔ تحریر شناسا تھی، اس کی نظریں سطروں پر پھسلنے لگیں۔

مس ماہ نور!

آپ کی خیریت کا طلب گار ہوں لیکن جانتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں۔ جبھی میری دی ہوئی چیزیں آپ نے رَد کر دیں۔ میرے فلیٹ میں جانے کی بجائے آپ کہیں اور شفٹ ہو گئیں کوئی بات نہیں۔ میرے دیئے ہوئے پیسے آپ نے ٹرنک میں رکھ دیئے کہ جب ملوں تو میرا خلوص میرے منہ پر مار سکیں۔ میں اس پر بھی آپ سے شکوہ نہیں کروں گا لیکن میرے بس میں جو کچھ ہو گا وہ کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ جس نے بھی زندگی میں کبھی آپ کی طرف ناپاک ارادے سے دیکھا۔ وہ آنکھیں پھر دنیا کا کوئی اور منظر نہ دیکھ سکیں گی۔ سیٹھ حبیب الرحمٰن، میڈم کے بعد امجد، ارشد، عامر اور غیاث۔ غیاث بچ نکلا نہیں تو وہ بھی میری ہٹ لسٹ پر تھا۔ بہر حال آپ سے صرف اتنا کہنا ہے کہ میرے خلوص کو کبھی غلط نظر سے مت دیکھیے گا۔

بلیک مین

ماہ نور کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار خط کے الفاظ آ رہے تھے۔ دل انوکھے سے احساس سے آشنا ہو رہا تھا، بے ترتیب دھڑکنیں کوئی پیغام دے رہی تھیں۔ وہ باہر کی تنہائی اور اندر کے شور سے اس قدر گھبرائی کہ باہر لان میں نکل آئی۔ دھوپ کافی تیز تھی۔ گرمی کا احساس بھی غالب آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تو لان میں درختوں کے سائے تلے گھومتی رہی۔ پھر جانے کیا خیال آیا کہ انیکسی کی طرف نکل آئی۔ انیکسی کی تو صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ شاہین اور راہین دونوں نے مل کر کافی اچھی سیٹنگ کر لی تھی۔ بے چاری صبح سے لگی ہوئی تھیں البتہ اماں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

"راہین! اماں کہاں ہیں؟" ماہ نور نے راہین سے پوچھا جو برتن دھو دھو کر ایک طرف رکھ رہی تھی۔ ماہین اور گڈو اس کے پاس بیٹھے برتن کپڑے سے خشک کر کر کے رکھ رہے تھے۔

"آپی بھوک لگ رہی تھی۔ اماں بازار سے کھانا لینے گئی ہیں۔"

"اوئے کمال ہے حمدو کو بھیج دینا تھا۔ خود کیوں چلی گئیں؟ کتنی دیر ہوئی ہے ان کو گئے ہوئے؟"

"یہی کوئی پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے آتی ہی ہوں گی۔ آپ بتائیں آپ کی آنٹی کیسی ہیں اب؟"

"وہ تو اب کافی ٹھیک ہیں سو رہی تھیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ دیکھوں اگر کوئی کام ہو تو تم لوگوں کا ہاتھ بٹا دوں۔"

"ارے آپی چار پانچ لوگ تھے ہم منٹوں میں سیٹنگ ہو گئی۔ شاہین آپی نے سارے فرش دھوئے اور میں اور اماں نے فرنیچر سیٹ کیا۔ یہاں پہلے سے بھی کافی سامان پڑا تھا۔ معظم صاحب نے کہا کہ وہ بھی ہمارے ہی استعمال میں رہے گا۔ سو شاہین آپی نے فرش دھونے کے بعد فرنیچر اچھی طرح صاف ستھرا کیا۔ میں نے تقریباً سارے برتن دھو کر سیٹ کر دیئے ہیں۔ اب صرف کچن کے برتن اور ڈبے وغیرہ رہ گئے ہیں وہ دھو کے رکھنے ہیں۔" راہین ماہ نور کو تو جواب دے کر دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ ماہ نور نے گھوم پھر کر ساری انیکسی کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اس قدر اچھے طریقے اور قرینے سے رکھی گئی تھی کہ ماہ نور کو بے ساختہ اپنی معصوم بہنوں پر پیار آ گیا اور اس نے برملا چاروں کے گال چوم کر اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"اب میں گھر کی آدھی فکر سے آزاد ہو گئی۔ میری پیاری پیاری پھول سی بہنیں اب بڑی ہو گئی ہیں۔ انہیں گھر داری سنبھالنے کا طریقہ آ گیا ہے۔" چاروں کے چاروں اس تعریف پر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے کہ بیرونی دروازہ کھلا اور اماں اندر داخل ہوئیں۔

"ارے بس بیٹا یہیں رکھ دو۔ ہم خود اٹھا لیں گے۔" اماں اپنے پیچھے آنے والے سے مخاطب تھیں جس کے ہاتھ میں چند شاپر پکڑے ہوئے تھے۔ اُس نے وہیں دروازے کے پاس رکھے اور اُلٹے قدموں واپس ہو لیا۔ غالباً اماں کچھ راشن وغیرہ لے کر آئی تھیں جو رکشہ ڈرائیور کی مدد سے یہاں تک پہنچا تھا۔ شاہین اور ماہ نور نے آگے بڑھ کر وہ سامان اُٹھایا اور کچن میں لے گئیں۔ مختلف مصالحے، دالیں، آٹا، چینی، گھی اور دوسری ضرورت کی کئی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ مصالحے، دالیں ڈبوں میں اُلٹ کر باقی سامان سنبھال کر وہ دونوں باہر آئیں۔ اماں لاؤنج کا پنکھا چلائے صوفے پر تقریباً لیٹی ہوئی تھیں۔ ماہ نور اماں کے پاؤں کی طرف بیٹھ کر آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دبانے لگی۔ وہ حقیقتاً بہت تھک گئی تھیں۔

"اماں اگر کوئی چھوٹا موٹا کام ہو تو حمدو یا کسی دوسرے ملازم سے کہہ دیا کریں۔"

"نہ بیٹا یہ جو کچھ ان لوگوں نے کیا یہ بھی کم نہیں۔ کیوں خواہ مخواہ بوجھ بنیں دوسروں پر۔ پھر جب تک ہاتھ پیر سلامت ہیں اپنا کام خود کرنا ہے۔ ماہ نور بچی تمہارے ابو جی نے کبھی کسی کا احسان نہیں لیا اور یہی عادت میری بھی تھی لیکن اب حالات نے اتنا مجبور کر دیا ہے کہ ہمیں ملک صاحب کا احسان لینا پڑ گیا ہے۔ مگر اس میں کوئی زیادہ برائی نہیں اس لیے کہ تم ہاتھوں پاؤں کی ملازمت کر رہی ہو۔" اماں کی باتوں نے ماہ نور کے ذہن میں دوبارہ ابو جی کی یاد تازہ کر دی تھی۔ اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"چلیں ٹھیک ہے جس طرح آپ کا جی چاہے اسی طرح کریں۔ خیر یہ بتائیں کہ کھانے کے

لیے کیا لے کر آئی ہیں، بچی سخت بھوک لگ رہی ہے۔"

"ارے تو کیا تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا، ڈھائی سے اوپر ہو گیا ہے وقت۔"

"کھانا تو خالہ زیتون اوون میں رکھ کر گئی ہیں لیکن میں نے نہیں کھانا وہ۔ عرصہ ہو گیا دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ کھائے ہوئے۔ میں آپ کے ساتھ کھاؤں گی۔"

"سو بسم اللہ میری بچی۔ شاہین برتنوں میں کھانا نکال لاؤ اور راحین، گڈو اور ماہی سے بھی کہو کہ کام چھوڑ دیں پہلے کھانا کھالیں۔ باقی بعد میں سہی۔ سب کچھ تو ٹھیک ہو گیا ہے جو تھوڑا بہت رہ جائے گا وہ آہستہ آہستہ کرلیں گے۔" اماں کے کہنے پر سب ہی کام چھوڑ چھاڑ کر آ گئے۔

شاہین نے لاؤنج کے چمکتے ہوئے فرش پر دری بچھا کر دسترخوان لگایا اور کھانا برتنوں میں نکال کر لے آئی۔ تنوری نانوں کے ساتھ گوشت کا شوربہ، قیمہ اور دہی تھا۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ انیکسی چونکہ کوٹھی کے پچھلی طرف بنی ہوئی تھی اس لیے سارا دن دھوپ کی دستبرد سے محفوظ رہتی تھی۔ سو اس وقت ایسی ٹھنڈک تھی کہ سب کو نیند آنے لگی۔ تھکن کے مارے سب کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ سب وہیں لاؤنج میں نیچے دری پر ہی آڑے ترچھے لیٹ گئے۔ ماہ نور نے وقت دیکھا۔ مسز جلال کے جاگنے کا وقت ہو گیا تھا۔ سو وہ بیرونی دروازہ اچھی طرح بند کرتی ہوئی کوٹھی کی طرف چل پڑی۔

☆............☆............☆

مسز جلال جاگ رہی تھیں اور ماہ نور کی منتظر بھی تھیں۔

"کہاں چلی گئی تھیں نور...... میں کتنی دیر سے جاگ رہی تھی لیکن تمہارا کہیں کوئی پتہ ہی نہ تھا۔" اُسے دیکھتے ہی وہ بول پڑیں۔

"وہ آنٹی دراصل...... میری امی اور سسٹرز یہاں انیکسی میں شفٹ ہوئے ہیں آج صبح ہی۔ آپ سو رہی تھیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ جا کر ان کے ساتھ تھوڑا بہت ہاتھ بٹاؤں۔ اماں کچھ سودا سلف لینے گئی ہوئی تھیں۔ وہ واپس آئیں تو میں ادھر آ گئی۔ کیونکہ آپ کے جاگنے کا وقت ہو گیا تھا لیکن آپ تو پہلے ہی سے جاگ رہی تھیں۔"

"بات ہی ایسی ہے میں نے ایسا خواب دیکھا کہ عجیب سے احساس کے تحت میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے خواب میں غازی کو دیکھا۔ اونچا لمبا خوبصورت جوان تھا' وہ اس نے تعارف کروایا کہ میں ہی غازی ہوں۔ میں حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ یکدم پیچھے سے کسی نے اُس پر خنجر سے حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ کر اُسے آوازیں دینے لگی اور اسی اثناء میں میری آنکھ کھل گئی۔" ماہ نور خاموشی سے ان کی بات سنتی رہی۔ جب وہ خاموش ہوئیں تو پھر وہ بولی۔

"آنٹی ممکن ہے آپ کو آپ کا بیٹا مل جائے۔"

"نور...... میں نے پچھلے پندرہ سالوں میں اُسے اتنا تلاش کیا ہے کہ اب اُس سے ملنے کی آرزو پر مایوسی کی کہر سی جمنے لگی ہے۔ کہتے ہیں دنیا بہت بڑی ہے لیکن کھویا ہوا ایک نہ ایک دن ضرور آن ملتا ہے۔ پھر میرا غازی ابھی تک مجھ سے کیوں نہیں ملا؟ وہ کہاں کھو گیا ہے کہ اس کو تلاش کرتے کرتے آنکھوں نے بھی تھکن اوڑھ لی ہے لیکن اس کا کہیں کوئی سراغ کوئی پتہ نہیں ملتا۔" مسز جلال کے لہجے میں رنج و ملال اور مایوسی کا امتزاج رچا بسا تھا۔

"نہیں آنٹی...... اوپر والے کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو یہ بات جانتی ہوں کہ اگر آپ کو اپنے بیٹے کے ملنے کا کامل یقین ہے تو وہ جہاں کہیں ہو گا کبھی نہ کبھی آپ سے ضرور آن ملے گا۔" ماہ نور کے انداز میں تسلی تھی۔

"کاش ایسا ہو جائے..... کاش ان آنکھوں کے بے نور ہونے سے پہلے آ جائے۔ صرف ایک بار اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار کر لوں۔ اسے یقین دلا سکوں کہ میں نے یہ پندرہ سال کیسے اس کی جدائی میں کاٹے ہیں۔" مسز جلال کی بھیگی پلکوں پر ٹکے شفاف موتی اب رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

ماہ نور نے ایک محبت کرنے والی ماں کی تڑپ دیکھی لیکن اس دُکھ کا مداوا اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ اس زخم پر محبت، ہمدردی اور تسلی کے پھاہے تو رکھ سکتی تھی لیکن اسے مندمل کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اُس نے بے بسی سے مسز جلال کی طرف دیکھا جو اب رونے لگ گئی تھیں۔

"آنٹی پلیز چپ کر جائیں ورنہ....." اُس نے دانستہ بات اَدھوری چھوڑ دی۔ مسز جلال نے بھیگی پلکیں اُٹھا کر اس کی سمت دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

"ورنہ...... میں ایسے روؤں گی کہ آپ چپ نہیں کروا سکیں گی۔" ان کو خاموش دیکھ کر ماہ نور نے جملہ پورا کیا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے منع کیا اور اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

"اچھا چلیں اُٹھیں ذرا لاؤنج تک ہو کر آتے ہیں۔" ماہ نور کے کہنے پر انہوں نے سائیڈ پر پڑا دوپٹہ اُٹھایا اور دھیرے سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھیں۔ ماہ نور بغور ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان کے پاؤں اور ٹانگیں غیر محسوس انداز میں لڑکھڑا رہی تھیں۔ دس بارہ قدم چل کر انہوں نے دروازے کو تھام لیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگیں جیسے بہت دور چل کر آ رہی ہوں۔ ماہ نور تیزی سے آگے بڑھ آئی۔

"آنٹی...... میں ہاتھ پکڑ لوں آپ کا؟"

"نہیں نور...... میں لاؤنج تک خود چل کر جانا چاہتی ہوں۔" سانس ہموار کرنے کے بعد انہوں نے پھر آگے قدم بڑھا دیئے۔ یونہی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لاؤنج میں رکھے صوفہ سیٹ تک

پہنچ گئی تھیں۔ وہ دھیرے سے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اتنی سی دیر میں ہی عجیب سی تھکن ان پر غالب آ گئی تھی لیکن ان کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑی کامیابی پا لی ہو۔

"نور... نور اب میں چل سکتی ہوں۔ بغیر سہارے کے... اپنے پاؤں سے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جب میں بستر پر تھی تو یہی سوچا کرتی تھی کہ اب شاید تمام عمر مجھے اپاہج اور دوسروں کا محتاج بن کر رہنا پڑے گا۔ میں کبھی اپنے قدموں پہ کھڑی نہیں ہو سکوں گی لیکن تمہاری کوششوں سے اور تمہاری محنت سے آج میں ٹھیک ہو گئی۔" انہوں نے سارا کریڈٹ اس کے کھاتے میں ڈال دیا۔ ماہ نور ان کے الفاظ سے کچھ جھینپ گئی۔

"اوہو آنٹی... اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ آپ کے ٹھیک ہونے میں قیمتی اور سریع الاثر ادویات، میری کوشش اور آپ کی مضبوط قوتِ ارادی تینوں شامل ہیں۔ اس لیے تنہا کریڈٹ مجھے مت دیں۔"

"نہیں نور، تمہاری محنت کے ساتھ ساتھ تمہاری محبت بھی شامل تھی اور اس دنیا میں جو خوبصورت چیزیں ہیں ناں جنہیں دیکھ کر جینے کو، سانس لینے کو دل کرتا ہے۔ انہی میں سے ایک تم بھی ہو۔" ان کے لہجے میں اس کے لیے اتنی محبت اور مٹھاس تھی کہ وہ حیران سی رہ گئی۔

"اچھا چلو چھوڑو تم یہ بتاؤ کہ اپنی اماں اور بہنوں سے کب ملوا رہی ہو؟"

"آج ہی... سر نے انہیں شام کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ تب تک وہ رہی سہی سیٹنگ اور کام سے فارغ ہو جائیں گی۔"

"ارے تو معظم کے مہمان وہی تو نہیں۔"

"جی ہاں... انہی کے بارے میں سر نے بات کی تھی۔"

"نور! ایسا کرو ذرا کچن کا جائزہ لے لو۔ تم آج یہی سمجھ لو کہ تم ان کی نہیں میری بیٹی ہو۔ گھر میں آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ خدا جانے زیتون نے کوئی ڈھنگ کی ڈش بھی بنائی ہو گی یا نہیں۔ دو چار اچھی اچھی ڈشیں خانساماں سے اپنی نگرانی میں بنوا لو۔"

"ارے آنٹی اتنے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میری اماں بہت سادہ مزاج کی ہیں۔ یوں بھی وہ اسے اپنا گھر سمجھ کر آئیں گی اتنا تکلف دیکھ کر پریشان ہو جائیں گی۔" ماہ نور مسکراتے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں انہیں سمجھا لوں گی۔ تم بس جا کر کچن دیکھو۔ چلو شاباش۔" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے اُسے کچن کی طرف دھکیلا۔ پھر اُس نے تکرار مناسب نہیں سمجھی اور سعادت مند بیٹیوں کی طرح کچن سدھاری۔

خالہ زیتون اپنی کام چوری کا یہاں پورا ثبوت دے گئی تھیں۔ میٹھے کے نام پر کچھ بھی نہیں تھا۔ شوربے والا مرغی کا گوشت بنا ہوا تھا اور بس۔ ماہ نور نے جلدی جلدی بازو اوپر چڑھائے اور کام میں جت گئی۔ خانساماں کو اُس نے چاول چننے، پیاز کاٹنے اور دوسری تیاریوں پر لگا دیا جبکہ خود اُس نے پہلے شاہی ٹکڑے تیار کر کے فریج میں رکھے۔ پھر گوشت کی یخنی بنانے لگ گئی۔

"نور... کیا ہو رہا ہے؟" آواز پر چونک کر وہ مڑی تو دیکھا۔ مسز جلال کچن کے دروازے پر کھڑی تھیں۔

"کافی دیر سے بیٹھی ہوئی تھی۔ سوچا جا کر دیکھوں میری بیٹی کیا کر رہی ہے۔"

"آنٹی... آپ یہاں بیٹھ جائیں، زیادہ دیر کھڑی نہ رہیں۔" ماہ نور نے جلدی سے سٹول ان کے قریب رکھا اور آگے بڑھ کر اس پر ٹک گئیں۔

"یہ زیتون کیا کیا تیار کر کے گئی تھی۔" مسز جلال نے پوچھا۔

"چکن بنایا تھا شوربے والا۔"

"دیکھ لو اس کی ہڈ حرامی... صبح خاص طور پر بلا کر کہا کہ معظم کہہ کر گیا ہے دو چار ڈشیں... تیار کر دینا۔ ایک تو میں اس عورت سے بہت تنگ ہوں۔ عین وقت پر ذلیل کروانے والی حرکت ہے یہ۔ نہیں ہو سکتا تو منہ سے بھی پھوٹتی کہ بندہ خود کچھ کر لے۔"

وہ جیسے خالہ زیتون کی اس حرکت سے سخت نالاں تھیں۔

"چھوڑیں آنٹی... آپ کڑھیں نہیں، میں نے کافی تیاری کر لی ہے، شاہی ٹکڑے اور قیمہ مٹر تیار کر چکی ہوں۔ پلاؤ کی بھی تیاری مکمل ہے۔ سلاد اور رائتہ چاچا سلیمان تیار کر دیں گے۔"

"واہ بھئی بڑی کو ئیک سروس ہے ہماری بیٹی کی۔" انہیں حقیقتاً اس کی اس اپنائیت پر حد درجہ خوشی ہوئی۔

"آنٹی کچن میں گرمی ہے آپ چلیں باہر میں آتی ہوں۔ مصالحہ تیار کر دیتی ہوں پلاؤ کا مہمانوں کی آمد کے بعد چاولوں کو دم دے لیں گے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ بس تو پھر جلدی سے آ جاؤ۔" مسز جلال کچن سے باہر چلی گئیں اور ماہ نور اپنے کام میں لگ گئی۔

☆...... ☆...... ☆

گلاس وال سے باہر کھڑی شخصیت کو دیکھ کر ملک معظم کے ہونٹ بھینچ گئے تھے۔ پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئی تھیں اور آنکھوں میں حیرت اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ان کی نگاہیں مسلسل اُس شخصیت کا احاطہ کیے ہوئے تھیں جو باہر سیکرٹری کے دفتر میں کھڑا جانے اُس سے کیا کہہ رہا

تھا۔ پھر سیکرٹری نے انٹرکام کا ریسیور اُٹھالیا۔ بزر بجنے پر ملک معظم نے سپیکر آن کیا۔

''ہوں..... کیا بات ہے؟''

''سر..... یہ چوہدری الیاس صاحب تشریف لائے ہیں۔ پچھلے دنوں کپاس کی ڈلیوری کے سلسلے میں ان سے شاید آپ کی کوئی بات چیت ہوئی تھی۔ اُسی سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' سیکرٹری نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ بھیج دو اندر۔ یہ دوسرا شخص جو پاس کھڑا ہے ان کے ساتھ آیا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''او کے..... بھیجو انہیں اور پانچ دس منٹ بعد کافی بھجوا دینا اور جب تک یہ آفس میں موجود رہیں کوئی ڈسٹربنس نہیں ہونی چاہیے۔'' ملک معظم نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور سپیکر آف کر دیا۔ چند لمحوں بعد ہی کمرے میں چوہدری الیاس اور وہ دوسرا شخص داخل ہوئے۔

چوہدری الیاس کے بشرے سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ پچھلے دنوں حماد اور شہسوار کے مابین جو کچھ ہوا تھا' وہ اس سے باخبر ہے۔ وہ منافقانہ خوشدلی سے آگے بڑھا۔ ملک معظم بھی اپنی چیئر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں سے ہاتھ ملایا پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

چوہدری بے وجہ ہی مسکرائے جا رہا تھا۔ غالباً اپنے اور ملک معظم کے درمیان موجود کشیدگی اور تلخی کے احساس کو کم کرنا چاہتا تھا۔ ملک معظم نے گہری سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا۔ ''کہیے چوہدری صاحب! کیسے یاد کیا ہمیں؟'' ان کے لہجے میں غیر محسوس سے انداز میں طنز در آیا تھا۔

''وہ ملک صاحب پچھلے دنوں آپ سے کچھ کاروباری نوعیت کی بات چیت ہوئی تھی۔ شاید آپ کو یاد ہو۔''

''جی ہاں۔'' انہوں نے مختصراً کہا۔

''میں اسی سلسلے میں آیا تھا کہ فصل تیار ہو چکی ہے۔ آپ اپنی ڈیمانڈ بتا دیں تاکہ بروقت ڈلیوری کی جا سکے کیونکہ نازک فصل ہے زیادہ دیر تک رکھی نہیں جا سکتی۔''

''چوہدری صاحب اس وقت مل کی ڈیمانڈ تقریباً 125 ٹن کپاس کی ہے۔ کیا آپ یہ ڈیمانڈ دے سکتے ہیں۔''

''او جی کیوں نہیں..... اس سے کچھ زیادہ بھی ہو تو خیر ہے۔ کیا میں سمجھوں کہ میرا کام ہو گیا؟''

''بالکل ہو گیا..... لیکن کاغذی کارروائی سے پہلے کافی پی لی جائے۔ کیوں جناب؟'' ملک معظم نے چوہدری الیاس کے ساتھ آئے دوسرے شخص کو مخاطب کیا۔

''چوہدری صاحب! آپ نے ان کا تعارف نہیں کروایا۔''

''یہ سرفراز علی ہیں لندن سے حال ہی میں آئے ہیں اور سرفراز یہ ملک معظم ہیں۔ ملک ٹیکسٹائل مل کے اونر۔'' چوہدری الیاس نے تعارف کروایا۔

''ملک..... معظم..... ملک ٹیکسٹائل مل.....'' سرفراز علی نے عجیب سے انداز میں کہا تو چوہدری نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں سرفراز صاحب! کوئی خاص بات ہے؟''

''دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ دو اور پارٹنر بھی تو تھے حسین بخش اور راحت آفندی وہ کہاں ہیں؟'' سرفراز علی نے پوچھا۔

''اصل میں سرفراز صاحب پارٹنرز کے ہونے کی وجہ سے کافی پریشانی بن جاتی ہے۔ میرے والد کو بھی پارٹنر ہی نے دھوکا دیا تھا۔ سو میں نے اُن دونوں سے شیئرز خرید لیے تھے۔'' ملک معظم نے جواب دیا۔

''اچھا... راحت آفندی میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اس لیے پوچھ لیا تھا میں نے۔''

''ویسے ملک صاحب! ان کا اس مل سے بھی گہرا تعلق ہے؟'' چوہدری الیاس نے کہا تو ملک معظم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ جس سیٹ پر اس وقت آپ بیٹھے ہیں۔ آج سے پندرہ سال پہلے سرفراز علی اس سیٹ پر براجمان تھے۔'' چوہدری الیاس نے کہا تو ملک معظم کچھ حیرت اور کچھ عجیب ناقابل فہم سے تاثرات سے سرفراز علی کو دیکھے گئے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آج سے پندرہ سال پہلے تو اس سیٹ پر میرے والد بیٹھتے تھے لیکن ان کے پارٹنر نے بے ایمانیاں کر کے کاروبار کو نقصان پہنچایا۔ بڑی بڑی رقوم کے گھپلے کر کے بالآخر مل کا دیوالیہ نکال دیا اور خود یہاں سے لندن فرار ہو گیا۔'' ملک معظم کی بات سن کر سرفراز علی نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا تھا اور اس کا یہ پہلو بدلنا ملک معظم کی زیرک نگاہی کی زد میں آ گیا۔ ان کا ذہن ایک ثانیے کو ماضی کے دھندلکے میں کھو گیا۔ ماں کی آواز ان کے کانوں میں بازگشت بن کر اُبھری۔

''ملک صاحب! یہ سرفراز ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ آہستہ آہستہ سارے اکاؤنٹس خالی کر دیے ہیں اُس نے اور اب کوٹھی بیچنے کی بات کر رہا ہے۔''

''تو بیچ دو..... سرفراز ٹھیک کر رہا ہے جو بھی کر رہا ہے۔ تمہیں کاروباری معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔'' نشے میں ڈوبی ہوئی آواز نے ان کے حواسوں پر ایک لحظہ کو بوجھ سا طاری

کر دیا۔ پھر جیسے وہ چونک گئے۔ انہوں نے اپنے سامنے بیٹھی شخصیت کو بغور دیکھا۔

''سرفراز علی فرام لندن......'' ذہن میں کڑی سے کڑی ملتی جا رہی تھی۔

''کیا نام ہے آپ کے والد کا......؟'' سرفراز علی نے پوچھا۔

''ملک جلال......'' ملک معظم نے جواب دیا۔ ان کی گہری نظریں اس وقت چوہدری الیاس اور سرفراز علی پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کا جواب سن کر ان دونوں نے ہی چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں کے چہروں پر ایک پل کو بے چینی اُبھری لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے تیزی سے خود پر قابو پایا۔ اسی لمحے آفس کا دروازہ کھلا اور پیئن کافی لے کر آ گیا۔

''چوہدری صاحب...... لیجئے کافی پئیں۔'' پیئن کافی سرو کر کے چلا گیا۔ چوہدری الیاس اور سرفراز علی دونوں کنکھیوں سے بار بار ملک معظم کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے جبکہ ملک معظم بے حد سکون کے ساتھ کافی پینے میں مصروف تھے۔ کافی پینے کے بعد ملک معظم نے اگریمنٹ کی فائل چوہدری الیاس کے سامنے رکھ دی۔

''چوہدری صاحب! سائن کریں۔ اگریمنٹ فائنل ہو جائے گا۔'' چوہدری الیاس نے جلدی جلدی فائل پر دستخط کیے اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''او کے ملک صاحب! پھر ہمیں اجازت...... چلتے ہیں۔'' چوہدری الیاس نے ملک معظم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سرفراز علی بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ملک معظم نے دونوں سے مصافحہ کیا اور آگے پیچھے چلتے ہوئے ان کے دفتر سے باہر نکل گئے۔

ملک معظم پرسوچ نگاہوں سے دروازے کی سمت دیکھ رہے تھے جہاں سے وہ دونوں ابھی ابھی باہر نکلے تھے۔ وہ بہت چھوٹے نہیں تھے اور نہ ہی ناسمجھ۔ بارہ تیرہ سال میں بچے کو واقعات اور چہرے یاد رہتے ہیں اور اب انہیں اچھی طرح یاد آ گیا تھا کہ یہی وہ شخص تھا جو ان کے بابا کا پارٹنر تھا اور اکثر و بیشتر ان کے گھر پر آتا رہتا تھا۔ ان کے بابا اس شخص پر اندھا اعتماد کرتے تھے اور آخر کار انہوں نے اس شخص سے ناقابل تلافی نقصان اُٹھایا۔ صرف کاروبار ہی نہیں گھر کا سکون اور خود بھی برباد ہو گئے۔ تمام عمر ان کے بچوں کو بھرے گھر کا سکون میسر نہ ہوا اور آج طویل عرصے کے بعد انہیں شدت سے غازی کی یاد آئی تھی۔ اس سارے قصے میں سب سے زیادہ نقصان اس کا ہوا تھا۔ وہ دُکھی تھے لیکن ان کے پاس ماں جیسی نعمت موجود تھی جس کے گھنے سائبان جیسی شخصیت کے زیر سایہ وہ اپنے کھوئے ہوئے مقام پر دوبارہ واپس آ گئے تھے لیکن غازی......؟ کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا؟ کس حال میں تھا؟ جانے کیا کرتا ہوگا؟ کہیں مجرم تو نہیں بن گیا۔ یا ویسی ہی ورکشاپ میں سارا سارا دن ہتھوڑا چلاتے ہوئے خون پسینہ ایک کرنے کے بعد غربت کی سوکھی روٹیاں اس کا نصیب ہوتی ہوں

گی۔ ملک معظم کا ذہن اپنے کام سے بالکل ہٹ گیا تھا۔ کتنا ڈھونڈا تھا اسے کس قدر تلاش کیا تھا۔ کتنی بار اُس گلی کے چکر کاٹے تھے لیکن جس دن ماں انہیں لے کر گھر سے نکلی' بابا خبر نہیں غازی کو لے کر کہاں چلے گئے کہ پھر اس کی کوئی خبر ہی نہ ملی۔ ان کی آنکھوں میں گزرا کل روشن ہو چکا تھا۔ انہوں نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند کے خود کو سکون دینے کی کوشش کی لیکن بے سود ایک عرصے بعد آج جانے کیوں دوبارہ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ اُسی گلی کی خاک چھانیں جہاں وہ اور غازی مل کر کھیلتے تھے۔ جہاں ایک ہی ورکشاپ میں انہوں نے لوہے کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کو بھی پگھلتے جلتے دیکھا تھا لیکن اُس وقت وہ کتنے بے بس تھے۔ آج ان کے پاس اتنا اختیار تھا کہ چاہتے تو ایسی دس ورکشاپیں خرید کر خیرات کر دیتے لیکن کیا فائدہ تھا اس سب کا کہ غازی تو اُن سے دور کہیں تڑپتی سسکتی سانسیں لے رہا تھا۔ انہوں نے وقت دیکھا اور سیٹ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''آج پھر میں تمہیں ڈھونڈنے نکلوں گا۔ انہی گلیوں میں جاؤں گا غازی......''

آفس سے نکل کر پارکنگ ایریا کی طرف بڑھتے ہوئے ذہن میں سوچ رہے تھے اور کچھ ہی دیر بعد ان کی گاڑی جانے پہچانے راستے پر رواں دواں تھی۔

☆......☆......☆

''آنٹی...... تقریباً سارا کام ختم ہو گیا ہے۔ میں ذرا جا کر چینج کر لوں......'' ماہ نور دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کچن سے برآمد ہوئی۔

''اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔ میں اب ٹھیک ہوں کم از کم اُٹھ کر پانی پی سکتی ہوں۔ فی الحال ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے تم بے فکر ہو کر جاؤ۔'' مسز ملک کے اجازت دینے پر وہ باہر چلی آئی۔ شام کا دھندلکا چار سو پھیل چکا تھا۔ ہر چیز اپنی اصل شکل پر سرمئی لبادہ اوڑھے انوکھی سی لگ رہی تھی۔ جانے کیوں ماہ نور کو آج ہر چیز کا رنگ نیا اور جدا جدا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ آج اس کے اندر کی دنیا بدلی بدلی تھی۔ دل الگ دھڑک دھڑک کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ شوریدہ و سرجذبے جن کی طرف سے وہ منہ موڑے وہ ایک مشینی زندگی گزار رہی تھی۔ اُنہی جذبوں کی دھیمی دھیمی آنچ اُسے پگھلانے لگی تھی۔

یہ احساس کہ اس بھری دنیا میں ایک شخص صرف ایک شخص ایسا ہے جسے اس کا احساس ہے' جو اس کے ہر دُکھ ہر اذیت سے واقف ہے اور اس کی روح میں چبھے کرب کے کانٹے نکالنا چاہتا ہے۔ کیا سچ مچ اسے مجھ سے محبت ہے؟ اتنی محبت کہ میری طرف بُری نظر سے دیکھنے والے کی وہ آنکھیں نکال دے۔ اس کے دل میں اطمینان سرائیت کر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ لان کی سیڑھیاں اُتر رہی تھی جب بیرونی گیٹ کھلنے کی آواز پر ٹھٹک کر رُک گئی۔ سامنے گیٹ سے ملک معظم کی گاڑی اندر آ رہی تھی اور یہ

دیکھ کر وہ خوش ہوگئی کہ شہسوار بھی ان کے ہمراہ تھا۔ گاڑی پورچ میں رُکی اور وہ دونوں گاڑی سے اُتر آئے۔ شہسوار نے ماہ نور کو کھڑے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ماہ نور نے محسوس کیا کہ اس کی چال میں بہت غیر محسوس سی لڑکھڑاہٹ تھی یعنی ابھی وہ مکمل ٹھیک نہیں تھا اور ہسپتال سے ضد کر کے آ گیا تھا۔

''ہیلو مس ماہ نور...... کیا حال ہیں آپ کے؟'' وہ اس کے قریب آتے ہوئے خوشدلی سے بولا۔

''سر ہم تو ٹھیک ہیں آپ اپنی سنائیں۔''

''بالکل فٹ۔ ینگ اینڈ ایز جینٹ۔'' شہسوار کے لہجے میں کچھ شرارت سی محسوس کر کے ماہ نور اور ملک معظم دونوں ہی مسکرا دیئے۔

''آپ کیا جانے کی تیاری کر رہی ہیں؟'' شہوار نے پوچھا۔

''کہاں؟'' ماہ نور کی بجائے ملک معظم نے جواب میں پوچھا۔

''اپنے گھر......'' شہسوار نے کہا۔

''کون سے گھر......؟'' ملک معظم شہسوار کو جھنجلا رہے تھے۔

''بھائی کہاں ہے...... ان کا گھر جہاں یہ رہتی ہیں؟''

''کہاں رہتی ہیں......؟''

''افوہ بھائی آپ اب مجھے پریشان کر رہے ہیں۔'' شہسوار حقیقتاً زِچ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا جبکہ ماہ نور دونوں بھائیوں کی باتیں سن کر مسکرا کر رہی تھی۔

''شاری...... اب یہ یہیں رہیں گی یہی ان کا گھر ہے۔''

''اوہ...... کیا سچ مچ بھائی...... آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں۔'' شہسوار ان کی بات سن کر کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ ملک معظم بھی جان گئے تھے کہ وہ کیا سمجھا ہے جبکہ ماہ نور ہونق سی بنی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ ملک معظم نے کچھ شرارت سے پہلے اس کی طرف دیکھا پھر شہسوار کی طرف۔

''کیوں کیسا لگا......؟''

''فنٹاسٹک بھائی...... بہت اچھا......''

''مس ماہ نور فیملی کے ساتھ انیکسی میں شفٹ ہو چکی ہیں۔'' شہسوار یکدم جیسے ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُس نے جان لیا کہ ملک معظم نے اُس کے ساتھ شرارت کی ہے۔

''مس ماہ نور...... ماما جاگ رہی ہیں یا سو رہی ہیں۔''

''سر جاگ رہی ہیں......''

''او کے میرا خیال ہے آپ انیکسی کی طرف جا رہی تھیں آپ جائیں۔ ہم بھی ذرا ماما سے

شہسوار کو ملوائیں۔'' انہوں نے قدم آگے بڑھا دیئے تو ماہ نور انیکسی کی طرف آ گئی۔

انیکسی کے برآمدے میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ماہین اور گڈو چھوٹے سے احاطے میں چور سپاہی کھیل رہے تھے۔ ماہ نور لاؤنج میں داخل ہوئی اماں سامنے ہی عصر کی نماز کے بعد تسبیح کرنے میں مصروف دکھائی دیں۔ شاہین اور راہین سامنے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ انیکسی پر خاموشی کا راج تھا۔ غالباً وہ دونوں سو رہی تھیں۔ اُس نے ایک کمرے میں جھانکا تو وہ سامنے ہی بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی سوئی ہوئی نظر آ گئیں۔ ماہ نور نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ دوسری طرف گیلری تھی لیکن پھر بھی کمرے کے اندر پھیلا ہلکا اندھیرا کھڑکی کھلنے سے ختم ہو گیا تھا۔

''شاہین...... راہین اُٹھو بھئی تیاری کرو۔ دیکھو کیا بُرے حال میں ہو اور پڑی سو رہی ہو اُٹھو جلدی سے نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ سر اور آنٹی تم لوگوں کے منتظر ہیں۔ اتنا کہہ کر اُس نے خود دیوار گیر الماری سے لائٹ اورنج کلر کا کاٹن کا ہلکی پھلکی کڑھائی کا سوٹ نکالا اور باتھ روم میں گھس گئی۔ جب وہ نہا کر باہر نکلی تو اچھی خاصی چہل پہل ہو رہی تھی۔ شاہین کپڑے استری کر رہی تھی جبکہ اماں بالکل تیار تھیں اور اب ماہین اور گڈو کو تیاری میں مدد دے رہی تھیں۔ اس کے باہر نکلتے ہی راہین نے باتھ روم پر دھاوا بولا۔ جتنی دیر میں وہ باتھ روم سے باہر نکلی شاہین نے لاؤنج اور کمروں میں پھیلا ہوا کاٹھ کباڑ ٹھکانے لگایا۔ اماں کی نظریں یکے بعد دیگرے اپنی تینوں بیٹیوں پر پڑیں۔ لمبے لمبے سیاہ بال پشت پر بکھرائے سیاہ آنکھوں اور شہد ملی دودھیا رنگت کیسے تینوں ہی یکدم ایک جیسی لگنے لگی تھیں۔ اماں کے مسکراتے لب بھینچ گئے اور ماتھے پر تفکر کی لکیریں تن گئیں۔

''اماں کیا ہوا......؟ اب دیر کس بات کی ہے؟ چلیں۔'' شاہین نے کندھے پر دوپٹہ سیٹ کرتے ہوئے اماں سے پوچھا تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگی ہوں۔

''ہاں...... ہاں چلو......'' وہ سب اکٹھے ہی باہر نکلے۔ اماں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی۔ ماہ نور سب سے پہلے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ ملک معظم، شہسوار اور مسز جلال وہیں لاؤنج میں رکھے صوفوں پر براجمان تھے۔ تینوں کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ ماہ نور کو دیکھ کر مسز جلال کے خوبصورت چہرے پر محبت کا تاثر پھیل گیا اور لب مسکرا اُٹھے۔ ماہ نور کے پیچھے شاہین اور پھر راہین اندر داخل ہوئیں۔ لاؤنج میں پہلے سے موجود تینوں افراد نہایت انہماک و اشتیاق سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ شہسوار کی نظریں دوسری اور پھر تیسری بار راہین کے چہرے کا احاطہ کرنے لگیں۔ سولہ سترہ سال عمر چہرے پر معصومیت اور پاکیزگی، نازک شاخ کی طرح ڈولتی لمبے گیسوؤں والی راہین جیسے لچکتی ہوئی اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اُترتی جا رہی تھی۔

''شیت بے وقوف......'' شہسوار نے گویا خود کو ڈانٹا۔

گڈو اور ماہین بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی آ گئے تھے اور اب بے تکلفی سے سارے لاؤنج کا جائزہ لے رہے تھے۔ ماہ نور نے شاہین اور راہین کا تعارف کروایا۔ مسز جلال نے دونوں کو اپنے قریب بٹھالیا۔

''نور یہ تو تمہارے ہی جیسی ہیں گڑیا سی پیاری پیاری۔'' انہوں نے برملا تعریف کی تو وہ دونوں جھینپ گئیں۔

''راہی یہ اماں کہاں رہ گئیں؟'' ماہ نور نے ابھی پوچھا ہی تھا کہ اماں لاؤنج کے دروازے سے داخل ہوئیں۔ سب کی توجہ انہی کی طرف تھی لیکن مسز جلال کی آنکھیں تو جیسے اُن پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اماں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ دونوں چہروں پر گزرے وقت نے شکنوں کے جال ضرور بچھا دیے تھے لیکن آئینے پر کتنی ہی گرد کیوں نہ جمی ہو اُس میں دھندلے عکس ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ مسز جلال اور اماں یک ٹک ایک دوسرے کی سمت یوں دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں کسی نے مسمرائز کر دیا ہو لیکن نہیں وہ دیکھ ضرور رہی تھیں۔ حال نہیں ماضی کے دھندلکے میں کھوئے ہوئے پل۔ دیکھنے والے کو اُن پر سکتے کا گمان ہو رہا تھا۔ ماہ نور اور ملک معظم، شہوار اور باقی سب حیران سے کھڑے تھے کہ یکدم مسز جلال چونک اُٹھیں۔

''زری..... زری تم.....'' اور تیزی سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اماں نے بھی قدم آگے بڑھا دیے اور اگلے ہی پل دیکھنے والوں نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ یوں جیسے ان دونوں میں صدیوں جدائی حائل رہی ہو۔

''رابعہ..... رابعہ تم کہاں چلی گئی تھیں بنا پوچھے..... بنا بتائے؟'' اماں گلوگیر آواز میں بولیں۔

''سب کچھ بتا دوں گی تم یہاں آؤ۔ بیٹھو۔'' مسز جلال اماں کا بازو تھام کر صوفے تک لے آئیں اور خود بھی ان کے قریب بیٹھ گئیں۔ ''ہاں اب بتاؤ کہاں چلی گئیں تم؟''

''کیا کرتی پھر، بدنما داغ لگ گیا تھا ماتھے پر میں تو مارے شرمندگی کے کسی کے سامنے نہیں آتی تھی۔ یوں لگتا تھا ساری دنیا مجھ پر طنز کر رہی ہے۔ لوگ میری ذات پر ہنس رہے ہیں۔ جانتی ہو ناں زری کہ مجھے عزت کے لیے مر بھی جانا پڑتا تو مر جاتی لیکن ان بچوں کی محبت نے مجھے زندہ رکھا۔ یہی سوچ کے سانسوں کا زہر پیتی رہی کہ ان بچوں کا خدا کے بعد میرے سوا کوئی نہیں تھا۔''

''جانتی ہوں..... اچھی طرح جانتی ہوں رابعہ..... میں نے تمہارے ساتھ دوپٹہ بدلا ہے۔ میری اپنی کوئی بہن نہیں لیکن تم مجھے بہنوں جیسی عزیز تھیں اور ہو۔ محلے کے لوگوں نے تمہارے جانے کے بعد جلال کی باتوں پر یقین کر لیا تھا لیکن کلثوم تمہارے متعلق ہر بات جانتی تھی یا پھر میں۔ ہم

دونوں نے بہت کوشش کی کہ اُن لوگوں کو اصل بات سے آگاہ کر دیں لیکن بے سود۔ خیر چھوڑو تم یہ بتاؤ ان گزرے سالوں میں کیسے گزری؟''

''ویسی ہی جیسے جسم کے کسی نازک حصے میں نشتر چبھو دیا جائے اور اُس نشتر سمیت آدمی چلتا پھرتا رہے دنیا کے کام کرتا رہا۔ زخم سے خون رِس رِس کر سارے وجود کو بھگوتا رہے اور پھر بھی انسان بے خبر رہے۔'' رابعہ کے لہجے میں ایک ایسی تڑپ اور اذیت تھی کہ اماں کا وجود جھنجھنا اُٹھا۔

''کیا مطلب؟''

''زری..... میں نے یہ پندرہ سال غازی کی جدائی میں ایسے ہی کاٹے ہیں۔ میرا بچہ وہاں تنہا رہ گیا اور جلال اُسے لے کر خدا جانے کہاں چلے گئے تھے کہ پھر ملا ہی نہیں۔'' ان کی آنکھوں میں دوبارہ سے آنسو آنے لگے تھے۔ پھر انہوں نے خود ہی اپنے اوپر قابو پایا اور آنسو صاف کرتے ہوئے اماں سے دوبارہ گویا ہوئیں۔ ''زری تم تو خوش رہیں ناں اپنے بارے میں بتاؤ؟ ویسے ایک بات یاد آ گئی آخر بھائی شفیق کی دعا قبول ہو ہی گئی۔'' وہ مسکرا رہی تھیں۔ ان کی نظریں ماہ نور، شاہین اور راہین پر تھیں۔

''کون سی دعا؟'' اماں نے اچنبھے سے پوچھا۔

''یہی کہ اگر بیٹیاں نوما جیسی ہوتی ہیں تو بھلے خدا چار دے دے۔ اللہ میاں نے چاروں ایک جیسی بنا کر بھیجیں۔ بالکل نوما جیسی..... زری..... یہ..... یہ ہی نوما ہے ناں؟'' انہوں نے ماہ نور کی طرف اشارہ کیا تو اماں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رابعہ کو جیسے یکدم ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر ماہ نور کی پیشانی چومی۔ اس دوران سارا وقت شہوار اور ملک معظم خاموشی سے دیکھتے رہے تھے۔ کچھ کچھ ان کی سمجھ میں بھی آ رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔

''زری..... شفیق بھائی کیسے ہیں..... ؟ کہاں ہیں رہتے ہو تم لوگ؟''

''وہ..... رابعہ وہ تو ہمیں پچھلے سال تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔'' اماں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ شریک زندگی اگر پیار کرنے والا احساس کرنے والا ہو تو اس کے جانے کے بعد زندگی آزار لگتی ہے اور اماں نے تو یکے بعد دیگرے کتنے صدمے سہے تھے ان کے بعد۔ ان کی پھول جیسی بچی کیسے کیسے نازک حالات کا سامنا کرتی رہی تھی اور یہ سب ان کے جانے کے بعد ہوا تھا۔ ورنہ جب تک وہ زندہ تھے، گھر بھر میں خوشیاں رقص کرتی تھیں۔ اماں کے منہ سے ان کی موت کا سن کر رابعہ بھی آبدیدہ ہو گئی تھیں کیونکہ وہ بھی ان کی بھائیوں جیسی شفقت سے بہرہ ور ہو چکی تھیں۔

''خواتین۔ خواتین..... یہ ٹریجک سین اور کتنا لمبا ہو گا؟ ہمیں بتا دیا جائے تا کہ ہم بوقت ضرورت آپ کے لیے بالٹیوں کا اہتمام کر سکیں۔'' شہوار کی کھنکتی ہوئی آواز جیسے موت زدہ ماحول

میں شہنائی کی صورت لگی تھی۔ اماں اور مسز جلال کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''زری! یہ میرا سب سے چھوٹا نمونہ ملک شہسوار۔'' مسز جلال نے اس کا تعارف کروایا۔

''یہ فاؤل ہے ماما۔ آپ نے آج تک بھائی کو نمونہ نہیں کہا۔''

''تو بیٹا جی اس کی حرکتیں بھی تو تم جیسی نہیں ہیں۔''

''تو میں کیا بندر بن کر پنکھے سے جھول رہا ہوں۔'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولا۔ ماحول یکدم ہی تروتازہ سا ہو گیا تھا۔ شاہین، راہین، ماہ نور، اماں، مسز جلال سب ہی اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔ ملک معظم نے بھی مسکراتے ہوئے انکھیوں سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں آج یہ لڑکی اپنی تمام تر سادگی کے ساتھ ان کے دل میں دھرنا مار کے بیٹھ گئی تھی۔ لمبے گھنے بال جو خشک ہو کر ہوا کی اٹھکھیلیوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ملک معظم کی آنکھوں میں نرم سیاہیاں سی گھل گئیں۔ شام انہیں اور بھی پیاری لگنے لگی تھی۔

''نور...... بیٹا مہمانوں کو آئے کچھ دیر نہیں ہو گئی۔'' یہ مسز جلال نے کہا۔ اشارہ تھا کہ سب کو کولڈ ڈرنکس پیش کی جائیں۔ ماہ نور اُٹھ کھڑی ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ سب کو کولڈ ڈرنکس سرو کر رہی تھی۔ مسز جلال آنکھوں میں محبت بھرے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

''تم واقعی میرے ہی گھر کے لیے بنی ہو۔ تبھی تو اتنی جدائیوں کے باوجود قریب آ گئے ہم۔'' اماں نے ان کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نظروں سے محور کی طرف اور کچھ سوچ کر مطمئن ہو گئیں۔ کھانا ماہ نور نے شاہین کی مدد سے ٹیبل پر لگایا تھا۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد راہین نے ٹیبل پر سے برتن اُٹھائے۔

ملک معظم کچھ دیر بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے جبکہ شہسوار کا ابھی وہاں سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی مسکراتی نظریں ادھر ادھر آتی جاتی راہین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ شاید راہین کو بھی کچھ محسوس ہوا تھا کہ وہ شہسوار کی موجودگی سے نروس سی دکھائی دے رہی تھی۔ اماں اور مسز جلال اب آپس میں پرانی باتیں چھیڑے بیٹھی تھیں۔ حقیقتاً آج کا دن ماہ نور کے لیے بہت ہی مختلف رہا تھا۔ غیر متوقع واقعات نے اُسے خوشی سے زیادہ بوکھلا دیا تھا۔ مسز جلال کا ٹھیک ہو جانا' اچانک بینک مین کا خط ملنا اور اب اماں اور مسز جلال کی دیرینہ دوستی۔ ہر چیز ہی اس کے لیے حیرت کا باعث تھی۔ وہ وہیں اماں کے پاس بیٹھ گئی۔ مسز جلال اپنی ساری روداد انہیں سنا رہی تھیں جبکہ شاہین اور راہین بچوں کو لے کر انیکسی جا چکی تھیں۔ ماحول یکدم پھیکا سا پڑتے دیکھ کر شہسوار بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

''شاری' یہ تم اس طرح کیوں چل رہے ہو؟ ٹانگ پر چوٹ ووٹ تو نہیں لگی؟'' مسز جلال کی نظروں نے شہسوار کی غیر محسوس لڑکھڑاہٹ کو بھی محسوس کر لیا تھا۔

''وہ ماما ضیغم کے ساتھ بازار سے واپسی پر بائیک سے گر گیا تھا ٹانگ پر معمولی سی چوٹ لگی ہے۔ ٹھیک ہے اب۔''

''یہ ضیغم بھی کبھی سدھرے گا نہیں۔ ہزار بار کہا ہے کہ نہ اتنی تیز بائیک چلایا کرو مگر سمجھتا ہی نہیں۔''

''او ہو ماما جانے دیں میری ہی غلطی تھی۔ ٹھیک ہوں میں اب...... آپ پریشان نہ ہوں۔'' وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی اماں اور ماہ نور بھی انیکسی جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ مسز جلال ایک طویل عرصے بعد آج خوش ہوئی تھیں اور انہیں لگ رہا تھا جیسے آج وہ سکون کی نیند سوئیں گی۔

☆......☆......☆

ماہ نور ہڑبڑا کر اُٹھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی سوئی ہو۔ اُس نے سر اُٹھا کر شاہین، راہین کو دیکھا وہ بھی گہری نیند سو رہی تھیں۔ کل کا دن بہت اچھا لیکن تھکا دینے والا تھا۔ سب ہی رات کو تھکن سے بے حال تھے جہاں پڑے وہیں سو رہے کے مصداق بے سدھ پڑے تھے۔ اُس نے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ بال کنگھی کیے اور ہاتھ دھو کر کچن میں آ گئی۔ آٹا گندھا رکھا تھا۔ جلدی جلدی چار پانچ پراٹھے بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھے۔ چائے تیار کر کے تھرماس میں بھر دی اور خود ایک سادہ توس کے ساتھ چائے پی کر انیکسی سے باہر آ گئی۔ پورچ میں ملک معظم کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ آج شاید ان کا بھی دیر سے جانے کا پروگرام تھا۔ شرفو چاچا ان کی گاڑی صاف کر رہے تھے۔

''السلام علیکم چاچا...... کیا حال ہیں؟'' غالباً شرفو چاچا ابھی ابھی یہاں پہنچے تھے اور آتے ہی کام میں لگ گئے تھے۔

''وعلیکم السلام بی بی...... ٹھیک ہیں ہم بس بیوی ٹھیک نہیں رہتی۔''

''چاچا کیا ہوا ہے آپ کی بیوی کو......؟''

''ارے بیٹا کچھ نہیں ہے۔ بس معمولی سی بھی تکلیف ہو تو فوراً بلا بھیجتی ہے۔ جانے کیوں اسے یہ وہم ہو گیا ہے کہ کسی دن میری غیر موجودگی میں اُسے کچھ ہو جائے گا۔ اصل میں وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔ دراصل بی بی جن لوگوں کے بچے نہیں ہوتے ناں۔ ایسے میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے سب کچھ ہوتے ہیں۔''

''اب تو ٹھیک ہیں ناں وہ؟'' ماہ نور نے پوچھا۔

''ہاں اب تو خیر سے ٹھیک ٹھاک ہے۔'' شرفو چاچا نے ونڈ اسکرین پر کپڑا پھیرتے ہوئے

جواب دیا اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔ ماہ نور بھی کوٹھی کے اندرونی جانب بڑھی۔ انیکسی کی طرح یہاں بھی ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ اُس نے نہایت آرام سے مسز جلال کے بیڈ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا۔ ٹھنڈے یخ اے۔ سی روم میں وہ سینے تک کمبل اوڑھے بے خبر سو رہی تھیں۔ اُس نے دروازہ بھیڑ دیا۔ خالہ زیتون بھی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ماہ نور کو بوریت سی ہونے لگی۔

''ایسا کیوں نہ کروں کوئی کتاب ہی دیکھ لوں لیکن اس وقت تو شہسوار سویا ہوا ہوگا۔'' اس نے خود سے سوال کیا پھر خود ہی جواب بھی دے دیا۔

''تو سوتا رہے۔ اُس سے کیا لینا دینا۔ خاموشی سے جا کر ریک پر سے کتاب اُٹھا لاؤں گی۔'' اور اس نے فوراً ہی اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیا۔ بہت آرام سے شہسوار کے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ غالباً اُس نے کمرے کی تمام کھڑکیوں پر پردے ڈال رکھے تھے۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن یہ دیکھ کر اس کے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے کہ شہسوار بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اس کی نظریں آہٹ پر دروازے کی طرف اُٹھیں تو ماہ نور کو دیکھ کر ایک لمحے کو اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پھیلے دوسرے ہی لمحے اُس نے مسکرا کر اُسے مخاطب کیا۔

''آیئے مس ماہ نور...... وہاں کیوں رُک گئیں۔ آیئے بیٹھیے۔'' اس کے لہجے سے بشاشت جھلک رہی تھی جبکہ ماہ نور نے جب کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کو دیکھا تھا تو اس وقت وہ کچھ متفکر سا نظر آیا تھا۔ شاید یہ اس کا وہم تھا۔ اس نے خود سے کہا۔

''وہ سر......''

''آپ مجھے شہسوار بھی کہہ سکتی ہیں......'' شہسوار کے کہنے پر ایک لمحے کو وہ ہچکچائی۔

''وہ شہسوار دراصل آنٹی سو رہی تھیں۔ اماں وغیرہ بھی سب غالباً رات کو دیر ہو جانے کے باعث ابھی تک سو رہے ہیں۔ اکیلی بور ہو رہی تھی اس لیے سوچا کہ یہاں سے کوئی کتاب ہی لے کر پڑھ لوں لیکن شاید میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔''

''بالکل غلط...... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ جب چاہیں جس وقت چاہیں یہاں آ سکتی ہیں۔ بلا روک ٹوک۔ ویسے ایک بات بتائیں۔ یہاں شفٹ ہونا آپ کو کیسا لگا؟''

''بہت اچھا...... اس لیے کہ آنٹی اور اماں ایک طویل عرصے کے بعد ملی ہیں۔ اب مجھے یقین ہے آنٹی زیادہ اُداس نہیں رہا کریں گی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ ماما کو میں نے بہت عرصے بعد اتنا خوش دیکھا ہے۔ رات کو کس طرح وہ خوشی خوشی آپ کی اماں کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں ورنہ ایک طویل عرصہ ہو گیا ماما کو میں نے بہت کم ہنستے بولتے دیکھا ہے۔'' شہسوار کے ساتھ ملک معظم کے لیے بھی مسز ملک کا رویہ کچھ حیران کن تھا۔

اسی سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ مسز ملک اور ماہ نور کی اماں کے درمیان کس قدر دیرینہ مراسم ہوں گے۔

''آپ کی ٹانگ کا زخم اب کیسا ہے؟'' ماہ نور نے پوچھا۔

پہلے سے تو کافی حد تک ٹھیک ہو گیا ہے۔ دو چار دنوں میں ٹانکے کھل جائیں گے۔'' شہسوار نے جواب دیا۔ اسی پل دروازے پر کھٹکا ہوا۔ دونوں نے بیک وقت اُس طرف دیکھا۔ دروازے میں ملک معظم کھڑے تھے۔ وہ اس وقت ماہ نور کی وہاں موجودگی کی توقع نہیں کر رہے تھے۔

''آیئے بھائی...... وہاں کیوں کھڑے ہو گئے؟'' شہسوار کو ان کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا۔ وہ کمرے کے اندر آ گئے۔

''ماہ نور...... آپ اس وقت یہاں...... خیریت تو ہے نا؟'' فکرمندی ملک معظم کا انداز تھی۔

''وہ سر آنٹی سو رہی تھیں۔ رات کافی دیر سے سوئی تھیں اس لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ میرے ڈیوٹی آورز تھے اس لیے میں نے واپس جانے کی بجائے بہتر یہی سمجھا کہ جب تک وہ سو رہی ہیں اتنی دیر یہاں سے کوئی کتاب لے کر پڑھ لوں۔ یہاں آئی تو شہسوار صاحب جاگ رہے تھے۔ سو بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔''

ملک معظم شہسوار کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر اُلجھن اور پریشانی کی پرچھائیاں رقصاں تھیں

''بھائی!'' شہسوار نے ان کے چہرے پر گہری نظریں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں!''

ملک معظم نے شہسوار کی طرف دیکھا اور سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ''شاری مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''کہیں بھائی...... ویسے مجھے بھی آپ سے بہت اہم اور ضروری بات کرنی ہے۔'' شہسوار کے لہجے پر انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''پہلے آپ کہیں بھائی...... آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟''

''شاری میں پہلے تمہاری سننا چاہتا ہوں۔''

''آپ تو بتائیں کیا مسئلہ ہے؟ میں بھی بتا دیتا ہوں۔''

''تم چھوٹے ہو...... بڑوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ چھوٹوں کی پریشانیاں حل کریں۔ اس لیے پہلے تم کہو کیا مسئلہ ہے؟'' ان کی بات سن کر وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالی۔ ماہ نور نے اپنی موجودگی کو مناسب نہ سمجھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''سر میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔'' ماہ نور کی بات سن کر ملک معظم نے شہسوار کی طرف دیکھا۔

''نہیں مس ماہ نور آپ بیٹھیں..... ایسی کوئی پرائیویٹ بات نہیں ہے۔'' شہسوار نے کہا اور پھر تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ نکال کر ملک معظم کی طرف بڑھا دیا۔ ہلکے آسمانی رنگ کا لفافہ دیکھ کر ملک معظم جیسے چونک پڑے۔ انہوں نے دھڑکتے دل کے ساتھ شہسوار کے ہاتھ سے وہ لفافہ لے لیا۔ لفافے کے اندر ایک تہہ شدہ سفید کاغذ تھا۔ انہوں نے کاغذ کھولا اور ان کی نظریں کاغذ پر لکھی سطروں پر پھسلنے لگیں۔

چھوٹے ملک صاحب!

آداب!

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کے الیکشن سے دستبرداری کے فیصلے نے آپ کا معترف کر دیا۔ آپ واقعی بہت ذہین اور دانشمند ہیں مگر ملک صاحب' ایک شکایت ہے آپ سے۔ سنا ہے کہ دستبردار ہونے کے بعد آپ کسی قسم کا کوئی ایکشن لینے کے متعلق سوچ رہے ہیں.....؟ ملک صاحب! یہ بات تو آپ کی دانشمندی سے متصادم ہے..... ہے ناں! کچھ اپنا خیال کریں۔ بڑے ملک صاحب کا' ان کی عزت کا خیال کریں۔ کچھ ماں جی کا بھی خیال کریں!! آپ کے کہنے کے مطابق میں نے تو چاروں کو قتل کرنے کی کوشش کی اگر ایک بچ گیا تو یہ اس کی خوش قسمتی۔ اگر آپ اس بات پر خفا ہیں تو اس میں تو خفگی کی ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر وہ خوش قسمتی سے اس بار بچ گیا ہے تو آئندہ نہیں بچے گا۔ باقی آپ ایکشن ویکشن کے متعلق اگر ذہن میں کچھ سوچ بیٹھے ہیں تو اسے ذہن سے نکال دیں ورنہ گستاخی معاف' ان چار قتلوں کا اقرار نامہ اعلیٰ حکام تک بھی پہنچا سکتا ہوں۔ باقی آپ ذہین اور دانشمند ہیں.....!

خیر اندیش

بلیک مین

ملک معظم کے چہرے پر گہری پریشانی کھنڈ گئی۔ کاغذ ان کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ وہ یوں ساکت بیٹھے ہوئے تھے جیسے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوں۔ ماہ نور ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ تو خبر نہیں تھی کہ اصل معاملہ کیا ہے لیکن ملک معظم کی سنجیدگی اور ان کے چہرے پر پھیلے پریشانی

کے تاثرات سے اُس نے اتنا ضرور اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملہ حد درجہ گھمبیر تھا کیونکہ ملک معظم کسی چھوٹی موٹی پریشانی کو خود پر سوار کرنے والے ہرگز نہیں تھے۔ انہوں نے گہری نظروں سے شہسوار کی طرف دیکھا اور انتہائی سنجیدگی میں بولے۔

''شاری۔ یہ لفافہ تمہیں کیسے ملا؟''

''بھائی۔ صبح میری آنکھ کھلی اور میں نے پانی پینے کے لیے بیڈ سائیڈ سے گلاس اُٹھانا چاہا تو اس کے بالکل قریب یہ کاغذ پڑا ہوا تھا۔ جانے کس وقت اور کون اسے یہاں رکھ گیا۔ جس وقت میں نے یہ خط پڑھا۔ اس کے بعد پھر میری آنکھ نہیں لگی۔'' شہسوار کا جواب سن کر وہ ایک پل کو بالکل خاموش رہے۔ جانے وہ کیا سوچ رہے تھے۔

''بھائی۔ آپ نے مجھ سے کیا بات کرنی تھی؟!'' شہسوار کے پوچھنے پر ملک معظم نے اس کی طرف ایک پل کو سنجیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ شہسوار نے ان کے چہرے پر پھیلے غیر معمولی تاثرات نوٹ کر لیے تھے۔ یقیناً وہ کوئی غیر متوقع بات کرنے والے تھے۔ خاموشی کے یہ لمحے کافی گراں تھے۔ پھر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور شہسوار ان کے ہاتھ میں ویسا ہی آسمانی رنگ کا لفافہ دیکھ کر بری طرح چونک پڑا۔ ملک معظم نے وہ کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کاغذ تھامتے ہوئے ایک پل کو شہسوار کا ہاتھ کانپا تھا۔ اس نے ملک معظم کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے لفافے میں سے کاغذ نکالا اور کھول کر پڑھنے لگا۔ تحریر بلاشبہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔

بڑے ملک صاحب!

آداب!

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کے بھائی نے الیکشن سے دستبرداری کا اعلان کر کے ہوش مندی کا ثبوت دیا لیکن سنا ہے آپ میرے خلاف کوئی ایکشن لینے کا سوچ رہے ہیں۔ ملک صاحب! یہ ٹھیک تو نہیں۔ کچھ اپنے چھوٹے بھائی کا خیال کریں۔ ماں جی کا خیال کریں۔ سنا ہے آپ کو اپنے چھوٹے بھائی سے بے حد پیار ہے اگر ایک ہلکی سی کھرونچ بھی اسے لگ جائے تو آپ برداشت نہیں کر سکتے اور اگر اس کی کنپٹی میں ایک سوراخ ہو جائے تو......؟ ملک صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض نہیں ہوا کرتے۔ آپ کے کہنے کے مطابق میں نے تو چاروں کو ہی ختم کرنا چاہا تھا اگر ایک بچ گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے۔ آپ خفا ہیں تو بہت جلد اُسے بھی عدم کو

چلنا کریں گے۔ ویسے اگر ایسا ہی اقرار نامہ پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچ جائے۔ ایک ہی ایک مل ہے آپ کی جسے آپ نے شب و روز کی محنت سے اسٹیبلش کیا ہے اور جس کی وجہ سے اونچے طبقے میں آپ کا ایک مقام ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فقط ایک دھماکہ ہو اور وہ خاک کے ساتھ خاک ہو جائے۔ ویسے ملک صاحب! مجھے آپ سے دانش مندانہ فیصلے کی توقع ہے۔ اُمید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

خیر اندیش

بلیک مین

شہسوار کے چہرے کے بدلتے رنگ خط میں لکھے الفاظ کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اُس نے نظر اُٹھا کر ملک معظم کی طرف دیکھا وہ اسی جانب متوجہ تھا۔

''بھائی سمجھ نہیں آتی کہ آخر یہ شخص ہم سے چاہتا کیا ہے؟ کیوں ہم پر ہماری سانسیں تنگ کر رہا ہے؟ کیوں زندگی اجیرن کر رہا ہے ہماری۔ اب تو بات بہت بڑھ گئی ہے۔ بھائی کیا اس کا کوئی حل نہیں؟'' شہسوار کے لہجے سے پریشانی ہویدا تھی۔

''ہوں......! حل ہو تو سکتا ہے لیکن ابھی کنفرم نہیں کہ وہ قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال میں دیکھوں گا!'' ملک معظم کسی گہری سوچ کے زیرِ اثر بول رہے تھے۔

''بھائی...... یہ خط آپ تک کیسے پہنچا؟'' شہسوار نے پوچھا۔

''جس طرح تم تک پہنچا شاری......'' ملک معظم نے جواب دیا۔

''بھائی یہ شخص انتہائی خطرناک ہے جو آدمی اس قدر رازداری سے ہمارے بیڈ رومز کے اندر داخل ہو کر ہمارے اس قدر نزدیک پہنچ سکتا ہے' وہ ہمارے سینے میں خنجر بھی اُتار سکتا ہے۔'' شہسوار کا خدشہ کسی حد تک ملک معظم بھی درست مان رہے تھے۔ اس لیے کہ آج جس شخص نے بلیک مین کو ان دونوں بھائیوں کے پیچھے لگایا' کل وہ اسے اس بات کا معاوضہ بھی دے سکتا ہے کہ وہ ان دونوں کو قتل کر دے۔''

''ویسے بھائی...... بلیک مین کی شخصیت کچھ پُراسرار سی نہیں۔'' شہسوار نے کہا تو ماہ نور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن میں سیٹھ حبیب الرحمٰن کی کوٹھی کے اندر ہونے والے واقعات اور آئے تھے۔ کس طرح بروقت پہنچ کر اُس نے ماہ نور کی جان اور عزت بچائی تھی۔ اب بھی جب ماہ نور کو یاد آتا تھا کہ وہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی تھی کہ وقت پر بلیک مین وہاں پہنچ گیا۔ ورنہ جانے کیا ہوتا۔

''ہاں کسی حد تک...... وہ غلط آدمی ضرور ہے لیکن بے اصول نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ اسے

ہمارے پیچھے لگانے والا چوہدری الیاس کے سوا اور کوئی نہیں۔'' ملک معظم اس کے ساتھ بات بھی کر رہے تھے اور کچھ سوچ بھی رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت واہموں اور اندیشوں کے عکس نظر آ رہے تھے۔ بلیک مین کے موجودہ اقدام سے وہ صحیح معنوں میں پریشان ہو گئے تھے۔ ماہ نور بھی دونوں بھائیوں کے تاثرات سے اتنا تو جان ہی گئی تھی کہ بلیک مین نے ضرور ان کے خلاف کوئی کام ہے لیکن اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آخر ان دونوں بھائیوں کے ساتھ بلیک مین کا کیا رابطہ' تعلق یا دشمنی ہے۔

''بلیک مین......'' یہ نام اس کے دل کی دھڑکنوں میں عجیب سی تان بکھیر دیتا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ بلیک مین اچھا آدمی نہیں ہے لیکن جس طرح اُس نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا۔ آڑے وقت میں سائے کی طرح اس کے سنگ سنگ رہا۔ یہ اس کے لیے کم نہیں تھا لیکن اب ماہ نور یہی چاہتی تھی کہ ان دونوں بھائیوں اور بلیک مین کے درمیان کشیدگی نہ رہے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ یکدم کسی خیال کے زیرِ تحت اُس نے ملک معظم کو مخاطب کیا۔ ''سر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح اس شخص کے ساتھ آپ کی گفت و شنید ہو جائے۔''

اس کی بات سن کر انہوں نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ روشنی کا ایک جھماکا سا ان کے ذہن میں ہوا۔ انہوں نے شہسوار کی طرف دیکھا وہ اُنہی کی طرف متوجہ تھا۔ ماہ نور بھی اپنے سوال کے جواب کی منتظر تھی لیکن وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بہ عجلت شہسوار کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ وارڈ روب کی طرف بڑھے جس کے دراز میں ان کے پرانے کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہ سارے کاغذات الٹ پلٹ کر کے ایک پرانی ڈائری نکالی جس میں طلحہ نیاز کا دیا ہوا فون نمبر تھا۔ یقیناً آج بھی طلحہ نیاز کا اُس سے کوئی نہ کوئی رابطہ ضرور ہو گا۔ طلحہ نیاز چند روز قبل گوجرانوالہ شفٹ کر گیا تھا۔ اس لئے وہ اس سے پوچھ نہیں سکتے تھے۔ بہر حال کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد انہیں ان کا مطلوبہ فون نمبر دستیاب ہو گیا۔ وہ ڈائری ہاتھ میں لیے بیڈ کے قریب رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں موبائل تھا اور ذہن مختلف النوع سوچوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ موبائل پر چند مخصوص نمبروں کے بٹن پش کر رہے تھے۔

☆.........☆.........☆

حویلی کے مردان خانے میں اس وقت چوہدری کے ساتھ سرفراز علی بھی موجود تھا۔ حماد صبح کالج کے لیے نکل گیا تھا۔ آج کل وہ اونچی ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ سارے کالج میں شیخیاں بگھارتا پھر رہا تھا کہ وہ بلا مقابلہ جیتا ہے۔ یہ اور بات کہ کالج کے بہترین اور ہونہار اسٹوڈنٹس کو اس کا اس طرح جیت جانا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ چوہدری ناشتے میں مصروف تھا جس وقت سرفراز علی آیا' دونوں نے مل کر

چائے پی تھی۔ چائے پینے کے دوران سرفراز علی نے ملک جلال کا ٹاپک چھیڑ دیا۔

''چوہدری صاحب! کچھ اندازہ ہے کہ ملک جلال آج کل کہاں ہوتا ہے؟ ملک معظم کے پاس تو نہیں رہتا ہوگا۔ سنا ہے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔''

''ہاں سنا تو یہی تھا۔ بہر حال ہمیں کیا...... مر کھپ گیا ہوگا کہیں۔''

''لیکن چوہدری صاحب وہ تو مرتے مرتے جی اُٹھا سمجھیں۔ اس کا نام لیوا اس کا بیٹا تو ہے ناں۔''

''سرفراز علی! اس خاندان کے کسی فرد کو میں برداشت نہیں کرسکتا۔ ان میں سے کسی کو بھی دیکھ لوں تو میرا خون کھول اُٹھتا ہے۔ یاد ہے ناں تمہیں پندرہ سال پہلے میرے اور جلال کے درمیان کس قدر دوستانہ مراسم تھے۔ مجھے وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا۔ وسیم ڈوگر کے ہاں ایک تقریب میں میں نے پہلی بار جلال کی بیوی کو دیکھا تھا۔ جلال ان دنوں نیا نیا شراب اور جوئے کے چکر میں پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جوا کھیلنے والے اور شراب پینے والے کی غیرت ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے برملا اس کی بیوی کی تعریف کر دی تھی اور اُس نے بھری محفل میں مجھے تھپڑ مارا تھا۔'' چوہدری کے لہجے سے اب غصہ جھلکنے لگا تھا۔

''لیکن چوہدری صاحب! اُس تھپڑ کے بدلے میں آپ نے بھی کم تو نہیں کیا۔ اس کا گھر بار، کاروبار، بیوی بچے سب ہی کچھ چھن گیا اور خود وہ فٹ پاتھ پر رُلتا رہا۔''

''یہی چاہتا تھا میں...... اس کے خاندان کا ہر فرد بھیک مانگے۔ لوگ انہیں دھتکاریں تو میری تذلیل کا بدلہ پورا ہو۔''

''چوہدری صاحب! یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی ہم تو ہار گئے ناں۔''

''کیا مطلب؟'' چوہدری نے چونک کر غصے سے سرفراز علی کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھوں کی شاطرانہ چمک اس کے عیار اور کینہ پرور ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

''مطلب یہ کہ جس ملک جلال کو آپ نے کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیا تھا۔ آج اس کا بیٹا آپ سے بھی کہیں زیادہ اونچے مقام پر ہے۔'' اُس کی بات سن کر چوہدری کو پتنگے لگ گئے۔

''ہم سے کس طرح اونچے مقام پر پہنچ گیا وہ کل کا چھوکرا؟''

''وہ اس طرح کہ جو کچھ آپ نے اُن سے چھینا تھا جو ل...... کاروبار وہ دوبارہ سے ان سب کا مالک بن گیا۔ اُس نے وہ سب کچھ دوبارہ پا لیا ہے جو اُس نے چھن گیا تھا۔ پھر اس میں ہماری جیت کہاں ہے؟ ہم تو ہار ہی گئے ناں۔''

''نہیں رہے گا یہ مقام...... یہ مل...... جیت بہر صورت ہماری ہو گی اور کچھ؟'' چوہدری کے

لہجے سے سفاکی ٹپکنے لگی۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب کو رہنے دو۔ کچھ عرصہ ٹھہر جاؤ۔ مطلب سارے خود بخود کھل کر سامنے آ جائیں گے۔'' چوہدری جو بے چینی سے ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ کچھ مطمئن سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اُس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے ٹھیک ہونے کا اُسے سو فیصد یقین تھا۔ اُس نے سامنے ٹیبل پر رکھا موبائل اُٹھایا اور نمبر پریس کرنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ وہ بلیک مین سے بات کرنا چاہتا تھا!

☆............☆............☆

''ارے بیٹا... تم ہسپتال سے کس وقت آئے؟'' خالہ کلثوم نے اسے اپنے گھر کے دروازے کی دہلیز پر بیٹھے دیکھا تو اس کے قریب چلی آئیں۔

''کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''بیٹا زخم کیسا ہے اب......؟''

''کچھ بہتر ہے خالہ...... ہسپتال کے گھٹن زدہ ماحول سے جی اوب گیا تھا میرا۔ پھر بہت دنوں سے ماں کو نہیں دیکھا تھا ناں...... اس لیے چلا آیا۔'' ایک زخمی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ خالہ کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

جب اسے یہ علم ہوا تھا کہ اس کی ماں بے قصور ہے۔ وہ عورتوں کے نام پر دھبہ نہیں وہ تو عورتوں کے لیے قابلِ تقلید مثال ہے۔ کیا نہیں کیا تھا اس نے ان بہن بھائیوں کے لیے۔ بدلے میں اسے کیا ملا تھا۔ پچھلے پندرہ سال سے وہ غائبانہ نفرت کسی قیمتی متاع کی طرح اُس پر لٹاتا رہا تھا۔ کیا اس کی ممتا کو یہی خراج دینا تھا۔ جب سے اُس نے جانا تھا کہ اس کی ماں ظالم نہیں وہ تو خود ظلم کی چکی میں پستی رہی ہے۔ جانے کیسے اس کے نفرت گزیدہ دل میں محبتوں کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔

''خالہ ایک بات پوچھوں......؟''

''ہاں پوچھو بیٹا......'' خالہ کلثوم نے اس کی سرخ آنکھوں میں تڑپتی مچلتی آرزوؤں کا ایک جہان دیکھا۔

''خالہ کیا ماں مجھ سے پیار کرتی تھی......؟'' وہ جانتا تھا اُسے یاد تھا کہ اس کی ماں اُس سے پیار کرتی تھی۔ وہ اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ سب کچھ بھول جاتا لیکن جانے کیوں وہ تجدید چاہتا تھا۔

''ہاں بہت زیادہ...... سب بچوں میں تم حساس اور الگ تھلگ سے تھے۔ رابعہ کی سب سے زیادہ توجہ تمہارے لیے ہی ہوتی تھی۔'' خالہ کا جواب سن کر اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا۔

''خالہ ایک اور بات پوچھوں؟'' آج جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے دل کی کہے اور کوئی ہو جو اس کی سنے۔

''ارے بیٹا اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے؟ تم میرے بیٹے ہی ہو اور بیٹوں کو ماں سے کچھ کہنے کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' خالہ جیسے اس کے پرانے زخموں پر ممتا کا مرہم رکھ رہی تھیں۔

''خالہ کیا ہر شخص خواب دیکھتا ہے؟'' اس کے لہجے میں بچوں جیسی معصومیت اور اشتیاق تھا۔

''ہاں...... ہر شخص خواب دیکھتا ہے۔'' خالہ کلثوم نے جواب دیا۔

''کیوں......؟ کیوں دیکھتا ہے خواب؟''

''اس لیے کہ جینے کا ایک بہانہ بنا رہے۔ یہ خواب ہوتے ہیں ناں بیٹا۔ اندھیری راتوں میں چمکتے ستاروں کی طرح ہوتے ہیں یا پھر ویران حویلیوں میں بنے طاقوں پر رکھے چراغوں جیسے۔ ان کا کام ہوتا ہے ہمیں مایوسیوں سے بچا کر اُمیدوں کے اُجالے دینا۔ یہ آنکھوں کی جلن اور دُکھن پر شبنم کے چھینٹے ہوتے ہیں۔ اب تمہیں کیا بتاؤں بیٹا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ اگر نہ ہوتے تو شاید ہر شخص دنیا کی تلخیوں اور بدصورتیوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالتا۔''

''ہاں...... خالہ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ آج تک میں نے بھی خواب دیکھے لیکن خالہ ان خوابوں نے مجھے دن رات اذیت سے دوچار رکھا۔ میری ہنسی' میری خوشی مجھ سے چھین لی۔ کسی عذاب کی طرح میری روح پر مسلط ہو گئے۔ اس لیے کہ خالہ کہ ان خوابوں کی تعبیر میرے پاس نہیں تھی اور نہ کبھی ہو گی۔ خالہ میں...... میں آج تھک گیا ہوں۔'' اس کی سرخ آنکھوں میں آج نمکین سیال بہہ نکلا تھا۔ شاید اس کے اندر کا بچہ اپنی ماں کا طلب گار تھا اور وہ ماں ڈھونڈ کے اس کو لا کے دینے پر قادر نہیں تھا۔ سو آج اس کے ساتھ مل کر آنسو بہا رہا تھا۔

''نہیں بیٹا۔ ایسا مت کرو۔ ہر انسان کو زندگی میں اس کے حصے کے سکھ اور خوشیاں ضرور ملتی ہیں۔ تمہیں بھی ملیں گی کہ اوپر والا منصف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم نے کتنے دُکھ اُٹھائے ہیں۔'' خالہ کافی دیر اس کے پاس بیٹھی اسے تسلیاں دیتی رہیں اور پھر جب وہ قدرے پرسکون ہوا تو اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اچھا بیٹا اب میں چلتی ہوں۔ شام کو آؤں گی۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کمرے سے نکل گئیں۔ آج اسے خالہ دنیا میں اپنی واحد مونس و غمخوار نظر آئی تھیں جن کے سامنے اپنے دُکھ کو آنسوؤں کی شکل میں بہا کر اُسے کوئی شرمندگی نہیں ہوئی ایک طمانیت سی اسے رگ و پے میں سرائیت کر گئی تھی۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش اُبھری کہ یکدم کہیں سے اس کی ماں اس کے سامنے آ

جائے اور وہ اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جائے۔ اُس سے محبت کا اظہار کرے اس کی ممتا بھری آغوش میں سمٹ کر زندگی کے ہر کرب' ہر دُکھ سے نجات پا لے لیکن شاید ابھی کچھ اور دُکھ اس کے بھاگ میں لکھے تھے۔ اُسے ابھی کچھ دن اور یونہی حالات کی بے درد ٹھوکریں سہنی تھیں۔ وہ اس سب پر بھی راضی تھا لیکن اس کی آرزو تھی کہ جب اپنے حصے کے دُکھ کاٹ کر وہ اذیتوں کی قید سے چھٹکارہ پائے تو اس کا استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے اس کی ماں ہو۔

☆..... ☆ ..... ☆

یہ ایک کوٹھی کا تہہ خانہ تھا جو غالباً ریکارڈ سیکشن کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دیوار گیر الماریاں ان گنت فائلوں سے بھری پڑی تھیں۔ بلیک مین اپنے مخصوص حلیے میں ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر سینکڑوں پرانے اخباروں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ وہ ان اخبارات میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے بشرے سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ کسی اُلجھن میں ہے۔ جسے سلجھائے بغیر وہ چین نہیں لے گا۔ وہ ایک ایک کر کے نہایت توجہ سے ان اخبارات کی چھان پھٹک میں لگا ہوا تھا۔ جب سے وہ چوہدری الیاس کے ہاں سے آیا تھا۔ ذہنی طور پر انتہائی سٹریس میں تھا۔

''سرفراز علی......'' جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ نام سوئی کی طرح چبھ گیا۔

''آپ ماں کیوں نہیں جاتے کہ مل میں بھاری گھپلے کیے جا رہے ہیں اور یہ کام سرفراز علی کا ہی ہے وہ کاروبار کو تباہ کر رہا ہے۔ آپ اُس سے پوچھتے کیوں نہیں؟'' ایک نسوانی آواز اس کی سماعت میں گونجی۔

''سرفراز ایک دیانتدار آدمی ہے۔ تم خواہ مخواہ اس پر شک کر رہی ہو۔ اب تو وہ کہہ رہا ہے کہ وہ میرے کاروبار کے لنکس لندن تک لے کر جائے گا۔ یعنی امپورٹ ایکسپورٹ کے کسی سسٹم کی بات کر رہا تھا۔ فضول میں تم عورتوں کی عادت ہوتی ہے شک کرنے کی۔'' دوسری آواز کو تو وہ سینکڑوں ہزاروں آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

''سرفراز علی فرام لندن......'' اس کے ذہن نے یہ نام دوہرایا۔ اس کا چہرہ ناقابل فہم تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایسے ہی اخبارات چھانتے چھانتے اچانک ملک کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کی ایک سرخی پر اس کی نظر پڑی تو وہ چونک پڑا۔

''ملک ٹیکسٹائل مل کا دیوالیہ

ملک ٹیکسٹائل مل کے مالک ملک جلال حسین کو ان کے پارٹنر سرفراز علی
نے نشے کا عادی بنا کر مل سے کروڑوں روپے کا گھپلا کیا اور مل کے دلوالیہ
ہونے پر ملک سے فرار ہو گیا۔''

بلیک مین نے اُس خبر کے اردگرد سرخ پین سے دائرہ لگایا۔ اُلجھن دور ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اس کے ذہن میں اُمڈتی سوچوں کا پتہ چلا بہت مشکل تھا کیونکہ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ بظاہر کسی سمندر کی طرح پر سکوت تھا لیکن اس کے اندر ایک تلاطم برپا تھا۔ اُس نے کرسی سے پشت ٹکا کر ٹانگوں کو سیدھا کر کے ان کا اکڑاؤ کم کیا۔ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے گردن پر باندھے وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ یکدم اس کا موبائل بول اُٹھا۔ اُس نے سامنے ٹیبل پر رکھا موبائل آن کر کے کان کے ساتھ لگالیا لیکن بولا کچھ نہیں۔ دوسری طرف سے ہیلو کہنے کے بعد اس کا موبائل نمبر کنفرم کیا گیا۔

''ہاں...... یہی نمبر ہے۔'' اجنبی لب ولہجہ سن کر وہ کسی حد تک حیران تھا کیونکہ اس کا نمبر کسی کو پتہ نہیں تھا۔ وہ فون سے زیادہ بالمشافہ گفتگو کو پسند کرتا تھا۔

''مجھے پہچانا......؟'' دوسری طرف سے استفسار کیا گیا۔

''دیکھیے مجھے پہیلیاں بوجھنا پسند نہیں۔ سیدھی صاف بات کرنا اور سننا پسند کرتا ہوں۔'' بلیک مین کھردرے لہجے میں بولا۔

''ملک معظم بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے اپنا تعارف کروایا گیا۔ بلیک مین کی بھنویں سکڑ گئیں' پیشانی پر ایک لکیر نمودار ہوگئی جو اس کی اندرونی کیفیت کی غماز تھی۔

''ہوں...... پھر......''

''تمہارے خطوط موصول ہو چکے ہیں جو تم رات کی تاریکی میں ہمارے گھر میں کسی وقت رکھ گئے تھے۔''

''تو......'' بلیک مین نے پوچھا۔ انداز میں تجسس نہیں تھا یوں جیسے وہ ان کا اگلا جملہ جانتا تھا۔

''میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری ہماری کیا دُشمنی ہے۔ ہم تو تمہیں جانتے تک نہیں۔ پھر تم کیوں ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر رہے ہو؟ کیوں ہماری زندگی اجیرن کرنے پر تُلے ہوئے ہو؟'' ملک معظم کے لہجے میں بھی بے چارگی نہیں تھی' جھنجھلاہٹ تھی۔

''پوری دنیا میں میری نہ تو کسی سے دوستی ہے اور نہ ہی دُشمنی۔ میرا واحد دوست پیسہ ہے اور اس کی خاطر میں کسی کی بھی دُشمنی مول لے سکتا ہوں۔'' اس کا انداز حتمی اور لہجہ کرخت تھا۔

''تو کیا ساری دنیا میں صرف پیسہ ہی وہ واحد چیز ہے جس سے تمہاری دوستی ہے؟'' ملک معظم نے پوچھا۔

''ہاں......''

''تو کیا تم نے پیسہ کے لیے شہوار کے کیریئر کو نقصان پہنچایا؟''

''بالکل......''

''اور یقیناً یہ تین قتل بھی تم نے پیسے کی خاطر ہی کیے ہوں گے؟'' ملک معظم نے کہا۔

''ظاہر ہے......''

''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ کون شخص ہے وہ جو تمہیں پیسے دے کر ہمارے خلاف کام کروا رہا ہے؟''

''دیکھیے ملک صاحب! چونکہ پیسہ میرا واحد دوست ہے۔ اُس شخص کے تھرو مجھ تک پہنچتا ہے۔ سو میں اپنے دوست کی وجہ سے اُس شخص کا نام آپ کے سامنے نہیں لے سکتا۔'' بلیک مین نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''تم جانتے ہو ناں کہ اُس شخص نے تمہیں یہ پیسے اس لیے دیے ہیں تاکہ تم ہمیں برباد کر سکو۔''

''ہاں جانتا ہوں......''

''پھر بھی......'' ملک معظم کے انداز میں تاسف نمایاں تھا۔

''جی ہاں...... اس لیے کہ میں اس کام کا معاوضہ لے چکا ہوں۔''

''تم مجھے اس شخص کا نام بتاؤ۔ کتنے پیسے دیے ہوں گے اُس نے تمہیں ہماری تباہی کے لیے؟ میں تمہیں اُس سے دُگنے پیسے دوں گا۔ اسے برباد کرنے کے لیے۔ بولو۔ کون ہے وہ؟'' ان کے لہجے میں بے چینی مترشح تھی۔

''ملک صاحب! فی الحال تو میں اُس شخص کا نام نہیں بتا سکتا۔ ہاں یہ بتا سکتا ہوں کہ اس کام کے لیے اُس نے مجھے دس لاکھ آفر کیے ہیں۔''

''تم مجھے اس کا نام بتادو۔ میں تمہیں دس کے پندرہ لاکھ دوں گا۔ بولو منظور ہے؟''

''ٹھیک ہے......''

''تو پھر کب......؟''

''ابھی تو میں باؤنڈ ہوں۔ کچھ دن بعد آپ سے ملوں گا۔''

''کچھ دن بعد کیوں؟''

''میں اتنی جلدی کسی پر بھروسہ نہیں کیا کرتا۔ یوں بھی ہم جیسے لوگ تو اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرتے!''

''تو کچھ دن بعد کیا ہو جائے گا؟ میں قابل اعتبار ہو جاؤں گا؟ تمہیں مجھ پر بھروسہ ہو جائے گا؟''

''نہیں' بلکہ کچھ دن بعد جب آپ سے ملوں گا تو آپ کی کچھ نسیں میری گرفت میں ہوں گی۔ پھر آپ میرے خلاف چاہیں گے بھی تو کوئی ایکشن نہیں لے سکیں گے جس سے میری ذات کو کوئی نقصان پہنچتا ہو گا۔'' بلیک مین نے اتنا کہہ کر موبائل آف کر کے میز پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب تاثرات پھیل گئے تھے اس کی نگاہیں اخبار پر تھیں۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہو کر اُس نے ایک بار پھر

کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا تھا لیکن اس کی نظریں بدستور اخبار کی اُسی سرخی پر جمی ہوئی تھیں اور ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا۔

ملک معظم، چوہدری الیاس، سرفراز علی، ملک ٹیکسٹائل مل۔ وہ ان سب کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط و تعلق سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک موبائل کی بیل پھر بج اُٹھی۔ اُس نے موبائل اُٹھا لیا۔ گھنی مونچھوں تلے چھپے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''ہیلو چوہدری الیاس سپیکنگ؟''

''بلیک مین۔'' اُس نے مختصراً تعارف کروایا۔

''کہو بلیک مین کیا حال ہے؟'' چوہدری نے حال چال دریافت کیا۔

''ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں کیسے یاد کیا؟ کیا کوئی پریشانی آن پڑی یا پھر کسی سے حساب چکتا کرنا ہے؟'' بلیک مین کے لہجے میں لطیف سا طنز چھپا ہوا تھا جسے چوہدری نے بھی محسوس کر لیا۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

''تو کیا تمہیں کام کے بغیر یاد نہیں کیا جا سکتا؟''

''چوہدری صاحب! ہم جیسے لوگ سپیئر پارٹس کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک ضرورت نہ ہو کوئی ہماری طرف دیکھتا تک نہیں۔ ضرورت کے وقت مشینری میں فٹ کر کے کام لینے کے بعد نکال کے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ چوہدری صاحب میں ایک نہایت اہم مسئلے میں اُلجھا ہوا ہوں۔ براہ کرم جو کام بھی ہے جلدی کہیں۔''

''کیا بات ہے بلیک مین...... تم کچھ ناراض ناراض سے لگ رہے ہو؟''

''نہیں چوہدری صاحب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' بلیک مین کو چوہدری کا بلاوجہ تمہید باندھنا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔

''بلیک مین۔ آج تمہیں میں جو کام سونپ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔'' بلیک مین کو چوہدری کے لہجے میں کسی غیر معمولی بات کا شائبہ ہو رہا تھا۔

''میں سن رہا ہوں۔''

''بلیک مین! ملک ٹیکسٹائل مل کو روئے زمین پر نظر نہیں آنا چاہیے۔ میں ملک معظم کو کوڑی کوڑی کا محتاج دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ اُس ذلت کا بدل ہوگا جو اس کے باپ کے ہاتھوں بھری محفل میں مجھے اُٹھانی پڑی تھی۔ تم نے سنا۔ ملک ٹیکسٹائل مل کی بلندیوں کو پستیوں میں بدل دو۔'' چوہدری ہسٹریائی انداز میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ بم دھماکہ؟'' بلیک مین کے ذہن میں اپنے خط کے الفاظ آ گئے جو

اُس نے ملک معظم کو لکھا تھا۔

''ہاں...... بم دھماکہ......''

''چوہدری صاحب! خود سوچ لیں۔ ملک معظم کوئی معمولی شخصیت نہیں پھر مل بھی کوئی چھوٹی موٹی عمارت نہیں ہوتی جسے اتنی آسانی سے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے اور کچھ بھی نہ ہو۔ اس واقعہ کا شہر بھر پر کیا اثر ہوگا؟ اس کے متعلق کچھ سوچا ہے آپ نے؟'' بلیک مین کے انداز میں خدشات تھے۔

''بلیک مین تم اور اندیشے میں مبتلا ہو جاؤ؟ میں نے یہ کام تمہارے حوالے اس لیے کیا ہے کہ تم ناممکن کو ممکن بنانے کا گر جانتے ہو اور تم ہی خدشات کا شکار ہو گئے۔'' چوہدری جیسے اسے شہ دے رہا تھا۔

''اگر تم نے یہ کام کر دیا تو سمجھو تمام عمر کے لیے بے فکر ہو جاؤ گے جس ملک میں چاہو گے تمہیں سیٹل کروا دوں گا۔ اتنے روپے تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروا دوں گا کہ تمام عمر بیٹھ کر بھی کھاؤ گے تو ختم نہیں ہوں گے۔ بولو۔ کب کرو گے یہ کام؟'' چوہدری جانتا تھا کہ بلیک مین کا دین ایمان پیسہ ہی ہے۔ اُسے پیسہ دے کر کسی قسم کا بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی برتے پر اُس نے بلیک مین کے ذمے یہ کام لگایا تھا۔

''ابھی نہیں...... آج کل میں بہت زیادہ مصروف ہوں۔ چند دن ٹھہر جائیں۔ پھر دیکھتے ہیں۔''

''بلیک مین تم مجھے نالو نہیں۔ اتنی بڑی آفر دی ہے تمہیں۔ میرا کام ہر حالت میں ہونا چاہیے۔'' چوہدری کے لہجے میں عجلت اور بے چینی تھی۔

''چوہدری صاحب! آپ ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو رہے ہیں اور میرے پاس جذبات نام کی کوئی چیز نہیں۔ اسی واسطے میں آپ کے احساسات نہیں سمجھ سکتا۔ آج تک اگر پولیس یا کوئی اور میرا سراغ نہیں پا سکا تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ میں جذبات سے نہیں حواس سے کام لیتا ہوں۔''

''بلیک مین! میں تمہیں حواسوں کو استعمال میں لانے سے منع نہیں کر رہا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جیسے بھی ہو جس طرح بھی ہو اور جس قیمت پر بھی ہو۔ ملک معظم اور اس کا خاندان چند دنوں کے اندر اندر فٹ پاتھ پر ہونا چاہیے۔ اس کے لیے چاہے تم مل اُڑا دو۔ ان کی کوٹھی اڑا دو یا...... یا کچھ بھی کرو۔ بس اُس خاندان کو گلیوں میں لے آؤ تم...... تم سمجھ رہے ہو ناں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں ہر حال میں...... ہر صورت میں...... ہر قیمت پر اس خاندان کی تباہی اور بربادی چاہتا ہوں۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے ناں؟'' چوہدری الیاس کا لہجہ اس کے اندر کے ہیجان کا پتہ دے رہا تھا اور بلیک مین کا لاشعور برق رفتاری سے گتھیاں سلجھانے اور کڑیاں ملانے میں مصروف تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد چوہدری الیاس نے دوبارہ تیز لہجے میں کہا۔

''بلیک مین...... کیا سوچنے لگے؟ خاموش کیوں ہو گئے تم......؟''

''میں سن رہا ہوں۔'' بلیک مین کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''تمہاری سمجھ میں آ گیا ناں کہ میں کیا چاہتا ہوں؟''

''قدرے سمجھ میں آ گیا ہے اگر پوری طرح سمجھ میں آ جائے تو آپ کو اپنی چاہت کی تکمیل کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا!''

''کیا مطلب...... کھل کر بات کرو کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا سمجھ میں آ گیا ہے اور کیا سمجھنا چاہتے ہو؟''

''آپ کی بے چینی...... آپ کا اضطراب یہ تو سمجھا رہا ہے کہ آپ کی عزت نفس پر ملک فیملی نے کوئی گہرا زخم چھوڑا ہے۔ کوئی ایسی بات ہے جس نے آپ کے دل میں ملک فیملی کے لیے زہر بھر دیا ہے...... اب وہ بات' وہ وجہ کیا ہے؟ یہ سمجھنا چاہتا ہوں میں۔'' بلیک مین کی بات پر دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ نہ جانے کون سا ایسا احساس تھا جس نے چوہدری الیاس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیئے تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد چوہدری الیاس اُس سے دوبارہ گویا ہوا۔

''بلیک مین! تمہارے پاس تو جذبات نام کی کوئی شے نہیں۔ پھر تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟ میری کی ہوئی آفر پر غور کرو اور جو کام میں نے تمہارے ذمے لگایا ہے اس کے متعلق سوچو۔ فضول کی سوچوں کو ذہن میں جگہ نہ دو۔''

''او کے چوہدری صاحب! جیسے آپ کی مرضی۔ اگر آپ بتانا نہیں چاہتے تو آپ کی مرضی۔ رہی بات ملک خاندان کی تو وہ سڑک پر کس طرح آ سکتا ہے؟ اس درد کو میں اپنے سر میں جگہ دیتا ہوں۔ جب سر دردی مکمل ہو گی تو پھر ہی آپ سے بات ہو گی۔ بائے۔'' بلیک مین نے موبائل آف کیا اور اخباروں کے پلندے پر پھینک دیا۔ اُس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ طلوع ہو آئی۔ اس کی نظریں ایک بار پھر اشہر راہئن کی ہوئی سرخی پر مرتکز ہو گئیں۔

ملک جلال...... چوہدری الیاس...... ملک معظم...... سرفراز علی...... ملک ٹیکسٹائل مل...... یہ پانچوں نام اس کے ذہن میں کسی تاریک قبرستان کے وسط میں ایک شکستہ حال قبر کے گرد دائرے کی صورت چکراتے ہوئے پانچ چراغوں کی طرح گردش کرنے لگے۔ ہر لحظہ ان کی گردش میں اضافہ ہو رہا تھا اور اطراف میں موجود کتنی ہی قبریں شق ہوتی جا رہی تھیں جن کے اندر سے مردہ ماضی کے مختلف حصے اُبھر اُبھر کر اُن چراغوں کی روشنی کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے اور اس کے ذہن میں روشنیاں سی بھرتی جا رہی تھیں۔

☆..........☆..........☆

ماہ نور کے ساتھ باتیں کرتے کرتے مسز جلال کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ دن کے وقت جو

دوائی انہیں دی جاتی تھی وہ ریلیکس کرنے والی ہوتی تھی۔ ماہ نور نے مسز جلال کی طرف دیکھا۔

''آنٹی لگتا ہے آپ کو نیند آ رہی ہے؟''

''ہاں...... شاید......''

''پھر ایسا کریں صحیح ہو کے لیٹ جائیں۔'' ماہ نور نے ان کی کمر کے نیچے سے کشن نکالے اور سرہانہ ٹھیک طریقے سے ان کے سر کے نیچے رکھ کر کمبل اوڑھا دیا۔ کھڑکیوں کے پردے صحیح کیے کمرے کے اندر ہلکا سا اندھیرا اچھیل تھا۔

''نور...... جا رہی ہو؟'' آنٹی نے پوچھا۔

''جی آنٹی...... کوئی کام ہے؟''

''نہیں کام تو نہیں...... خیر تم جاؤ۔ جاتے ہوئے دروازہ اچھی طرح بند کر جانا۔'' مسز جلال نے ماہ نور سے کہہ کر کروٹ لے لی۔ ماہ نور ان کے کمرے سے باہر نکال کر دروازہ بند کر رہی تھی جب اُس نے بائیں طرف شہسوار اور اسد کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اسد کو شہسوار کے ساتھ دیکھ کر ایک لمحے کو تو حیرت زدہ رہ گئی۔

''یہ اسد یہاں کیسے......؟ اس کا شہسوار کے ساتھ کیا کام؟'' ماہ نور اچنبھے کا شکار تھی۔ اس کے ذہن میں ان گنت سوچیں آ رہی تھیں۔ وہ اسد کی وہاں موجودگی کا سبب جاننا چاہتی تھی کہ وہ یہاں کیسے اور کیوں آیا ہے؟ وہ سوچنے لگی کہ ان کے پیچھے جائے۔ پھر کچھ سوچ کر رُک گئی۔

''کہیں کیا خبر...... شہسوار اور اسد کے درمیان دوستانہ مراسم پیدا ہو چکے ہوں۔'' ماہ نور پرانے محلے کے ساتھ اپنے رابطے کو اب دوبارہ سے ہوا نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسد واقعی بہت اچھا لڑکا ہے لیکن وہ اپنے دل و دماغ کا کیا کرتی جن میں لاوے کی طرح پکتی سوچیں اُسے اندیشوں میں مبتلا کیے دے رہی تھیں۔ آخر اُس نے شہسوار کے کمرے میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''اگر پوچھا تو کہہ دوں گی کہ کتاب لینے آئی ہوں۔'' اُس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو بالکل سپاٹ کر لیا اور جچے تلے قدم اُٹھاتی شہسوار کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا اور اندر کا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ شہسوار اور اسد نہایت دوستانہ ماحول میں ہنس بول رہے تھے۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ شہسوار کا رُخ دروازے کی جانب ہی تھا۔ اُس نے ماہ نور کی طرف دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

''آئیے آئیے مس ماہ نور...... بھئی سوری میں آپ کے مہمان کو یہاں لے آیا۔ دراصل یہ خالصتاً خواتین کی محفل میں بیٹھا بوریت محسوس کر رہا تھا۔ انیکسی سے لان کی طرف آیا۔ سو میں نے آتے ہی اسے دیکھا اور یہاں لے آیا۔''

''اسلام علیکم آپی...... کیا حال ہے؟'' اسد نے ماہ نور کو انتہائی مہذب انداز میں مخاطب کیا۔

''بالکل ٹھیک...... تم بتاؤ...... کیسے ہو؟ خالہ کیسی ہیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں اور امی بھی ٹھیک ہیں وہ بھی آئی ہوئی ہیں۔ وہیں انیکسی میں ہیں۔''

''اچھا خالہ بھی آئی ہوئی ہیں۔'' ماہ نور کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس کے ذہن میں کئی اندیشے سر سرا اٹھے۔

''ہاں جی......'' اسد کے چہرے پر خوشی کے رنگ پھیلے دیکھ کر ایک لمحے کو ماہ نور کے دل میں آئی کہ شاید اسد شاہین کو پرپوز کرنے کے لیے اپنی امی کو ساتھ لایا ہے لیکن وہ خاموش ہی رہی۔ شہوار کے سامنے وہ نجی گفتگو سے احتراز کر رہی تھی۔ یکدم شہوار اُٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے اسد یار میں ذرا ڈاکٹر کی طرف ہو آؤں۔ اسی طرف جا رہا تھا تمہیں دیکھا تو واپس ہولیا۔ اب ایسا ہے کہ تم اپنی آپی کے ساتھ گپ شپ کرو۔ میں یوں گیا یوں آیا۔'' شہوار نے چٹکی بجا کر اپنے جانے اور آنے کے متعلق بتایا۔

''خیریت تو ہے شہوار بھائی...... ڈاکٹر کے پاس کس لیے؟''

''ارے یار اسٹچز دکھانے ہیں۔ ممکن ہے آج کھل جائیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔'' شہوار کمرے سے نکل گیا۔ اسد نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ جانے کس میں گم تھی۔

''آپی...... کیا سوچ رہی ہیں؟''

''میں یہ سوچ رہی تھی اسد کہ ہمارے یہاں کا ایڈریس تمہیں کس نے بتایا؟ کیونکہ وہاں پورے محلے میں کسی کو خبر تک نہیں کہ ہم کہاں ہیں۔'' ماہ نور کے پوچھنے پر اسد ایک پل کو خاموش ہو گیا۔ پھر گویا ہوا۔

''آپ کا پتہ غیاث بھائی نے دیا تھا ہمیں۔'' ماہ نور کے ذہن میں دھماکہ سا ہوا۔

''غیاث نے...... لیکن وہ کیسے جانتا ہے کہ ہم یہاں ہیں؟'' اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ پریشانی' خوف اور تردد نمایاں تھا۔ حقیقتاً اس کے لیے پریشانی کی بات تھی کہ غیاث اُن کے یہاں ہونے کے بارے میں جانتا تھا۔

''آپی...... وہ تو آپ کے بارے میں ہر بات جانتے ہیں......'' اسد کے کہنے پر ماہ نور کو ایک بار پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''اسے کیا خبر میرے بارے میں......؟ کیا جانتا ہے وہ میری ذات کے حوالے سے؟''

''سب کچھ...... آپ کی محنت' کوشش' آپ کی ذات اور خواہشات تک ہر چیز کی خبر ہے انہیں۔''

''لیکن کیسے...... کیسے جانتا ہے وہ یہ سب کچھ......؟'' ماہ نور کا انداز جارحانہ تھا۔ جس شخص کو

اُس نے کبھی اچھا نہیں سمجھا وہ اس کی ذات میں کس بَرتے سے دلچسپی لیتا ہے۔

''یہ میں نہیں بتا سکتا آپی......'' اسد نے سر جھکا کر انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

''کیوں...... کیوں نہیں بتا سکتے۔ ایسی کیا بات ہے' جس کی مجھے خبر نہیں ہونی چاہیے۔''

''آپی آپ کو یاد ہوگا نہ ہسپتال میں آپ سے جب ملاقات ہوئی تھی اور آپ نے غیاث بھائی کو برا بھلا کہا تھا تو میں نے آپ کو منع کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غیاث بھائی جو نظر آتے ہیں وہ نہیں ہیں۔ ایک ہائی کوالیفائیڈ آدمی ہیں وہ اور یہ تعلیم انہوں نے خود مزدوریاں کر کے حاصل کی۔ وہ ایک سیلف میڈ آدمی ہیں۔'' اسد کے لہجے میں غیاث کے لیے بے انتہا محبت اور عقیدت تھی۔ ماہ نور دم بخود اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''تم...... اسد تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ میرے بارے میں کیا جانتا ہے اور کیسے؟''

''آپی پلیز مجھے مجبور مت کریں۔ میں احسان فراموش نہیں کہلانا چاہتا۔ انہوں نے کئی بار مشکل میں میری مدد کی ہے۔ ساری دنیا میں ان کا کوئی اپنا نہیں۔ مجھے انہوں نے اپنا دوست سمجھ کر مجھے اپنا راز دار بنایا ہے۔ ان کی باتیں' ان کے راز میرے پاس امانت ہیں اور میں امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا۔'' اسد مضبوط لہجے میں بول رہا تھا۔

''اسد میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ مجھے بتاؤ تمہیں تمہارے پیاروں کی قسم۔ کیا جانتا ہے وہ میرے بارے میں؟'' اسد جس قدر لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔ ماہ نور اسی قدر پریشان ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے پریشانی کے سائے دیکھ کر اسد خاموش سا ہو گیا۔ اسے جس قدر غیاث سے محبت اور عقیدت تھی اسی قدر ماہ نور سے بھی تھی۔ وہ ہرگز اُسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''نور آپی...... آپ میرے لیے بہت محترم ہیں۔ میری بڑی بہنوں جیسی ہیں۔ میں اگر وہ باتیں آپ کو بتاؤں گا تو شاید آپ ناراض ہو جائیں۔ جانے کیا سوچیں۔ میں صرف اس لیے نہیں بتا رہا تھا۔ اگر آپ بضد ہیں تو بتا دیتا ہوں لیکن وعدہ کریں کہ میری کسی بات کا برا نہیں مانیں گی۔'' اسد جواب طلب نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر پھیلے تاثرات اس کی ملی جلی کیفیت کی غمازی کر رہے تھے۔ اس کے لب خاموش تھے اور نگاہیں اسد پر ٹکی ہوئی تھیں۔ گویا وہ اسد کے منہ سے اگلی بات سننے کی منتظر تھی۔ اسد جیسے اس کی کیفیت سے سمجھ گیا۔

''نور آپی غیاث بھائی آپ کو اُس وقت سے جانتے ہیں جب آپ غالباً تیسری یا چوتھی کلاس میں پڑھتی تھیں۔''

''یہ...... یہ کیسے ممکن ہے اسد......؟ وہ تو...... وہ تو شاید چھ سات سال پہلے اس محلے میں آیا تھا۔'' ماہ نور بے یقینی کا شکار تھی۔

"نہیں آپی..... غیاث بھائی کا بچپن اسی گلی میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ ان کے بچپن میں ہی ان کے امی بابا میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ ان کے دوسرے بہن بھائی تو ماں کے ساتھ ہی چلے گئے تھے لیکن غیاث بھائی کو ان کے بابا نے رکھ لیا۔ پھر وہ انہیں لے کر دوسرے شہر چلے گئے۔ چھ سال پہلے اپنے بابا کی وفات کے بعد غیاث بھائی دوبارہ اسی محلے میں آ گئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ وہ بہت اچھے ہیں آپی' بہت گریٹ ہیں' ساری زندگی انہوں نے محنت کی' کسی کا احسان نہیں لیا۔ تبھی تو ہسپتال میں جب آپ انہیں بُرا بھلا کہہ رہی تھیں تو مجھے اچھا نہیں لگا تھا اور میں نے اس وقت بھی آپ کو یہی کہا تھا کہ وہ بُرے نہیں ہیں۔" اسد کی باتیں ماہ نور کو حیران کر رہی تھیں۔ کیا اسد اسی غیاث کی بات کر رہا ہے جس کے چہرے پر پھیلی داڑھی مونچھیں اس کے شکن آلود لباس کی طرح بے ترتیب رہتی تھی۔ جس کی سرخ آنکھوں میں رتجگوں نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ کیا اسی غیاث کے متعلق بتا رہا ہے جو سارا سارا دن بے مقصد چاچے ساجے کی دُکان کے تھڑے پر بیٹھا رہتا تھا۔ لوفر لفنگے لڑکے جس کے اردگرد مکھیوں کی طرح بھنبھناتے تھے۔

"اگر وہ اتنا ہی اچھا تھا تو عامر' ارشد' امجد جیسے لڑکوں سے اس کی دوستی کیوں تھی؟" ماہ نور ترش انداز میں بولی۔

"صرف اپنی تنہائی کے احساس کو مٹانے کے لیے وہ ہجوم میں بھی تنہا تھے آپی۔ اندر کے شور سے گھبرا جاتے تو خود بخود باہر کے ہنگاموں میں خود کو ڈبو دیتے تھے لیکن یہ ذاتی طور پر انہیں پسند نہیں کرتے تھے آپی۔"

"اسد تم نے اُس کے بارے میں بتا دیا۔ ٹھیک کیا لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ میرے بارے میں کیا جانتا ہے اور کیسے جانتا ہے؟" ماہ نور ابھی بھی متجسس تھی۔

"آپی وہ آپ کے بارے میں ہر بات جانتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دنیا میں اپنی ماں کے علاوہ جس سے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے وہ آپ ہیں۔ اس نے دنیا کے ہر رشتے میں دھوکا' فریب اور عیاری دیکھی۔ ان کے بابا نے ان کی ماں کے بارے میں انہیں غلط باتیں بتائی تھیں۔ پندرہ سال تک انہوں نے اپنی ماں سے شدید نفرت کی لیکن اب وہ جان گئے ہیں کہ ان کی ماں بہت اچھی خاتون تھیں۔ اس تمام عرصے میں جو انہوں نے ماں کے بغیر گزارا' انہیں عورت ذات سے بھی نفرت ہو گئی۔ غیاث بھائی نے مجھے بتایا کہ آپ نے صرف ان کے دل میں چھپی نفرت کے باوجود ان کے دل میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ وہ آپ کی خاطر ساری دنیا سے بھی ٹکر لے سکتے ہیں نور آپی۔ وہ بہت چاہتے ہیں آپ کو۔ آپ کا ذکر جب ان کے لبوں پر ہوتا ہے تو وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں بے انتہا عقیدت ہوتی ہے آپ کے لیے۔" اسد کی باتیں تھیں کہ دھماکے تھے جو اس

کے چہار اطراف ہو رہے تھے۔ وہ دم بخود بیٹھی تھی۔ اپنے محسوسات بھی اس کے اختیار میں نہیں تھے۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ ایک شخص جو اسے دنیا کی ہر چیز ہر رشتے سے زیادہ عزیز رکھتا رہا۔ وہ اسی سے نفرت کرتی رہی۔ اب اُسے یاد آ رہا تھا کہ وہ صبح صبح اس کے گھر سے نکلنے سے پہلے تھڑے پر کیوں موجود ہوتا تھا۔ چلچلاتی دوپہر میں جب اکثر چاچا ساجا دُکان بند کر کے گھر کو سدھار چکا ہوتا تھا۔ تپتے تھڑے پر بیٹھا وہ کس کا منتظر ہوتا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں سے وہ کراہت محسوس کرتی تھی اور وہی آنکھیں جانے کتنے عرصے سے اُسے عقیدت و محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ ماہ نور کا دل بھر آیا۔ شدتِ جذبات سے اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے یا اپنی زندگی کے اس موڑ پر اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اسد کی طرف کچھ دیر خاموش نگاہوں سے دیکھتی رہی اور جب بولی تو خود اسے اپنی آواز اجنبی اجنبی سی محسوس ہوئی۔

"لیکن..... اُس نے..... اُس نے کبھی....." بات ادھوری رہ گئی۔ ماہ نور خود کو بے بس سمجھ رہی تھی جو کچھ اسد نے اُس سے کہا تھا اس کے لیے غیر متوقع اور شاکنگ تھا۔

"آپ سے کیوں نہ کہا..... یہی کہنا چاہتی ہیں ناں آپ۔" اسد نے اس کا چھوڑا ہوا ادھورا جملہ مکمل کیا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہی سوال میں نے اُن سے کیا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتے کہ آپ سے بات کریں۔ تب میں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں شاہین کے ذریعے آپی سے بات کروں تو انہوں نے پتہ ہے آپی مجھ سے کیا کہا تھا؟ انہوں نے کہا تھا اسد! نور میری زندگی کا وہ سچ ہے جسے میں نے خود سے بھی چھپا رکھا ہے۔ میں نے آج تک اس کی آنکھوں میں کبھی اپنے لیے اچھا تاثر نہیں دیکھا۔ میں جانتا ہوں وہ مجھے ناپسند کرتی ہے جب اُسے یہ خبر ہو گی کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں تو وہ ہرٹ ہو گی۔ دُکھی ہو جائے گی اور محبت کرنے والے اپنے محبوب کو دُکھ نہیں دے سکتے۔ دوسرے جانے کیوں مجھے اپنی بے غرض محبت پر بہت مان ہے۔ نور تک یہ بات پہنچے اور وہ انکار کر دے' مجھے دھتکار دے تو میرا یہ مان ٹوٹ جائے گا اسد اور میں اب تک اسی مان کے سہارے زندہ ہوں۔ میری محبت کاغذ کی وہ کشتی ہے جو پانی کے اندر ہے اُس نے یوں بھی ڈوب ہی جانا ہے۔ پھر بارش کا پانی کیوں گرنے دوں۔ کسی طرف سے تو وہ سلامت رہے۔ یہ جو محبت ہوتی ہے ناں یہ امید کا نام ہی تو ہے۔ یہ صرف ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمیں کتنا پیارا ہے مگر وہ ہمیں چاہتا ہے یا نہیں۔ یہ سوال تو سدا محبت کرنے والے ہر انسان میں پل پل سانس لیتا ہے۔ تمہیں ایک نظم کا حصہ سناؤں اسد؟ اور پھر آپی انہوں نے مجھے ایک نظم سنائی۔" اسد چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر نظم کہنے لگا۔

کچھ ایسی بے سکونی ہے وفا کی سرزمینوں میں

که جو اہلِ محبت کو سدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے پھول میں خوشبو کہ جیسے ہاتھ میں پارا
کہ جیسے شام کا تارا
محبت کرنے والوں کی سحر راتوں میں رہتی ہے
گماں کے شاخوں میں آشیاں بنتا ہے اُلفت کا
یہ عین وصل میں بھی ہجر کے خدشوں میں رہتی ہے
محبت کے مسافر زندگی جب کاٹ چکتے ہیں
تھکن کی کرچیاں چنتے وفا کی اجرکیں پہنے
سمے کی رہگزر کی آخری سرحد رکھتے ہیں
تو کوئی ڈوبتی سانسوں کی ڈوری تھام کر
دھیرے سے کہتا ہے
سچ ہے ناں
ہماری زندگی ایک دوسرے کے نام لکھی تھی!

''سب منظور ہے۔ مار دے...... تباہ کر دے مگر جو کرے صرف نور کرے صرف نور۔''

اور وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر بیٹھ گئے تھے۔ تب ہی...... تب ہی نور آپی میں نے انہیں سنوارنے کی قسم کھائی تھی۔ کچھ چہرے ہوتے ہیں ناں ایسے جلتے سلگتے کہ جن پہ پیار کی شبنم گرے تو سنور جاتے ہیں۔'' اسد ماہ نور کی حالت سے بے خبر بولے جا رہا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی آنکھوں میں تیرنے والی نمی شفاف موتیوں میں بدل کر اس کے رخساروں پر ڈھلک آئی ہے۔ پھر جب اُس نے سر اُٹھایا تو چونک پڑا۔

''آپی...... آپی کک...... کیا بات ہے؟ آپ رونے کیوں لگ گئیں؟'' اسد خلافِ توقع ماہ نور کی کیفیت پر بوکھلا اُٹھا'' آپی پلیز...... پلیز روئیں نہیں' میں نے یہ سب اس لیے نہیں بتایا کہ آپ کا دل دُکھے' آپ ہرٹ ہوں...... آپی کیا سچ مچ غیاث بھائی کا خدشہ ٹھیک تھا۔ آپ ہرٹ ہوئیں۔'' اسد اُسے پوچھ رہا تھا لیکن وہ بول نہ سکی۔ حلق میں جیسے آنسوؤں کا گولا سا پھنسا ہوا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دوپٹے کے کونے سے آنسو خشک کرنے لگی۔ اسد بے چارہ الگ شرمندہ سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔ ماہ نور نے اس کے چہرے پر ندامت کا تاثر دیکھا تو بمشکل بولی۔

''نہیں اسد...... میں ہرٹ نہیں ہوئی...... نہ ہی یہ آنسو دُکھ کے ہیں۔ یہ آنسو تو شرمساری کے

ہیں۔ ندامت کے ہیں کہ میں آج تک اسے سمجھ ہی نہ سکی۔ آج تک میں نے اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اُسے بُرا سمجھا' برا جانا۔ میں تو اب تک یہی سمجھتی رہی تھی اسد کہ وہ جن لوفر لفنگوں کے درمیان کھڑا ہوتا ہے' خود بھی انہی جیسا ہے۔ مجھے یہ خبر ہی نہیں تھی کہ وہ جو کچھ نظر آتا ہے در حقیقت ویسا نہیں۔ اسد آج تم نے میری سوچوں کا رُخ موڑ دیا۔ میں شرمندہ ہوں اپنے آپ سے' اپنے ضمیر سے۔ میں اس کے متعلق بغیر جانے' بغیر سمجھے اُس سے نفرت کرتی رہی۔ دنیا کا ایک ستایا ہوا' دکھوں کا مارا ہوا' تنہا انسان جو خود میں' اپنی ذات میں مگن رہے' جس نے کبھی کسی کو ایذاء' کسی کو اذیت نہ دی ہو پھر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے اُس سے نفرت کرنے کا۔ اُسے حقارت سے دیکھنے کا۔'' ماہ نور بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔ اسد کے دل میں خوشی کی لہر سی پیدا ہوئی۔ اُس نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

''آپی غیاث بھائی کو زندگی نے کچھ نہیں دیا۔ وہ عمر جس میں بچے کو ماں کی شفقت اور ممتا بھری آغوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس عمر میں بچہ اپنے ہم جولیوں' بہن بھائیوں کے سنگ بچپن اور لڑکپن کے دور کی معصوم معصوم خوشیاں کشید کرتا ہے۔ وہ عمر غیاث بھائی کی مزدوریوں میں گزر گئی۔ نو دس سال کی عمر میں ماں سے' بہن بھائیوں سے بچھڑ گئے تھے وہ۔ ان کے والد انہیں لے کر دوسرے شہر چلے گئے۔ جہاں وہ دن رات محنت مزدوری کرتے رہے لیکن سارا سارا دن محنت کرنے کے باوجود شام ڈھلے انہیں اپنے کام کی جو اُجرت ملتی تھی۔ وہ اتنی بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے نشئی باپ کا پیٹ پال سکتے۔ نشے کی زیادتی نے ان کے والد کو کسی محنت مزدوری کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔ غیاث بھائی جو پیسے کما کے لاتے تھے تو والد اُن سے چھین لیتے۔ نشے نے انہیں اپنے بیٹے کے جذبات و احساسات سے بھی لاپرواہ اور بے نیاز کر دیا تھا۔ اُن پر ایسے حالات بھی آئے جب سارا سارا دن محنت کرنے کے باوجود وہ رات کو خالی پیٹ سوئے۔ وہ فاقوں کی اذیت سہتے رہے جب تک اُن میں اس اذیت کو سہنے کا حوصلہ تھا۔ جب ماں تھی تو وہ پڑھتے بھی تھے۔ باپ کے پاس آنے کے بعد پڑھائی کا تو صرف خواب ہی دیکھا جا سکتا تھا لیکن غیاث بھائی نے اپنی پڑھائی نہیں چھوڑی۔ دن بھر محنت کرتے اور رات کو گھر میں لالٹین کی روشنی میں پڑھتے۔ گھریلو حالات ابتر صورتِ حال اختیار کرتے چلے گئے۔ باپ کی طبیعت دن بدن بگڑتی گئی۔ اب نشے کے علاوہ انہیں دوا دارو کی ضرورت بھی پڑتی تھی۔ حالات سے آخر کار ہار مان کر غیاث بھائی نے چھوٹی موٹی چوریاں شروع کر دیں۔ روزانہ باپ کے لیے نشے کی پڑیا لاتے لاتے ان کا رابطہ ایسے لوگوں سے ہو گیا اور انہوں نے ہلکی پھلکی منشیات بھی بیچنی شروع کر دیں۔ یہ کام انہوں نے اس نیت سے شروع کیا تھا کہ ہاتھ میں پیسہ ہو گا تو وہ اپنے باپ کا آسانی کے ساتھ علاج کروا سکیں گے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا جس باپ کے لیے انہوں نے کمائی کے ناجائز ذرائع اپنا لیے تھے۔ وہ ایک دن چپ چپاتے انہیں دنیا میں تنہا چھوڑ

گیا تھا۔ سڑکوں، فٹ پاتھوں اور ہوٹلوں پر نوکریاں کرتے کرتے ان چھ سات سالوں میں وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربہ کار ہو گئے۔ انہوں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ وہ جان گئے کہ دنیا کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر چلتی ہے۔ سو انہوں نے بھی خود کو وقت کے بے رحم سانچے میں ڈھال لیا...... وہ شروع سے اتنے تنہا نہیں تھے ان کا بچپن اسی گلی، اسی محلے میں گزرا تھا۔ انہی گلیوں میں وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔'' اسد اپنی دھن میں بول رہا تھا اور ماہ نور کے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ کچھ دھندلے دھندلے عکس ذہن کے جھروکوں سے جھانکنے لگے۔ شاید لاشعور میں چھپے گزشتہ زندگی کے کچھ خاکے تھے جو اُبھر اُبھر کر اپنے وجود کا احساس دلا رہے تھے۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اسد اسی لے میں بولے جا رہا تھا۔

''غیاث بھائی اکثر کہتے ہیں کہ انہیں اپنی ماضی سے اسی قدر پیار ہے جیسے کسی بچے کو کھلونے سے۔ وہ اپنے ماضی سے بہلتے ہیں۔ اب بھی چاچے ساجے کی دکان کے تھڑے پر بیٹھنا ان کا معمول ہے یا پھر گھر میں بیٹھے اپنی ماں کی تصویر کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ گھر اب ایسا لگتا ہے جیسے چیچک زدہ بوڑھا لیکن انہوں نے گھر کی مرمت نہیں کروائی۔ جس حالت میں انہوں نے وہ گھر چھوڑا تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔ اس گھر کے در و دیوار سے انہیں جان لیوا محبت ہے وہاں ان کی ماں کی یادیں ہیں۔ ماں باپ کا پیار، جھگڑا، بہن بھائیوں کی شرارتیں محبتیں وہ گھر کے زخمی در و دیوار میں انہی کو تلاش کرتے ہیں جن سے بچھڑ چکے ہیں۔ انہیں یقین ہے کبھی نہ کبھی ماں کو، بہن بھائیوں کو اپنے بچھڑے ہوئے کا خیال آئے گا۔ ایک نہ ایک دن وہ پلٹ کر ضرور آئیں گے۔'' اسد خاموش ہو گیا۔ وقت کے تھال میں لمحوں کے سکے گرتے رہے۔ شاید اسد کے پاس لفظ ختم ہو گئے تھے یا پھر شاید غیاث کی کہانی ہی اتنی تھی لیکن نہیں۔ جانے کیوں ماہ نور کو لگ رہا تھا کہ یہی نقطہ آغاز ہے۔ اس کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ دماغ کی نسوں میں خون کی رفتار بڑھ گئی۔ پھر اُس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''اسد...... غیاث کے والد کا کیا نام ہے؟'' اس کے لہجے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہ نام جانتی ہو بس اسد سے تصدیق کروانا چاہتی ہو۔

''آپی...... ان کا نام ملک جلال حسین تھا۔'' جواب سن کر اس کے ذہن میں دھماکا سا ہوا۔ جلال حسین...... ملک جلال حسین...... رابعہ آنٹی...... غازی...... غیاث، غازی ہے؟ آنٹی کا بچھڑا ہوا غازی جس کی خاطر جانے کتنی راتیں جاگی ہوں گی وہ۔ کتنے آنسو اس کی یاد میں ان کی آنکھوں سے بہتے تھے۔ وہی غازی...... جو سڑکوں پر رُلتا رہا لیکن ماں کی ممتا کی گرماہٹ سے بے خبر رہا۔ وہ ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر فرمائش نہ کر سکا۔ نہ بڑے بھائی سے لاڈ اُٹھوائے۔ نہ چھوٹے کا مان رکھ سکا۔ وہ کتنے قریب رہ کر دوری کا عذاب سہتا رہا۔ غیاث کے روپ میں نفرتوں کا زہر جسے پل پل پیتا

پڑا اور وہ محبت کے تریاق کو ترستا رہا۔ وہ نفرت گزیدہ غیاث ملک معظم کا بھائی تھا، مسز رابعہ جلال کا بیٹا تھا۔'' ماہ نور کے ذہن میں رہ رہ کر غیاث کا سراپا اُبھر رہا تھا معدوم ہو رہا تھا۔ اس کا دل بھر آ رہا تھا یہ کیسی زندگی تھی؟ کیا المیہ تھا؟ اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات دیکھ کر اسد چونک پڑا۔ ''آپی...... آپی...... کیا بات ہے؟ آپ کیا سوچنے لگیں؟'' اسد کی بات سن کر وہ جو ساکت سی بیٹھی تھی چونک گئی۔

''اسد...... ملک معظم اور شہسوار کے والد کا نام بھی ملک جلال حسین ہی ہے۔'' ماہ نور کے لہجے میں عجیب سا تاثر تھا۔

''کیا مطلب آپی...... ؟ تو...... تو کیا غیاث بھائی...... ؟'' اسد کی بات اُدھوری بھی مکمل ہی تھی۔

''شاید......'' ماہ نور نے کہا۔

''تو آپی...... پھر ان کو بتا دیں کہ غیاث بھائی ان کے بھائی ہیں۔''

''نہیں ابھی نہیں...... اس طرح نہیں...... ابھی اس بات کا تذکرہ نہیں کرنا ہے۔''

''لیکن...... کیوں......؟'' ابھی وہ اسد کے استفسار کا جواب دینے ہی لگی تھی کہ کمرے میں شہسوار داخل ہوا۔

''زیادہ دیر تو نہیں ہوئی ناں مجھے؟'' شہسوار نے اندر داخل ہوتے ہی اندر کے گم صم ماحول کو جانچ لیا تھا لیکن اُس نے کوئی تاثر نہیں دیا۔

''نہیں شہسوار بھائی...... زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ آپ یہ بتائیں ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟ زخم کب تک ٹھیک ہو گا؟'' اسد نے پوچھا۔

''ایک دو دن مزید لگ جائیں گے ٹانکے کھلنے میں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ زخم کو پانی سے بچاؤ ورنہ خراب ہو جائے گا۔ خیر چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ ابھی تک تم نے ماہ نور کو کچھ نہیں بتایا؟'' شہسوار کے معنی خیز لہجے نے ماہ نور کو چونکا دیا۔ یکے بعد دیگرے اس کے دل کو ایسے دھچکے لگے تھے کہ اب تو پتہ ہلنے پر بھی دل لرز کر رہ جاتا تھا۔

''اوہو...... ماہ نور تو پریشان ہو گئیں۔'' شہسوار نے اس کے چہرے سے اندرونی کیفیت بھانپ لی۔

''دراصل اسد نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی امی سسٹر شاہین کے لیے اسد کا پرپوزل لے کر آئی ہیں۔'' ماہ نور نے اسد کی جانب دیکھا تو اُس نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

ماہ نور نے اس کے چہرے پر خوشی کا عکس رقصاں دیکھا تو دھیمے سے مسکرا دی۔

''اچھا شہسوار بھائی! میں اب چلتا ہوں۔'' اسد جانے کو اُٹھ کھڑا ہوا تو ساتھ ہی ماہ نور بھی اُٹھ گئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انیکسی میں داخل ہوئے تھے۔ انیکسی کا اندرونی ماحول کافی

خوشگوار تھا۔ راہین' اماں اور اسد کی امی تینوں لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ شاہین نے کچن سنبھال رکھا تھا۔ غالباً چائے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اسد وہیں لاؤنج میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور ماہ نور خالہ کی خیر خیریت دریافت کر کے کچن میں چلی گئی۔ کچن میں شاہین شامی کباب تلنے میں مصروف تھی۔ نمکو' اسنیکس' بسکٹ' روسٹ چکن پیزا اور شامی کباب۔ اُس نے تھوڑی سی دیر میں چائے کے ساتھ اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ ٹشو پیپر پر شامی کباب رکھتے ہوئے اُس نے کبابوں والی پلیٹ بھی دوسری ڈشوں کے ساتھ ہی رکھ دی۔

''آپی...... چائے آپ سرو کریں۔ میں نے نہیں جانا باہر۔'' شاہین سرخ چہرے اور حیا آلود تبسم کے ساتھ بولی۔

''کیوں تم نے کیوں نہیں جانا باہر...... باہر کیا کرفیو لگا ہوا ہے؟'' ماہ نور نے اُسے ستایا۔

''آپی...... اسد بھی بیٹھا ہوا ہے باہر' میں نے نہیں جانا۔''

''اچھا بابا مت جاؤ میں چلی جاتی ہوں۔'' ماہ نور نے ساری چیزیں ٹرے میں سیٹ کیں اور لاؤنج میں مہمانوں کے سامنے میز پر سجا دیں۔

''ارے ماہ نور تم کہاں غائب تھیں؟ کتنی دیر سے آئے بیٹھے تھے ہم۔''

''دراصل ملک صاحب کی والدہ بیمار ہیں اور ان کا خیال رکھنا اس کی ڈیوٹی ہے۔ اب بھی وہ سو گئی ہوں گی تو یہ ادھر آ گئی۔ ورنہ سارا دن اس کا وہیں گزرتا ہے۔'' اماں سادہ لہجے میں بات کر رہی تھیں جبکہ آمنہ خالہ ماہ نور کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ وہ تو یہاں اسد کی ضد سے مجبور ہو کر آئی تھیں۔ ورنہ انہوں نے تو شروع سے چاند سی دلہن کے ہمراہ لاکھوں کے جہیز کے بھی خواب دیکھے تھے جبکہ بیٹے کی ضد پوری کرنے کے لیے ان کو اس خواب سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس لیے کہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ماہ نور کی فیملی سفید پوشی کا بھرم رکھنے والی ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی فیملی ہے۔ پھر یہ بھی تھا کہ بیٹے کی پسند اور ضد کسی صورت بھی نامعقول نہیں تھی۔ شاہین میں بظاہر ایسی کوئی کمی نہیں تھی جو قابل گرفت ہوتی۔ سو انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کی ضد کو مقدم جانا تھا۔ ماہ نور کی اماں سے بات کی تو انہوں نے بھی حوصلہ افزا جواب دیا۔ اب وہ ماہ نور کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔

''ارے تو بیٹا...... کیا تم اس عورت کی نرس ہو......؟'' عینک کو ناک پر ٹھیک سے جماتے ہوئے انہوں نے شیشوں کے پیچھے سے اُسے بڑی گہری نگاہوں سے تولا تھا۔

''یہی سمجھ لیں خالہ......'' ماہ نور نے جواب دیا۔

''تو جب وہ ٹھیک ہو جائے گی پھر تم کہاں جاؤ گی؟ پھر تو یہ نوکری چھوٹ جائے گی ناں تمہاری؟ یہ گھر بھی واپس لے لیں گے وہ؟'' وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ ماہ نور سمجھ رہی تھی۔

''نہیں خالہ...... آنٹی کے ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ مجھے مل میں میری تعلیم کے حساب سے نوکری دے دیں گے۔''

''اچھا...... پھر تو ٹھیک ہے۔'' آمنہ خالہ کی پیشانی سے ایک شکن کم ہو گئی۔ ''زرینہ بہن اب جلدی سے بتا دو مجھے کس تاریخ کو آ کر شاہین کو انگوٹھی پہنا جاؤں۔''

''ارے آمنہ...... اب تمہاری ہی بیٹی ہے۔ زبان سے کہہ دیا اور پتھر کی لکیر سمجھو۔ جس دن چاہو آ کر منگنی کی رسم ادا کر لینا۔'' اماں نے جواب دیا۔ حقیقتاً انہیں اس رشتے کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے کہ اسد وغیرہ پورے محلے میں سب سے زیادہ بہتر حالات زندگی گزار رہے تھے۔ سب سے پیارا گھر انہی کا تھا۔ انہوں نے اسد اور اس کی بہن حنا کو بہترین تعلیم اور سہولتیں مہیا کر رکھی تھیں جبکہ اماں بیوہ تھیں۔ آمنہ خالہ اتنا تو جان ہی گئی ہوں گی کہ اماں انہیں وہ کچھ نہیں دے سکیں گی جو آج کل لوگوں کی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ جو کچھ کرے گی اپنی ہستی' اپنی حیثیت کے مطابق ہی کرے گی اور آمنہ خالہ سے کوئی بات ڈھکی چھپی تو نہیں تھی۔ پھر انہوں نے شاہین کا رشتہ مانگا تو لازماً اماں کو حیرت تو ہونی ہی تھی لیکن حیرت سے زیادہ انہیں خوشی ہوئی تھی۔

''اچھا زرینہ بہن...... پھر ہمیں اجازت دو...... اگلے جمعے کو آ کر ہم اپنی بیٹی کو مکمل طور پر اپنا بنا لیں گے۔'' آمنہ خالہ اماں سے گلے ملتے ہوئے بولیں۔ پھر ماہ نور اور راہین کو پیار کیا۔

''ارے ہماری بچی کو کہاں چھپا رکھا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔ پھر جیسے اندازاً کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ کچن کے دروازے سے انہوں نے اندر جھانکا۔ شاہین سنک میں برتن دھو رہی تھی۔ کھٹکے پر مڑ کر دیکھا تو آمنہ خالہ کو دروازے میں دیکھ کر جھینپ گئی اور جھٹ سے سر پر دوپٹہ اوڑھ کر قدرے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی چومی اور پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اُسے تھمایا اور کچن سے باہر آ گئیں۔ سب کو خدا حافظ کہہ کر وہ اور اسد ٹیکسی سے باہر نکل گئے۔

''نور بچی...... دیکھا اللہ مسبب الاسباب ہے۔ میں شاہین کی وجہ سے پریشان تھی اور اللہ نے کتنا اچھا بر دے دیا میری بیٹی کو۔ اللہ میری باقی بچیوں کے نصیب بھی ہرے کرے۔'' اماں کے دل سے دعا نکلی۔

''لیں آپی...... چائے لے لیں۔'' راہین ایک پلیٹ میں کچھ لوازمات رکھ کر اور چائے کا کپ لے کر اس کے پاس آ گئی۔ ماہ نور نے خاموشی سے کپ تھام لیا۔

''نور...... تم کچھ پریشان ہو؟'' اماں اس کی مسلسل خاموشی پر بولیں۔

''نہیں اماں...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' مختصر جواب دے کر چائے کے چند گھونٹ لے کر وہ

اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اب چلتی ہوں اماں...... آنٹی کے جاگنے کا وقت ہو رہا ہے۔''

''اچھا بیٹا...... تم جاؤ میں بھی ذرا ظہر کی قضا پڑھ لوں۔ باتوں میں وقت کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔'' اماں کمرے کی طرف بڑھیں اور ماہ نور اَنیکسی سے باہر آ گئی۔

اسد کی باتیں اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں اور اُسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے کاسۂ سر میں جو کچھ بھی تھا تیز گرم سیال میں بدل گیا ہے اور اب اس سیال کی گرمی سے اس کی کنپٹیاں اور آنکھ کی پتلیاں تک جھلنے لگی تھیں۔ کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک جی تو چاہتا تھا کہ جھٹ سے آنٹی کے سامنے سارا راز اُگل دے لیکن ان کی صحت اور جسمانی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ انہیں اتنی بڑی خبر یوں اچانک سنا دی جائے جبکہ وہ پہلے سے ہی بیمار ہیں۔ ان کی قوت مدافعت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ جانے ان کے اعصاب اتنی بڑی خوشی کو سہہ بھی پائیں گے یا نہیں۔ پھر ذہن میں شہسوار کا سراپا در آیا لیکن وہ بھی جانے اس بارے میں کیا سوچے کیا خبر وہ اس بات پر یقین ہی نہ کرے اور پھر اس کے ذہن کی سوئی ملک معظم کے نام پر اٹک گئی۔

''ہاں...... ملک معظم...... اُن سے یہ بات کی جا سکتی ہے۔ یہی سوچتی ہوئی وہ مسز جلال کے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ وہ ابھی تک سو رہی تھیں۔ وہ جانے کو واپس پلٹی تو اُسے مسز جلال نے آواز دی۔

''نور......'' وہ اُن کی جانب پلٹی۔

''آپ جاگ رہی ہیں آنٹی میں تو سمجھی تھی کہ آپ سو رہی ہیں۔'' ماہ نور کے پوچھنے پر وہ بہت عجیب انداز میں مسکرائیں۔

''نور...... ایک ماں کا سونا کیا جاگنا کیا۔ کیا اُس ماں کو کبھی بے خبر نیند آ سکتی ہے جس کا لختِ جگر اس کی آغوش سے چھنا ہوا ہو۔ نہیں' جب سے غازی مجھ سے دور ہوا ہے ناں میں گہری نیند سو نہیں پائی۔'' ہلکے سے کھٹکے پر آنکھیں یوں کھل جاتی ہیں جیسے کبھی انہوں نے نیند کی صورت ہی نہ دیکھی ہو۔ ''ہر آہٹ پر مجھے غازی کے لوٹ آنے کا گمان ہوتا ہے۔'' ہمیشہ ان کے آنسو دیکھ کر ماہ نور کا پیا نۂ دل بھی غم سے لبریز ہو جاتا تھا لیکن آج اُسے دُکھ نہیں تھا۔ ایک انجانی سی خوشی تھی کہ بہت جلد غازی کی جدائی کا غم مٹنے والا تھا۔ ماں اور بیٹے کے درمیان حائل ایک طویل جدائی کا اب خاتمہ ہونے والا تھا۔

''آنٹی...... اگر یکدم اچانک کہیں سے غازی آ جائے تو......؟'' ماہ نور نے اُن سے پوچھا۔

''تو...... تو شاید...... شاید فرطِ خوشی سے میرا سانس ہی رُک جائے۔'' ان کی بات سن کر ماہ نور کو پھر پریشانی لاحق ہو گئی کہ انہیں کس طرح یہ خبر دی جائے کہ وہ جس بیٹے کے لیے پل پل تڑپتی رہی

ہیں وہ اُن سے زیادہ دور نہیں۔ یہیں ہے اسی شہر کے اسی محلے کے ایک گھر میں وہ بھی ان کا منتظر ہے۔

''نور کیا سوچنے لگیں......؟'' اُنہوں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں آنٹی...... بس یونہی...... آنٹی ایک منٹ آپ کے جوس کا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں جوس بنا کر ابھی لاتی ہوں۔'' ماہ نور ان کے بیڈ روم سے باہر نکلی اور جب وہ ملک شیک کا گلاس ہاتھ میں تھامے کچن سے باہر نکلی۔ اسی پل گیٹ کے کھلنے کی آواز کے ساتھ ملک معظم کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ آج خلافِ توقع وہ کچھ جلدی آ گئے تھے۔ ماہ نور نے کمرے میں آ کر مسز جلال کو ملک شیک کا گلاس تھمایا اور خود انہیں ''ابھی آئی'' کہہ کر باہر نکل آئی۔ ملک معظم اُسے لاؤنج میں دیکھ کر کچھ حیران ہوئے۔ انہوں نے اس کے چہرے پر پھیلی بے چینی کو بغور دیکھا انہیں شبہ سا ہوا کہ ماہ نور یہاں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن کیوں؟ اس سوال کا جواب انہیں وہی دے سکتی تھی۔

''ہیلو ماہ نور...... کیا بات ہے؟ آج آپ ماما کے پاس نہیں بیٹھی ہوئیں۔''

''وہ سر میں...... میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں لیکن یہاں نہیں۔'' ان کا اندازہ درست تھا۔ اُسے انہی سے بات کرنی تھی۔

''تو ٹھیک ہے آپ میرے کمرے میں چلی چلیں۔'' انہوں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ماہ نور نے بھی ان کی تقلید کی۔ ملک معظم کے چہرے پر اُلجھن کے سائے لہرا رہے تھے اور شاید دل میں کہیں جلد از جلد جان لینے کا اضطراب بھی ہلکورے لے رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے ماہ نور کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود کوٹ اُتارا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''جی کہیے...... کیا کہنا چاہتی تھیں آپ مجھ سے۔ میں سن رہا ہوں۔'' وہ جی جان سے اس کی طرف متوجہ تھے۔ ماہ نور نے ہولے سے کھنکار کر گویا بات کی ابتدا کی۔

''سر آج سے پندرہ سال پہلے آپ کی زندگی میں ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں آنٹی آپ کو شہسوار کو درانی کو لے کر اپنے ماں باپ کے پاس چلی گئی تھیں لیکن وہاں آپ کا ایک بھائی رہ گیا تھا جس کا نام غازی تھا اور جسے آپ کے والد لے کر کسی دوسرے شہر میں چلے گئے تھے۔'' ماہ نور کی گفتگو کا ایک ایک لفظ ان کے چہرے پر آئے رنگوں میں ردّ و بدل کر رہا تھا۔

''آپ کو یہ سب کیسے پتہ چلا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آنٹی سے۔ انہوں نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا ہے۔ آج تک وہ جس کرب و اذیت سے گزری ہیں۔ مجھ سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ سر۔ میں اب جو بات کہنے لگی ہوں۔ یہ یقیناً آپ کے لیے خلافِ توقع ہے۔ میں نے محض اس لیے آنٹی سے یہ بات نہیں کی کہ کہیں اتنی بڑی

خبر کہ وہ برداشت نہ کر پائیں۔'' ماہ نور کی باتیں لمحہ بہ لمحہ ان کے اضطراب میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ایسی کیا بات تھی جس کے لیے اُس نے ان کا انتخاب کیا تھا۔

''سر...... آپ کا بچھڑا ہوا بھائی غازی مل گیا ہے۔'' ماہ نور کے الفاظ تھے کہ ایک دھماکا تھا جو ان کے چہار اطراف میں ہوا تھا۔ ذہن کی ساری سوچیں جیسے دربدر ہو گئیں وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں ساکت سے بیٹھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر جیسے انہوں نے دھیرے دھیرے خود پر قابو پایا اور بولے۔

''آ...... آپ نے...... کیا کہا...... ؟ میرا بھائی غازی مل گیا۔''

''جی ہاں...... مل گیا ہے۔''

''کک...... کہاں ہے...... ؟ کہاں رہتا ہے وہ...... ؟'' وہ حد درجہ بے چین سے ہو کر بیٹھے سے کھڑے ہو گئے تھے۔

''غیاث...... غیاث نام ہے اس کا۔ شاہو گڑھی میں رہتا ہے وہ۔ وہی غیاث جس سے شہسوار کا جھگڑا ہوا۔ وہی غیاث جو عامر' ارشد اور امجد کے ساتھ رہتا تھا اور بلیک مین کی اندھی گولی سے معجزانہ طور پر بچ گیا۔ وہی غازی ہے آپ کا بھائی......''

''غیاث...... میرا بھائی ہے وہ......'' ان کے لہجے میں نمی گھل گئی۔ ''ماہ نور آپ کو کیسے پتہ چلا؟ کس نے بتایا آپ کو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''سر۔ آج دن کے وقت اسد آیا ہوا تھا۔ اُس نے جو باتیں بتائیں اُن باتوں میں اور آنٹی کی بتائی ہوئی باتوں میں اس قدر مماثلت تھی کہ میں نے اسد سے غیاث کے والد کا نام پوچھ لیا۔ اُس نے بتایا کہ غیاث کے والد کا نام ملک جلال حسین تھا۔ اس کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس لیے میں نے آپ کو بتایا کہ اب آپ کسی طرح سے یہ خبر آنٹی تک پہنچا دیں۔ میں خود میں یہ ہمت نہیں پاتی۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے کہ اس خبر کے ان پر کیا اثرات ہوں گے۔''

ماہ نور کے کہنے پر وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ وہ غازی کے لیے اپنی ماں کی تڑپ سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ انہوں نے ماں کو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اس کی تصویریں دیکھ کر آنسو رولتے دیکھا تھا۔ اب اچانک ان کو یہ خبر ملے کہ پندرہ سال کا طویل انتظار ختم ہو گیا تو کیا حالت ہو گی ان کی۔ مارے خوشی کے ان کا زخمی دل کہیں دھڑکنا ہی نہ بھول جائے۔

''ماہ نور میرا خیال ہے کہ شہسوار سے بھی اس سلسلے میں بات ہو جائے تو بہتر ہے۔'' ملک معظم نے کہا اور باہر جانے کو قدم بڑھا دیئے۔ ماہ نور بھی ان کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔ ان کا رخ شہسوار کے کمرے کی طرف تھا۔ اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے ایک لحظہ کو کچھ

سوچا۔ پھر دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ شہسوار کمپیوٹر پر پروگرامنگ میں مصروف تھا۔

''شاری...... کیا ہم آ سکتے ہیں؟'' ملک معظم نے پوچھا تو اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

''بھائی آپ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں آپ جب چاہیں جس وقت چاہیں آ سکتے ہیں۔ آئیں بیٹھیں۔'' اُس نے کرسی گھما کر ان کی طرف اپنا رخ کر لیا۔ وہ دونوں بیٹھ گئے۔ شہسوار نے دونوں کے چہروں پر تذبذب کے تاثرات دیکھے۔

''کیا بات ہے بھائی...... ؟ کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟'' انہیں خاموش دیکھ شہسوار نے ہی گفتگو میں پہل کی۔

''شاری...... پندرہ سال بیت گئے اور ایک سانحہ ہوا تھا۔ تم اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ شاید تمہیں صحیح طرح کچھ یاد نہ ہو لیکن میں آج بھی ان لمحوں کا زہر اپنی رگوں میں دوڑتا محسوس کرتا ہوں۔ اس سانحے نے ہم سے ہمارے وجود کا ایک حصہ چھین لیا تھا۔ جانتے ہو وہ حصہ کیا تھا؟'' ملک معظم نے سوال پہ بات ختم کی۔ شہسوار کی پوری توجہ اُنہی کی جانب تھی۔ وہ بغور ان کی بات سن رہا تھا۔

''کیا بھائی ؟''

''وہ حصہ ہمارا بھائی تھا...... غازی...... وہی غازی جو ہمارے ہم قدم رہا زندگی کے ہر میدان میں خواہ سکول تھا خواہ کھیل وہ ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ پھر قدرت نے ایک ایسا فیصلہ کیا ہے کہ جس نے ہم سب کی زندگیوں میں اندھیرا بھر دیا۔ اس اندھیرے کا زیادہ حصہ غازی کو ملا۔ ہم تو ماں کی ممتا سے فیضیاب ہوتے رہے لیکن وہ اس نور سے بھی محروم رہا۔'' ان کا لہجہ کرب آگیں ہوتا جا رہا تھا۔

''بھائی...... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میں ٹھیک طرح سمجھ نہیں پا رہا۔'' شہسوار کچھ اُلجھن کے عالم میں اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''شاری...... اگر غازی مل جائے تو تمہارا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہو گا؟''

''بھائی ویسا ہی جیسا آپ کے ساتھ...... جدائیاں محبتوں کو کم تو نہیں کر سکتیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ماما کب کا انہیں بھول چکی ہوتیں۔ ہم دو تو موجود تھے ناں ان کے پاس لیکن اس کے باوجود اکثر راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر غازی بھائی کے لیے روتی رہی ہیں۔ بھائی۔ وہ میرے لیے اسی طرح قابل احترام اور لائق محبت ہیں جیسے آپ لیکن یہ آج آپ ان کا ذکر کیوں لے بیٹھے؟'' شہسوار حیران پریشان تھا کہ بھائی نے آج تک کبھی غازی سے متعلق اس سے کچھ ڈسکس نہیں کیا تھا اور آج وہ اسی کو موضوع بنائے بیٹھے تھے۔

''اس لیے شاری...... کہ ہمارا وہ گمشدہ حصہ' ہمارے بچپن کا ساتھی' ہمارا بھائی' ہمارا بازو' ہمارا غازی مل گیا ہے۔'' ملک معظم کے لبوں پر مسکان تھی اور آنکھوں میں نمی۔ شہسوار حیرت کے مارے

کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''بھ...... بھائی...... کک...... کیا یہ سچ ہے؟ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ بولیں ناں بھائی غازی بھائی مل گئے......؟ کہاں ہیں وہ......؟ کیسے ہیں بھائی؟ کیا آپ اُن سے مل چکے ہیں؟'' شہسوار نے بے تابانہ ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''نہیں شاری میں اُس سے ابھی ملا نہیں۔ اتنا جان گیا ہوں کہ ماضی میں ہم جس گھر میں رہتے تھے۔ وہ اب وہیں رہ رہا ہے۔ ہمارا غازی غیاث ہے...... تم مل چکے ہو اُس سے۔ شاہو گڑھی والا غیاث جس سے جھگڑا ہوا تھا تمہارا' وہی غیاث ہمارا غازی ہے شاری۔''

شہسوار کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ پندرہ سال پہلے بچھڑ جانے والا بھائی یوں اچانک مل گیا۔ حقیقتاً دونوں بھائیوں کے دل میں خوشی سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ بچپن سے لے کر آج تک دل میں جو پھانس چبھی ہوئی تھی وہ نکل گئی تھی۔

''بھائی...... ماما کو بتا دیا......''

''نہیں شاری...... اب مسئلہ یہی ہے کہ انہیں کس طرح بتایا جائے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کتنے عرصے بعد بستر علالت سے اُٹھی ہیں۔ ہارٹ کی مریضہ ہیں وہ۔ ایسی صورت میں زیادہ خوشی اور زیادہ غم دونوں ہی جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں۔ پھر غازی تو ماما کا وہ انتظار ہے جو پچھلے پندرہ سال سے ان کی آنکھوں میں پل رہا ہے۔ اُس انتظار کو مجسم دیکھ کر ڈر لگتا ہے وہ اپنے حواس نہ کھو دیں۔ ان کو یہ بات کسی ایسے طریقے سے بتانی پڑے گی کہ اس خبر کی شدت ان کے جذبات کو زیادہ نہ متاثر کرے۔'' ملک معظم حساس لہجے میں بول رہے تھے۔

''بھائی...... اس کا صرف ایک حل ہے کہ یہ خبر ہماری بجائے کوئی اور دے۔ جیسے ماہ نور کی اماں یہ کام آسانی سے کر سکتی ہیں۔ اس لیے کہ ایک ماں ہی دوسری ماں کے احساسات کو سمجھ سکتی ہے۔ کیوں ماہ نور کیا خیال ہے آپ کا؟'' شہسوار نے یکدم روئے سخن ماہ نور کی طرف کیا۔

''سر میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' ماہ نور کا ذہن تو پے در پے انکشافات کی زد میں آ کر گویا بالکل لاچار سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس نے ایک نظر دونوں کی جانب دیکھا وہ دونوں بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ غالباً اس کی رائے کے منتظر تھے اور جب وہ چند ثانیے کو کچھ نہ بولی تو شہسوار نے کہا۔

''مس ماہ نور! آپ جا کر اپنی اماں کو یہاں لے آئیں۔ بھائی اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جلد سے جلد ماما کو بتا دیں۔ بھائی ہم سب غازی بھائی کو لینے جائیں گے۔ بھائی پتہ نہیں دل کو کیا عجیب سا محسوس ہو رہا ہے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس اتنا جان سکتا ہوں کہ آج میرے وجود کے اندر سے خوشی پھوٹی ہے۔ میں آج بہت خوش ہوں بھائی بہت زیادہ۔'' فرطِ جذبات سے اس کا گلا رندھ

گیا۔ کیسے ممکن ہے اتنی بڑی دنیا میں کسی کا کھو جانے کے بعد دوبارہ ملنا۔ اس کی نگاہوں میں گہری سرخ آنکھوں والا اونچا لمبا غیاث آ گیا۔

''بھائی...... کیا وہ بھی ہم سے مل کر اتنے ہی خوش ہوں گے؟ کیا ہمیں پا کر ان کے وجود میں بھی طمانیت کا احساس اُترے گا؟ کیا ہماری طرح وہ بھی منتظر ہوں گے؟ محبتوں کے' اپنوں کے' ماں کے۔''

''شاری...... ہم نے جتنا اُسے یاد کیا ہے ناں اُس سے کئی گنا زیادہ اُس نے ہمیں یاد کیا ہوگا۔ اس کے کھو جانے کا جتنا صدمہ ہم نے سہا ہے' ہم سے کہیں زیادہ اُس نے جھیلا ہے۔ وہ تو اس صدمے سے کھلونے کی طرح کھیلا ہوگا۔ اس صدمے کو ہی ماں کی آغوش سمجھ کر اس میں ڈبو لیتا ہوگا خود کو۔ اسی صدمے کو ہم جولی' ہمراز سمجھتا ہوگا۔ ہم نے تو صرف دکھ محسوس کیا ہوگا۔ اُس نے دکھ کو پیا ہوگا' کھایا ہوگا' اوڑھا ہوگا۔ جتنا ہم ترسے ہیں ناں اُس کے لیے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں جس قدر وہ ہماری خاطر ترسا ہوگا' پیٹ کی پیاس بجھ سکتی ہے' روح کی پیاس کیسے بجھے شاری یہ تو لمحہ لمحہ بڑھتی ہے۔ یہ تشنگی وجود کے اندر جلتی ہے' سلگتی ہے اس کا تو کوئی علاج نہیں ہے ناں اور شاری غازی اس تشنگی کا شکار ہے۔'' ملک معظم کے لہجے میں جیسے غیاث کے وجود کی ساری تشنگی در آئی تھی۔ ''اسے ہماری بھرپور توجہ اور محبت چاہیے۔ اس گھر میں آ کر یہاں کے در و دیوار یہاں کے رشتے اسے اجنبی اور نامانوس نہیں لگنے چاہئیں۔'' ملک معظم شہسوار سے مخاطب تھے۔

''بھائی مجھے افسوس ہو رہا ہے یہ سوچ کر کہ میں نے ان پر ہاتھ اُٹھایا تھا لیکن بھائی اس وقت صورت حال ہی ایسی تھی۔'' شہسوار قدرے شرمسار تھا۔

''نہیں تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اُس وقت تم بے خبر تھے۔ اپنے اور اس کے رشتے کے متعلق اور دوسری بات یہ کہ جب وہ ان لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا تو لازمی بات ہے دیکھنے والے کو وہ بھی تو ویسا ہی جیسا انہی کا ساتھی نظر آتا ہوگا ناں۔ خیر چھوڑو۔ میرا خیال ہے کہ مس ماہ نور جا کر خالہ جان کو یہیں لے آئیں تاکہ ان سے مشورہ کرنے کے بعد سوچا جائے کہ آگے اب کیا کرنا ہے۔'' ملک معظم نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر! میں ابھی اماں کو لے آتی ہوں۔'' ماہ نور اُٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے اُس نے مسز جلال کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر دیکھا وہ گہری نیند سو رہی تھیں۔ سو وہ انیکسی کی جانب چل پڑی۔ تقریباً دس منٹ گزرے تھے کہ اماں ماہ نور کے ساتھ شہسوار کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر حیرت و بے یقینی کے تاثرات ثبت تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے پر خوشی کی رمق بھی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً ماہ نور نے انہیں بتا دیا ہوگا کہ ان کے گھر میں خوشیوں کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ اماں ملک معظم کے قریب والے صوفے پر

بیٹھ گئیں۔

''خالہ جان! میرا خیال ہے ماہ نور نے آپ کو بتا دیا ہوگا کہ ہم نے آپ کو یہاں کیوں زحمت دی ہے؟'' ملک معظم نے بات کی ابتدا کی۔

''ہاں بیٹا...... بے حد خوشی ہوئی رابعہ کے دکھوں کا آخر انت ہو ہی گیا۔ شاید قدرت کو اس کا صبر بھا گیا۔ اس کے اذیت کے دن کٹ گئے۔ یہی خوشی کیا کم ہے کہ اس کی سونی آغوش جس کے لمس کو ترستی تھی وہ اب اس کے قریب رہے گا۔'' اماں کی آنکھوں میں خوشی کی نمی تھی اور ہونٹوں پہ خلوص بھری مسکراہٹ۔

''لیکن خالہ جان ایک مشکل ہے......'' ملک معظم نے اماں کو مخاطب کیا۔

''کیا مشکل ہے بیٹا......؟ اب تو مشکل نہیں ہونی چاہیے۔''

''خالہ جان مشکل یہ ہے کہ یہ خبر ماما کو کس طرح سنائی جائے؟ انہیں کیسے بتایا جائے کہ ان کا بیٹا' ان کا غازی مل گیا ہے؟ وہ بیمار ہیں اتنی بڑی خوشی ان کا ناتواں دل شاید سہہ نہ پائے۔''

''ارے یہ کیا کہہ رہے ہو تم......؟ میں یقین سے کہتی ہوں کہ رابعہ کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ خوشی اس کی سانسوں کو بڑھا دے گی۔ اس کی زندگی آسان کر دے گی۔ وہ تو یہ سن کر ہی بھلی چنگی ہو جائے گی۔'' اماں نے کہا تو ملک معظم اور شہسوار نے ان کی طرف دیکھا۔

''اگر تم بات نہیں کر سکتے تو چلو میں بات کروں گی اُس سے۔'' اماں نے تو خود ہی ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔ شام کے دھندلکوں نے پوری کائنات کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ ہر چیز ایک پُرفریب عکس میں ڈھل چکی تھی جب یہ مختصر سا قافلہ مسز جلال کے کمرے میں داخل ہوا۔ سب سے آگے اماں اور ملک معظم' شہسوار اور آخر میں ماہ نور۔ مسز جلال بیڈ پر نیم دراز ہاتھ میں کوئی تاریخی ناول لیے بیٹھی تھیں۔ یوں ان چاروں کو اپنے کمرے میں بے وقت آتے دیکھ کر وہ بُری طرح چونکی تھیں۔ ان کے ذہن میں فوراً یہی خیال آیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو گزرا ہے۔ یوں کبھی وہ سب اکٹھے ان کے کمرے میں آئے نہیں تھے۔ اماں اور ماہ نور ان کے بیڈ پر ان کے قریب بیٹھ گئیں۔ بیڈ کے نزدیک رکھے صوفوں پر ملک معظم اور شہسوار بیٹھ گئے۔ ان سب نے حتی الامکان اپنے چہروں کو سپاٹ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے باری باری چاروں کی طرف دیکھا۔ نظروں میں سوال تھا لیکن زبان خاموش تھی۔ غالباً وہ ان کی اس طرح آمد کا مطلب جاننے کی کوشش میں تھیں۔

''ماما...... آج ہم نے سوچا آپ کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کی جائے۔ شاری کے کمرے میں میں اور ماہ نور بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپر سے خالہ جان بھی آ گئیں تو ہم نے سوچا کہ آپ جاگ چکی ہوں گی سو آپ کے کمرے میں بیٹھنا چاہیے۔'' ملک معظم نے گویا اپنے یہاں اکٹھے ہونے کی صفائی پیش کی۔

''ٹھیک کیا...... میں تو کافی دیر سے جاگ رہی تھی۔ نور کا انتظار کر رہی تھی۔ بہت اچھا کیا جو تم آ گئے۔ زری کیا تم روزانہ میرے لیے تھوڑا سا وقت نہیں نکال سکتیں؟'' انہوں نے پہلے ملک معظم اور بعد میں اماں کو مخاطب کیا۔ وہ ملک معظم کی توجیہہ سے مطمئن تو نہیں ہوئی تھیں لیکن یہ سوچ کر انہوں نے کریدا نہیں کہ وجوہات بھی ہوں گی سامنے آ جائے گی۔

''ماما دراصل خالہ جان آپ کو ایک خوشخبری سنانا چاہتی ہیں۔'' شہسوار نے سارا بوجھ اماں کے کندھوں پر ڈال دیا۔

''کیا...؟ کیا خوشخبری ہے زری...؟'' مسز جلال استفہامیہ نظروں سے اماں کی طرف دیکھنے لگیں۔

''رابی...... شاہین کا رشتہ طے کر دیا ہے میں نے۔''

''اچھا...... کب؟ کیسا ہے لڑکا؟ کہاں رہتا ہے؟''

''شاید جانتی ہو تم... آمنہ یاد ہے تمہیں۔ تمہارے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر اگلا گھر تھا اُس کا۔''

''وہی آمنہ...... وہ جس کا میاں جلال کی مل میں فائر مین تھا کیا نام تھا اس کا۔ ہاں فدا حسین وہی ناں!''

''ہاں بالکل وہی...... فدا بھائی آج کل شارجہ میں ہوتے ہیں جن دنوں کا تم ذکر کر رہی ہو۔ ان دنوں تو ان کے حالات اچھے نہیں تھے لیکن اب خیر سے اللہ کی یاد میں ہیں۔ لڑکا بھی ان کا اچھا۔ بی۔ایس۔سی میں پڑھ رہا ہے۔''

''چلو اللہ مبارک کرے۔ بڑی پیاری بچی ہے شاہین۔'' مسز جلال حقیقتاً خوشی کر رہی تھیں۔

''رابی ایک خوشخبری تمہارے لیے بھی ہے لیکن اس کے بدلے میں ہمیں بھی کچھ چاہیے۔''

''کیا......؟'' مسز جلال بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ اب کی آنکھوں میں دلچسپی کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ جانتی نہیں تھیں کہ اس وقت ان کے کمرے میں موجود افراد ان کے لیے حیات نو کے پیامبر بن کر آئے ہیں۔ وہ پندرہ سال سے ان کے وجود میں چبھے درد کے نشتر نکالنے آئے تھے۔ انتظار کی طویل شب کے بعد سحر کا پیغام لے کر آئے تھے لیکن وہ ان سب باتوں سے بے خبر بالکل ہلکے پھلکے موڈ میں تھیں۔

''اچھا یعنی ایک بیمار سی بے چاری سی عورت کو ایک اچھی خبر سنانے کے بدلے میں تم رشوت لو گی۔'' مسز جلال مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''ارے ہٹو بھی بے چاری کہاں سے ہو گئی جس ماں کے پاس تین تین کڑیل جوان ہوں وہ بے چاری کہاں سے ہو گئی۔ اب جلدی سے بتاؤ جو مانگیں گے ہمیں دو گی؟'' اماں تو جیسے پندرہ سال

پہلے والی زری کے روپ میں ڈھل گئی تھیں۔

''ٹھیک ہے...... منظور......'' مسز جلال بھی جیسے بہل گئی تھیں۔

''پہلے ایک بات بتاؤ رابی...... اگر تم سے تمہاری کوئی بہت قیمت چیز کھو جائے اور اس کے ملنے کا کوئی گمان تک نہ ہو اور پھر اچانک تمہیں وہ چیز کہیں تمہارے آس پاس سے مل جائے تو کیسا لگے؟''

''یقینی بات ہے اچھا لگے گا۔''

''کتنا...... کتنا اچھا لگے گا؟'' اماں نے سوال کیا۔

''یہ تو اس چیز کی اہمیت پر منحصر ہے جتنی اہم ہوگی اتنا ہی زیادہ خوشی ہوگی لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟ جو بات بھی ہے سیدھی طرح کہہ دو۔ زری...... کیا اب تمہیں بھی مجھ سے بات کرنے سے پہلے تمہید باندھنے کی ضرورت پیش آ گئی۔'' مسز جلال کچھ شاکی سے انداز میں اماں کی طرف دیکھنے لگیں۔ اماں نے ایک نظر ملک معظم، شہسوار اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ تینوں بہت توجہ اور گہری دلچسپی سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''دراصل رابی...... بات یہ ہے کہ......''

''زری...... بتادو...... جو بھی بات ہے بتادو۔ سچ کہتی ہوں اب دل ہر بات سہنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔''

''ارے تم پریشان کیوں ہوگئیں؟ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' اماں نے مسز جلال کے چہرے پر پھیلے افسردہ سے تاثر کو دیکھ کر کہا۔

''خالہ جان...... میرا خیال ہے ماما کو اب بتا ہی دینا چاہیے۔ خوشی کی خبر زیادہ دیر تک چھپائے رکھنے سے پیٹ میں اپھارہ بھی ہوسکتا ہے۔'' شہسوار نے ماحول پر چھائی یاسیت کو کم کرنے کے لیے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ مسز جلال کنفیوز سی کبھی ایک طرف دیکھ رہی تھیں کبھی دوسرے کی طرف۔

''رابی...... تمہارا اغازی مل گیا ہے۔'' اماں کی زبان سے یہ حیات خیز لفظ مسز جلال کی سماعت سے ٹکرائے تو چند لمحوں کے لیے جیسے ہر چیز پر سکوت طاری ہوگیا۔ کائنات کی گردش تھم گئی۔ ماہ و سال جیسے چلتے چلتے رُک گئے۔ موسم نے بھی پل بھر کو ٹھہر کر اس خوشی پر حیرت کا اظہار کیا۔ دھڑکنیں ساکن جھیل کی طرح ہوگئیں یوں کہ جیسے ہوا چلے تو رُکے ہوئے پانی میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ مسز جلال کی پلکوں نے جنبش کی۔ ساکت پُتلیوں میں حرکت ہوئی جو خوشی کے شدید احساس سے یکدم یوں ہوگئی تھیں جیسے دور افق پر سحر کا تارہ۔ انہوں نے اماں کی طرف دیکھا ڈھیرے ڈھیرے آنکھوں میں نمی تیری۔ ملک معظم اور شہسوار دونوں اُٹھ کر مسز جلال کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ شاید وہ اپنی ماں کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ یہ خوشی تنہا ان کی نہیں وہ بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کا بھی تو اس خوشی سے کوئی ناطہ ہے تعلق ہے۔ وہ ماں کی تڑپ کو تو نہیں پہنچ سکتے تھے

لیکن اس بات کا تو انہیں بھی اعتراف تھا کہ بارہا ان کی آنکھوں نے اپنے اُس ساتھی کو تلاشا تھا جو ان کے ساتھ کھیلا تھا، لڑا تھا۔ سکول جاتے ہوئے ہاتھ میں ہاتھ دیئے یا پھر ماں کے اردگرد بیٹھ کر سات پریوں، سات شہزادوں کی کہانی سنتے ہوئے۔ بچپن کا ہر لمحہ ساتھ ساتھ گزرا تھا لیکن لڑکپن اور جوانی اس کے ساتھ محروم گزری تھی۔ کتنی بار اُسے یاد کر کے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آئے تھے لیکن ماں تو ماں تھی ناں۔ وہ آج تک اس کے نرم گرم معصوم وجود کے لمس کو نہیں بھول پائی تھیں۔ وہ چھوٹا سا تھا تو کیا کیا شرارتیں کیا کرتا تھا۔ اُس نے جب پہلی بار ماں کہا تھا تو انہوں نے کیسے بڑھ کر اُسے چٹاچٹ بوسے دیئے تھے گالوں پر، بالوں پر۔ اس کی چمکتی گہری سیاہ آنکھوں پر کہ جن میں جہان بھر کی محبت بھر کے وہ انہیں دیکھتا تھا۔

پھر جب وہ تھوڑا سا بڑا ہوا تو اور بھی ماں کے نزدیک ہوتا گیا۔ حساس اتنا تھا کہ کبھی جو ماں نے ڈانٹ دیا یا باپ نے کچھ کہہ دیا تو اُس نے پہروں یہی سوچتے گزار دینا کہ ماما یا پاپا نے مجھے ایسا کیوں کہا۔ اس کی آنکھیں بولتی تھیں، ماں اس کی ایک ایک رمز جانتی تھیں۔ وہ سمجھ جاتی تھیں کب وہ غصے میں ہے، کب ناراض ہے، کب خوش ہے اور کس وقت شرارت کے موڈ میں ہے۔

''زری...... زری تم نے کیا کہا......؟ میری سماعت معذور ہوگئی ہے میں سمجھ نہیں پا رہی۔ مجھے بتاؤ ناں، تم نے ابھی ابھی کیا کہا ہے؟'' وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اماں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''میں نے وہی کہا ہے رابی جو تم نے سنا ہے، تمہارے دل کا چین، آنکھوں کا نور، تمہارا اغازی مل گیا ہے۔'' اماں نے کہا۔ وہ چند لمحے ان کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد یکدم ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی تھیں۔ وہ سب گھبرا گئے۔ یکدم آگے بڑھ کر انہیں خاموش کرانا چاہا تو اماں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ مسز جلال کا سارا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔ پھر انہوں نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ سرخ متورم آنکھیں اور ہونٹوں پر ایک انوکھی مسکراہٹ جس کی ایک ایک سلوٹ میں ممتا کی چاشنی گھلی ہوئی تھی۔

''ماما...... آپ...... آپ ٹھیک ہیں ناں۔'' شہسوار ان کے اس طرح رونے سے بہت بے چین لگ رہا تھا۔ پریشان تو ملک معظم بھی تھے لیکن انہیں اپنے احساسات پر کنٹرول تھا۔ وہ ماں کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''زری...... زری...... مجھے بتاؤ کہاں ہے وہ......؟ مجھے لے چلو اس کے پاس۔'' وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ سب نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ کیونکہ ان کے قدموں میں لرزش تھی نہ چال میں لڑکھڑاہٹ۔

''مجھے لے چلو ناں زری...... لے چلو...... کہاں ہے میرا اغازی؟'' وہ سنبھل گئی تھیں۔ ایسا کچھ

بھی نہیں ہوا تھا جیسا اُن سب نے سوچا تھا۔ انہوں نے بہت جلدی اپنے احساسات کو کنٹرول کرلیا تھا۔ ورنہ ملک معظم اور شہسوار کا خیال تھا کہ پے در پے درپیش صدمات کے بعد اب ان کے اعصاب اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ وہ شاید اب خوشی کی خبر کو بھی سہہ نہ پائیں لیکن وہ بالکل ٹھیک تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک دم ان میں بہت ساری انرجی انجیکٹ ہو گئی ہو۔

''معظم...... چلیں پھر......؟'' اماں نے اجازت طلب نظروں سے ملک معظم کی طرف دیکھا۔ جواب میں انہوں نے ایک نظر اپنی ماں کے خوشیوں سے چمکتے چہرے کی طرف دیکھا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''ماما...... کیا...... کیا وہ ہمیں تسلیم کر لے گا؟'' ملک معظم کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔ پندرہ سال کم نہیں ہوتے یادوں کے آئینے پر بے حسی کی گرد جمانے کے لیے۔ اس عرصے میں تو خون کا رنگ تک بدل جایا کرتا ہے۔ پھر وہ تو جانے کیسے حالات میں جیتا رہا ہوگا۔ اتنا طویل عرصہ جس نے ماں کی آغوش نہیں دیکھی۔ گھر کا ماحول نہیں دیکھا۔ وہ کیا جانتا ہوگا رشتوں کی تڑپ کو۔ کہیں وہ ماں کی مچلتی بانہوں کو نظر انداز نہ کر دے۔ اس کی ممتا کو دھتکار نہ دے۔ کہیں ایسا نہ ہو اس کی آنکھیں گزرے ماہ و سال نے پتھر کر دی ہوں۔ وہ جان ہی نہ سکے کہ آج بھی وہ ان سب کے دل میں جگہ رکھتا ہے۔ آج بھی ماں کی نظریں گھر کی چوکھٹ پر دھری رہتی ہیں کہ جانے کب اس کا بھولا بھٹکا ہوا بیٹا لوٹ آئے۔ کب اس کی تڑپتی ممتا کو قرار آئے۔ ملک معظم کے ذہن میں غازی کے مل جانے کی خوشی ضرور تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ان گنت سوالوں کے خار ان کے ذہن میں چبھ کر اُن کی سوچوں کو زخمار ہے تھے۔

''کیوں...... کیوں نہیں کرے گا تسلیم......؟ اگر نہیں مانتے گا تو مجھے آتا ہے منانے کا طریقہ۔ میری ممتا کے آگے زیادہ دیر اس کی ضد نہیں ٹک سکے گی۔ اسے ماننا ہوگا مجھے' میری ممتا' میری محبت کو۔ وہ مانے گا۔ بس ایک بار مجھے اس کے پاس لے چلو۔ فلوقی یہ سوالوں کا وقت نہیں ہے۔ وہاں چلو...... ہر سوال کا جواب مل جائے گا تمہیں۔'' ان کی بے چینی دیدنی تھی۔

''ماہ نور بچی تم گھر کا اور بہنوں کا خیال رکھنا میں رابی کے ساتھ جاؤں گی۔'' اماں نے ماہ نور سے کہا۔

وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے لان میں پہنچ گئے تھے۔ ماہ نور ''جی اچھا'' کہہ کر انیکسی کی جانب پلٹی گئی جبکہ ملک معظم' حمد واور چوکیدار سے گھر کا خیال رکھنے کو کہہ کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ شہسوار' اماں اور مسز جلال بھی ان کے ہمراہ تھیں اور چند ہی لمحوں میں ان کی گاڑی گیٹ سے باہر آ چکی تھی۔ گاڑی مخصوص راستوں پر عازم سفر تھی اور سب کے دل آنے والی گھڑیوں کے متعلق سوچ کر

دھڑک رہے تھے۔ ایک انجانا سا احساس رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ رہا تھا۔ بھائیوں کے ذہنوں میں ایک ہی سوچ تھی کہ جانے ان سب کو دیکھ کر غازی کا کیا ردعمل ہو۔ کیا اس کا دل بھی ان کی محبت میں دھڑک اُٹھے گا۔ خاص طور پر شہسوار کچھ نروس سا تھا۔ اس لیے کہ اُس نے غازی پر ہاتھ اُٹھایا تھا لیکن ماں کے احساسات ان سب سے جدا تھے۔ اس کے ذہن میں پندرہ سال پہلے کا غازی کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ کبھی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کے آنسو صاف کرتا ہوا کبھی اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلتا زندگی سے بھرپور غازی۔ ان کی بانہوں کو اس کے معصوم وجود کا نرم گرم لمس گدگدا رہا تھا۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے لیکن آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ آج جیسے ساری دنیا ہی اور کی اور ہو گئی تھی' نکھری نکھری۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر چہرہ خوش ہے' مسکرا رہا ہے۔ ہر آنکھ کا خواب پورا ہو گیا۔ ہر یاد کو قرار آ گیا۔ ہر سُو پھول کھل اُٹھے۔ تتلیوں کو بہار کا موسم میسر آ گیا۔ ہر طرف خوشیاں رقصاں ہو گئیں۔ گاڑی جانی پہچانی گلی کے سامنے رُک گئی تھی۔ وہ جیسے گہری نیند سے جاگیں چاروں سمت دیکھا۔ اردگرد کا ماحول بہت حد تک بھول چکا تھا لیکن اب بھی پندرہ سال پرانے شاہوگڑھی کی باقیات میں اتنی زندگی ضرور تھی کہ اپنا آپ دکھا سکیں۔ وہ گاڑی سے اُتر آئیں۔ ملک معظم اور شہسوار آگے آگے چل پڑے۔ اماں مسز جلال کے ہم قدم ہو گئیں۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی چاچے ساجے کی دُکان تھی۔ سب سے پہلے چاچے کی نظر مسز جلال پر پڑی تھی۔ وہ کچھ ہونق سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔

''ملک بی بی...... اتنے عرصے بعد...... اس گلی میں۔'' وہ حیران بھی تھا اور قدرے سوچ میں ڈوبا ہوا۔ ملک جلال کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا جن دنوں وہ نشے کی وجہ سے کئی کئی دن گھر سے باہر رہتے تھے۔ ان دنوں ان کے گھر میں سارا سودا سلف چاچے ساجے کی ہی دُکان سے اُدھار آیا کرتا تھا۔ چاچے ساجے کی ہی کوششوں سے انہیں سلائی کا کام ملنا شروع ہوا تھا جس کی وجہ سے گھر کا دال دلیا چلنے لگا۔ ورنہ ملک جلال تو کوڑی کوڑی کو محتاج ہو چکے تھے۔ مسز جلال نے چاچے کو دُکان میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پچھلے پندرہ سالوں نے شناسائی کے چہرے پر اجنبیت کی لکیریں تو کھینچ دی تھیں لیکن بہت دھندلی۔ ان لکیروں کے پار سے چہرے کچھ کچھ جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ وہ چند لمحے چاچے کی دُکان کے پاس کھڑے ہو کر ان کا حال احوال پوچھنے کے بعد آگے بڑھ گئیں۔ محلے میں بہت سے لوگ نئے آباد ہوئے تھے لیکن پھر بھی وہاں انہیں اجنبی پن محسوس نہیں ہوا۔ اماں کے ساتھ چلتے چلتے وہ آخر اس دروازے پر پہنچ گئیں جہاں سے ایک روز وہ اپنی خوشیوں کی سحر چھوڑ کر تنہائی کی اندھیری رات اوڑھ کر نکلی تھیں۔ پھر دنیا کے لیے تو اس کے بعد بھی صبحیں ہوتی رہیں' شامیں ڈھلتیں رہیں لیکن ان کے مقدر میں وہی سیاہ رات اپنی جزئیات سمیت' اس کے اندھیرے میں ان کی خوشیاں' ان کا سکون' اس کے سکھ اور ان کا غازی سبھی کچھ تو کھو گیا تھا اور آج وہ ایک بار پھر اسی

دروازے پر آئی تھیں کہ زندگی کی شام ڈھلنے سے پہلے وہ اپنے گھر کے چراغ سے در و دیوار روشن کر دینا چاہتی تھیں۔ ملک معظم اور شہسوار ان کے دائیں بائیں کھڑے تھے جبکہ اماں ایک قدم پیچھے تھیں۔ دروازے پر کنڈی لگی ہوئی تھی لیکن تالا نہیں تھا۔ مسز جلال کنڈی کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ ہر چیز ویسی تھی اسی طرح جس طرح سے چھوڑ کر گئی تھیں۔ پلستر اُکھڑی دیواریں... ٹوٹا پھوٹا فرش لیکن ایک چیز انہیں عجیب لگی۔ سارے محلے کے لوگوں نے ان کے گھر کو کوڑے کا ڈھیر سمجھ رکھا تھا۔ مغربی دیوار کے ساتھ کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کنواں بھی کچرے سے بھرا ہوا تھا۔ کچن کا حال بھی بہت بُرا تھا۔ سلور کی پتیلی اور ایک کٹورہ کچن کے بیچوں بیچ فرش پر اوندھے دھرے تھے۔ چائے کے پیالوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کچن میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

کمرے کے دروازہ پر بھی محض کنڈی لگی ہوئی تھی۔ مسز جلال نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بھی کھول دیا۔ یادیں اُن پر اس طرح یکدم حملہ آور ہوئی تھیں جیسے سالوں بعد کسی سنسان حویلی کا سانحوردہ دروازہ کھولنے پر چمگادڑیں چیختی چلاتی ہوئی آنے والے پر حملہ کرتی ہیں۔ وہ جانے کس سوچ میں تھیں کہ چہرے پر پھیلے تاثرات سے کسی ایک جذبے کو سمجھنا مشکل تھا۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوئیں کمرے کی دیواریں جیسے اپنے مکین کی تنہائی پر نوحہ کناں تھیں۔ ایک جھلنگا سی چارپائی' تین ٹانگوں والی کرسی اور دیوار پر لگی ایک تصویر اس کمرے کی کل متاع تھیں۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی تصویر کے پاس آئیں۔

''زری...... اُسے مجھ سے محبت ہے۔ وہ مانتا ہے میری ممتا کو جانتا ہے کہ میں اس کی ماں اسے یوں چھوڑ کر جانے میں قصوروار نہیں ہوں۔ یہ...... یہ تصویر...... یہ تصویر ثبوت ہے اس بات کا۔'' شدتِ جذبات سے ان کی آواز لرز رہی تھی۔ ملک معظم اور شہسوار الگ ایک طرف کھڑے دیکھ رہے تھے وہ شاید اس بات پر افسردہ تھے کہ ان کا بھائی اُن سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور کیسی محروم زندگی گزارتا رہا۔

''زری...... غازی...... غازی کہاں ہوگا اس وقت؟'' مسز جلال بے قرار تھیں۔ انتظار تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا اور ہر گزرتا پل ان کی تڑپ میں اضافہ کیے دے رہا تھا۔

''رابی...... اس کا یہ واحد ٹھکانہ ہے یہاں نہیں تو پھر اُسے ڈھونڈنا ناممکن ہے لیکن تم پریشان نہ ہو آ جائے گا ابھی۔'' اماں ان کا شانہ تھپک کر انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھ کر اسی جھلنگا چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

''زری جب تک اس کی کوئی خبر نہیں تھی ناں تو دل کو صبر تھا۔ اب جب سے اس کے بارے میں پتہ چلا ہے صبر نہیں ہوتا۔ کیا کروں پندرہ سال کم نہیں ہوتے ایک ماں کا صبر آزمانے کے لیے۔''

مسز جلال بولیں تو ان کے لہجے میں دُکھوں کی کانچ ٹوٹ رہے تھے۔ رات کے دس بج رہے تھے انہیں آئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ دیوار کے پار سے خالہ کلثوم نے جھانکا تو گھر میں کچھ رونق سی محسوس ہوئی۔ چند ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ حیران سی سر پر برقعہ تانے ادھر پہنچ گئیں لیکن کمرے میں پہنچتے ہی جھلنگا چارپائی پر مسز جلال کو بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رُک گئیں۔ غالباً انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ خانماں برباد غیاث کو بھی آخر کار ٹھکانہ مل گیا۔ رابعہ کی یہاں موجودگی کی حیرت اس قدر تھی کہ زبان چند ثانیے کو بالکل گنگ ہو کر رہ گئی۔ مسز جلال بھی انہیں دیکھ چکی تھیں اور نہ صرف دیکھ بلکہ پہچان چکی تھیں اور چارپائی پر سے اُٹھ گئی تھیں۔

''کلثوم! کیا پہچانا نہیں؟ رابعہ ہوں۔ تمہاری بہن رابعہ۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر خالہ کو دونوں شانوں سے تھام کر گویا ہوش کی دنیا میں لانا چاہا۔

''رابعہ...... رابعہ...... تم کہاں چلی گئی تھیں؟'' اماں کی طرح خالہ کلثوم نے بھی ان کے گلے سے لگ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ شاید بچھڑے ہوئے کو ملنے کے بعد خوشی کے ساتھ ساتھ وہ سارے غم بھی یاد آ جاتے ہیں جو اُس نے جدائی میں سہے ہوتے ہیں۔ ان دُکھوں کو اکیلے سہہ جانا مشکل نہیں لیکن جب اپنے ملتے ہیں تو دوبارہ سے وہ دکھ اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے آنسوؤں کی شکل میں سامنے آ جاتے ہیں' اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ خالہ کلثوم کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں رابعہ کے ملن کی خوشی بھی تھی اور غیاث کی کم نصیبی اور محرومی کا نوحہ بھی۔ مسز ملک اپنے ماضی کے بوسیدہ اوراق پر لکھے حالات کے لفظوں کو پڑھ رہی تھیں کہیں غم کی عبارت تھی تو کہیں خوشی کی۔ انہی اوراق میں ان کے وجود کا حصہ بھی کھو گیا تھا۔ آج وہ اسی حصے کی تلاش میں یہاں تک آئی تھیں لیکن بند دروازوں نے ان کا استقبال کیا تھا۔ خالہ کلثوم نے اپنے گھر سے ایک دو چارپائیاں منگوائیں اور سب وہیں صحن میں بیٹھ گئے۔ اس وقت سبھی کا موضوع گفتگو وہی تھا جو کسی کے لیے غازی تھا اور کسی کے لیے غیاث لیکن شاید اپنے لیے وہ کچھ بھی نہیں تھا۔

خالہ نے شروع سے لے کر اب تک کی ساری کہانی سنا دی' ایک ایسی کہانی جس میں سوائے آنسوؤں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ کمرے میں موجود تمام افراد دم سادھے سن رہے تھے۔ کڑی سے کڑی ملتی جا رہی تھی اور جدائیوں کی کتھا اپنی تکمیل کو پہنچ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے شب کا پردہ چاک ہونے لگا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا ہی چاہتا تھا لیکن انتظار ختم نہ ہوا تھا۔ وہ جس کی آمد کی منتظر آنکھوں نے رات یونہی کاٹ دی تھیں نہیں آیا تھا۔ خالہ کلثوم صبح صبح اپنے گھر سے سب کے لیے ناشتہ بنا کر لے آئیں اور سب کو اصرار کر کے کروایا۔ ملک معظم تھوڑی دیر کے لیے آفس چلے گئے۔ اماں' ماہ نور اور بچیوں کی وجہ سے پریشان تھیں سو شہسوار ان کی طرف چلا گیا۔ مسز جلال کی پلکیں بار بار نم ہو جاتیں۔ خالہ کلثوم

ان کا دھیان بٹانے کی کوشش میں لگی رہیں لیکن اب شاید ان کے تمام حوصلے ان ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ ہر آہٹ پر وہ یوں چونک اُٹھتیں جیسے اچانک کہیں سے وہ آ گیا ہو۔ شہسوار' ماہ نور وغیرہ کی خیر خبر لے کر واپس آ چکا تھا۔ دن ڈھل گیا شام کا ملگجا سا اندھیارہ پھیلنے لگا تھا لیکن اُسے نہ آنا تھا نہ آیا۔

انتظار اب نا امیدی اور مایوسی میں ڈھلنے لگا تھا۔ آنکھوں نے آہٹ پر چونکنا چھوڑ دیا۔ دل گرفتگی نے یوں سب کے دلوں پر اور ذہنوں پر سناٹا پھیلا دیا کہ جیسے یہاں موجود افراد جیتے جاگتے انسان نہ ہوں مٹی کے بے جان مجسمے ہوں۔

''خالہ جان...... اسد کیا اسی محلے میں رہتا ہے؟'' شہسوار نے کسی خیال کے تحت اماں سے پوچھا۔

''ہاں...... یہیں رہتا ہے۔ کیوں؟'' اماں نے سوال کیا۔

''خالہ جان...... اُس سے یقیناً ہمیں غازی بھائی کے بارے میں معلومات مل سکتی ہے۔ کہاں ہے اس کا گھر......؟''

''ہمارے گھر کے بائیں طرف بالکل ساتھ جڑا ہوا گھر ہے ان کا۔''

''پھر ماما میں اسد کو بلا کر لاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔'' شہسوار یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ مسز ملک مضمحل سے انداز میں چارپائی پر نیم دراز تھیں۔

''ارے رابی...... کیوں پریشان ہوتی ہو۔ جب اس کا پتہ چل گیا تو سمجھو وہ مل گیا۔ اتنی وسیع دنیا میں کسی کو ڈھونڈنا مشکل بلکہ ناممکن ہے جب اس کو ڈھونڈ لیا تو پانا کیا مشکل۔'' اماں انہیں تسلی دے رہی تھیں۔

''ہاں...... شاید تم ٹھیک کہتی ہو لیکن زری میرا مقدر تو کچھ اور کہتا ہے میں اس کو کہاں لے جاؤں۔'' نا امیدی کے بادل یوں ان کے دل پر چھا گئے تھے کہ وہ چاہنے کے باوجود بھی ان سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ پندرہ سال تڑپتے عذاب جدائی سہتے گزر گئے اور اب جب جدائیوں کی ساعتیں کٹ جانے کا مژدہ ملا تھا تو پھر انتظار دوبارہ انتظار۔ اب اُن میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ ابھی اماں ان کی بات کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ دروازے سے اسد اور شہسوار کو اندر آتے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ اسد اور شہسوار خاموشی سے آ کر مسز ملک کے قریب بیٹھ گئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر جانے ایسی کیا چیز رقم تھی کہ مسز ملک کی رہی سہی امید اور بھی جیسے ختم ہو گئی۔

''ماما...... بھائی یہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔'' شہسوار کی دھیمی آواز یوں لگ رہی تھی جیسے اندھیرے کنوئیں سے آ رہی ہو۔

''چلا گیا...... مگر کیوں......؟ کہاں؟'' مسز ملک کی آواز میں محسوس کی جانے والی تڑپ تھی۔

''آنٹی...... آئی ایم سوری...... یہ غلطی میری ہے۔ دراصل کل آپ کے گھر پر یہ بات کھل گئی

تھی کہ غیاث بھائی ہی آپ کے بیٹے ہیں۔ یہ بات میرے اور نور آپی کے درمیان ہوئی تھی۔ گھر آ کر میں نے اپنی دانست میں غیاث بھائی کو یہ خوشخبری سنائی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے حد خوش ہوں گے لیکن وہ پریشان سے ہو گئے۔ مجھ پر خفا ہوئے کہ میں نے غلط کیا' مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جیسے ہی آپ تک یہ خبر پہنچے گی۔ آپ سب انہیں لینے آ جائیں گے۔ اس لیے وہ بنا پتہ بتائے جانے کہاں چلے گئے؟'' اسد کے لہجے میں دکھ اور ندامت تھی۔

فضا میں معلق ایک شیشہ زمین کی جانب گرا۔ چند لمحات کو موت کا گماں طاری کر دینے والے سکوت کا احساس ہوا۔ پھر ایک زوردار چھناکا ہوا۔ پتھر لگا تھا' ساعت کے شیشے کی کرچیاں دماغ میں نشتر بن کر اُتر گئی تھیں اور پتھر ذات کے اتھاہ سمندر میں جا گرا۔ کتنی ہی لہریں اُبھریں اور پھیلیں۔ ان لہروں کی شدت نے کچھ دیر کے لیے ان کے اعصاب کو منجمد کر کے رکھ دیا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسد کی جانب دیکھے گئیں۔ شاید وہ اسد کے دماغ میں جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ اُس نے جو کہا ہے سچ کہا ہے یا اُن سے مذاق کیا ہے یا پھر جو کچھ انہوں نے سنا ہے کیا واقعی اُس نے وہی سب کہا ہے۔ ان کا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ وہ بچہ جو پندرہ سال تک ماں کی محبت کے لیے اس کی آغوش کے لیے تڑپتا رہا' بلکتا رہا۔ اُسے جب یہ پتہ چلے کہ اس کی ماں اُسے حالات کی تمازت سے بچانے کی خاطر اپنا ممتا بھرا آنچل وا کیے چلی آ رہی ہے۔ محبت کی تشنگی کا گلا گھونٹنے کے لیے اپنی بانہیں پھیلائے اس کی جانب بڑھ رہی ہے تو یہ سب دیکھ کر وہ رُخ بدل کر بھاگ کھڑا ہوا! وہ سوچ رہی تھیں کہ کہاں کمی تھی؟ کیا کمی تھی ان کی محبت میں؟ ان کی ممتا میں......؟ کیا کمزوری تھی ان کے جذبوں میں؟ جو پندرہ سال قطرہ قطرہ انتظار اور تنہائی کا زہر اپنے اندر اُتارنے کے بعد ان کی محبت اپنا آپ نہ منوا سکی اور وہ دامن چھڑا کر چلا گیا۔ ان کا انتظار ہی رہا۔

ملک معظم نے دروازے میں داخل ہوتے وقت اسد کے یہ الفاظ سنے اور وہیں ٹھٹک کر رُک گئے۔ چند لمحے کو جیسے ان کا دل کسی نے آہنی شکنجے میں جکڑ دیا ہو۔ قدم بوجھل ہو گئے ان کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہو گیا۔ ان سب کو مسز جلال کی کیفیت اور اسد کے کہے ہوئے الفاظ کی شدت کا پورا پورا ادراک تھا۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ کے ردعمل میں جو کیفیت مسز جلال پر طاری ہو گئی تھی اُسے دیکھ کر اسد ہی کیا اماں اور شہسوار کے چہروں پر بھی اندیشوں کے سائے منڈلانے لگے۔

''رابی......'' انہوں نے مسز جلال کو کندھے سے ہلایا۔ ''رابی...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچہ ہے اور بچے تو ناسمجھی میں جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ وہ بھی نادانی میں چلا گیا ہے آ جائے گا واپس۔'' اماں ان کو تسلی دے رہی تھیں۔

شہسوار بھی ماں کے قریب چلا آیا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی بکھری ہوئی تھی مگر مسز جلال

کو تو جیسے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔ ان کی ذات کے اندر تو گویا سیاہ آندھیوں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔ ایک اعصاب شکن شور سا تھا جس نے ہر سوچ اور ہر جذبے کو تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اسی طرح ساکت بیٹھی یک ٹک اسد کی جانب دیکھے گئیں۔ گویا انہوں نے اماں کی بات سنی ہی نہ ہو۔ بیرونی دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ملک معظم کی موجودگی سے بھی بے خبر تھے۔ پیدا ہونے جانے والی صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی جیسے وہ اندر سے دہل کر رہ گئے۔ انہیں پوری طرح اندازہ تھا کہ ان کی ماں کی سانسیں پچھلے پندرہ سال سے غازی کے نام کی تسبیح کرتی آئی ہیں۔ ان کی دھڑکنیں اگر دل سے مربوط تھیں تو صرف غازی کی یاد کے باعث۔ اس کے مل جانے کی امید پر۔ اب پندرہ سال بعد یوں چند لمحات کے اندر اندر غازی کے مل جانے کا یقین اور اس کے دوبارہ بچھڑ جانے کی نوید ان کی سانسوں کی تسبیح کے دانوں کو بکھیر سکتی تھی۔ دل اور دھڑکنوں کے ربط کو توڑ سکتی تھی۔ ان کے پاس کوئی ایسا منتر نہیں تھا جسے پڑھ کر وہ پھونکتے اور غازی کو ماں کے سامنے کھڑا کر دیتے اور ماں کی زندگی بچا لیتے۔

پھر جیسے لمحوں میں تمام فیصلے از خود ہی ہو گئے۔ ان کے چہرے پر پھیلا ہوا دھواں جیسے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ ایک سورج سا طلوع ہوا اور آنکھوں کی دھندلاہٹ پر ایک چمک حاوی ہو گئی۔ ہونٹوں پر جمی ہوئی موت سی خاموشی کو زندگی کی مسکراہٹ نے کھرچ ڈالا۔ انہوں نے وہیں سے ایک قہقہہ لگایا اور بڑے پراعتماد قدموں سے آگے بڑھے۔

''السلام علیکم ایوری باڈی...... کیا ہو رہا ہے؟ خیریت تو ہے؟'' وہ ان کے سامنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے جھک کر مصنوعی تشویش بھرے لہجے میں بولے۔ شہسوار نے پریشان نظروں سے ملک معظم کی طرف دیکھا۔

''بھائی...... وہ...... وہ۔''

''کچھ بولو بھی تو سہی کیا وہ وہ؟'' ملک معظم نے آنکھیں پٹپٹا کر دلچسپی کا تاثر دیا مگر شہسوار کے بولنے سے پہلے ہی اماں بول پڑیں۔

''بیٹا وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی غیاث کو ہماری آمد سے متعلق علم ہو گیا تھا سو وہ نہ جانے کدھر چلا گیا ہے۔'' لہجے میں فکر و پریشانی تھی۔

''کیا مطلب......؟ کیا مطلب ہے آپ کی بات کا؟''

اماں نے نظر اُٹھا کر اسد کی سمت دیکھا۔ ملک معظم بھی رُخ بدل کر اسد کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''کیا مسئلہ ہے یار؟ کچھ تم ہی بتاؤ مجھے۔''

''معظم بھائی...... وہ کل جب میں واپس آیا تو میں نے غیاث بھائی کو وہ ساری بات بتا دی جو

وہاں ہوئی تھی۔ ماں کے لیے آپ سب کے لیے وہ بچپن سے تڑپتے رہے ہیں۔ سو مجھے یقین تھا کہ وہ میری بات سن کر خوشی سے اُچھل پڑیں گے اور آپ لوگوں کے آنے سے پہلے ہی وہ خود آپ سب تک پہنچ جائیں گے مگر میری بات سن کر وہ بجائے خوش ہونے کے بہت زیادہ فکرمند ہو گئے۔ تبھی انہوں نے بتایا کہ وہ یہ سب پہلے سے جانتے ہیں کہ آپ ان کے بھائی ہیں۔ میرے یہ بتانے پر کہ آپ سب لوگ ان کو لینے کے لیے پہنچ رہے ہیں وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔'' اسد کہہ رہا تھا اور ملک معظم گہرے اچنبے سے اس کی بات سن رہے تھے اگر وہ پہلے سے جانتا تھا کہ ہم اس کے بھائی ہیں تو پھر وہ ہم سے دور کیوں رہا۔ اُس نے ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ وہ کون سی وجوہات تھیں کہ جن کی بناء پر وہ ہم سے کتراتا رہا۔ اگر وہ یہ جانتا تھا کہ ہم اس کے بھائی ہیں تو یقینی طور پر وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ ہم کس قدر اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ اُس نے ہم سے رابطہ کیوں نہ کیا؟ کیوں کسمپرسی کی زندگی گزارتا رہا۔ ہمارے لیے اماں کے لیے وہ تڑپتا رہا تو پھر جب پہلی بار اُسے پتہ چلا تھا کہ ہم سب اس کے اتنے قریب ہیں تو وہ بے اختیار ہو کر کیوں ہمارے سامنے نہ آ کھڑا ہوا۔ کیوں نہ اس کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی ہم سے ملنے کو؟ ہمارے بیچ رہنے کو؟ کیوں نہ اس کا دل مچلا؟ ان گنت سوال تھے جو ملک معظم کے ذہن کے نہاں گوشوں سے نکل نکل کر ان کے شعور میں آ رہے تھے۔ انہوں نے اسد کی جانب دیکھا۔ اسد تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''غیاث بھائی یہ سن کر بہت فکرمند ہو گئے تھے ان کے ذہن میں یہ نظریہ تھا کہ ان کے دامن پر بہت سے داغ ہیں بہت سے دھبے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اپنی زندگی کے سارے بوجھ میں تنہا اُٹھاؤں گا۔ میرے ماضی کی سیاہ چادر اتنی کثیف ہے کہ اپنے سفید پوش بھائیوں اور ماں کے ساتھ میرا رہنا کسی طور پر مناسب نہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ رہا تو ان کے لیے بھی کئی مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ سو میرا یہاں سے چلے جانا اب ضروری ہے انتہائی ضروری۔''

''مگر غیاث بھائی...... کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔'' غیاث بھائی حتمی انداز میں کہہ رہے تھے۔

''کیوں؟'' میرے لہجے میں ہلکا سا احتجاج محسوس کر کے وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بولے تھے۔

''اس لیے میرے بھائی...... کہ اگر تمہیں بتا دوں گا تو تم انہیں بتا دو گے اور میری اتنی تگ و دو کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ تم اطمینان رکھو میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گا۔ رابطہ رکھوں گا تم سے۔ اور اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔'' اسد خاموش ہو گیا۔

اس تمام عرصے میں ملک معظم خاموشی لیکن توجہ اور دلچسپی سے اس کی بات سنتے رہے تھے لیکن

ان کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات جو یقیناً پریشانی اور فکرمندی کے تھے۔ نہ جانے دیکھنے والوں کو ان میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ کیوں ہو رہا ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس ساری صورتحال سے پریشان نہ ہوں بلکہ پریشانی کی اداکاری کر رہے ہوں۔ سب ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے جس پر تمسخرانہ پن نمایاں لگ رہا تھا۔ ماں بھی سوالیہ نظروں سے ملک معظم کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''اسد! یار یہ تو بہت مشکل ہو گئی۔ اب ہم اسے کہاں ڈھونڈیں گے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ شہر ہی چھوڑ کر چلا گیا ہو؟''

''نہیں معظم بھائی..... وہ شہر تو نہیں چھوڑ سکتے اس لیے کہ اس گھر کے بغیر ان کا گزارہ نہیں۔ جلد یا بدیر وہ یہاں چکر ضرور لگائیں گے۔ وہ اپنی ماما یعنی آنٹی کی تصویر سے باتیں کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔''

اسد کی بات سن کر مسز جلال کی آنکھیں پھر برسنے کو بے تاب ہو گئیں۔ ملک معظم نے دیکھا کمرے میں موجود تمام افراد پریشان نظر آ رہے تھے۔ اُداس اُداس ان کے چہروں پر سے کسی نے امید کی لالی چھین کر مایوسی اور نامرادی کی پیلاہٹ مل دی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے سب کی طرف دیکھتے رہے پھر یکدم ہنسنے لگ گئے۔ تمام افراد کی حیران نظریں اُن پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ رکے رکے قدم اُٹھاتے ماں کے قریب چلے آئے اور نیچے ان کے گھٹنوں کے پاس دوزانو بیٹھ گئے۔ اس وقت بھی ان کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

''ماما..... میں جانتا ہوں غازی کہاں ہے؟'' الفاظ تھے یا امرت' آبِ حیات کی مانند زندگی بن کر سب کی رگوں میں دوڑ گئے۔

''کہاں.....؟ کہاں ہیں وہ.....؟'' شہسوار نے پوچھا۔

''بیٹا..... کہاں ہے غازی.....؟ جلدی بتاؤ ناں بیٹا دیکھو تمہاری ماں کتنی پریشان ہے اس کی خاطر۔'' اماں بے چین لہجے میں بولیں۔ وہ خاموش سے بیٹھے دیکھتے رہے۔

''ظومی..... بتا دو..... تم.....؟ تم کہیں مجھے ستا تو نہیں رہے؟ مجھ سے جھوٹ تو نہیں کہہ رہے؟'' مسز جلال بے قراری سے بولیں۔

''اوہو ماما مجھے آپ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''پھر..... پھر لے چلو ناں ہمیں۔''

''ابھی نہیں..... آپ سب گھر چلیں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ میں اسے سمجھا بجھا کر ایک دو دن میں لے آؤں گا۔ وہ خود چل کر آپ کے پاس آئے گا ماما''۔ ان کی بات سن کر جیسے مسز ملک کا کھویا ہوا یقین دوبارہ واپس لوٹنے لگا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو ناں ظومی.....؟ مجھے ستا تو نہیں رہے؟''

''ارے نہیں ماما..... میں وعدہ کرتا ہوں آپ سے کہ دو دن کے بعد وہ آپ کے پاس ہو گا۔''

انہوں نے کرنے کو وعدہ کر لیا تھا لیکن پریشان تھے اس لیے کہ انہیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید وہ غازی کو نہ ڈھونڈ پائیں تو پھر.....؟

''ماما دو دن بعد وہ آپ کے قریب ہو گا اور اگر میں اُسے نہ لا سکا تو تمام عمر اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔'' ان کے لہجے میں کھلا اعتماد اور خلوص پن سب کو ہی یقین دلا گیا۔ سب خوش ہو گئے تھے لیکن شہسوار کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ البتہ وہ انتہائی گہری نظروں سے ملک معظم کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''پھر ٹھیک ہے ناں آپ سب گھر چلیں..... یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا فضول ہے دو دن بعد وہ آپ کے پاس ہو گا۔ ہم سب کے درمیان۔'' انہوں نے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو ناں۔'' ماں نے دوبارہ تصدیق چاہی۔ ''دو دن میں میرے غازی کو لے آؤ گے۔'' کس قدر اضطراب تھا ان کے لہجے میں' کتنی بے قراری تھی ان کی آنکھوں میں۔ وہ اُن سے نظریں چرا گئے۔

''ماما میں نے وعدہ کیا ہے۔'' وہ مخاطب تو مسز جلال کے ساتھ تھے لیکن انہیں شہسوار کی نگاہیں اپنے وجود کو چھیدتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ذات کی پاتال میں اُتر جانے والی نگاہیں جھوٹ اور سچ کو ٹٹولنے والی نگاہیں۔ وہ چھوٹا تھا لیکن آج وہ اس کی سنجیدہ آنکھوں کے سامنے گڑبڑا گئے تھے۔ مسز جلال چارپائی سے اُٹھیں دوپٹہ اچھی طرح پھیلا کر اوڑھا اور ماں کے ساتھ باہر جانے لگیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ملک معظم اور شہسوار تھے۔

''بھائی.....'' شہسوار نے ملک معظم کو پکارا تو ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔ شاید شہسوار کے مخاطب کرنے کی وجہ جاننا چاہتے تھے۔

''بھائی..... سچ سچ بتائیں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ آپ نے ماما سے جھوٹ کیوں بولا؟''

''نہیں میں نے ماما سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میرے علم میں ہے کہ غازی کہاں ہے۔'' ملک معظم اُس سے نگاہیں چرا کر بولے۔

''دیکھئے بھائی..... ماں کے جذبات کچھ اور ہوتے ہیں۔ وہ عورت ہیں اور ماں بھی۔ آپ ان کو تو جھوٹی تسلیاں اور دلاسے دے کر بہلا سکتے ہیں لیکن مجھے نہیں۔'' شہسوار کا انداز جانے کیوں انہیں کچھ تلخ سا لگا۔ وہ کچھ دیر عجیب سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''تم صحیح کہتے ہو۔ سچی ہے تمہاری بات۔ میں نے ماما کو بہلایا ہے ایک جھوٹے وعدے سے۔

ایک آس دلائی ہے انہیں کہ ان کا بیٹا ان سے دور نہیں۔ شاری یہی بہلاوہ یہی آس شاید ان کی زندگی بچا لے۔'' ان کے لہجے میں تھکن در آئی۔

''بھائی آئی ایم سوری...... لیکن یہ بھی تو سوچیں ابھی تو یہ بہلاوہ ان کی زندگی بچا گیا۔ دو دن بعد کیا ہوگا؟ کہاں سے لائیں گے غازی کو؟ کس طرح ڈھونڈیں گے اسے؟'' شہسوار کی بات ٹھیک تھی لیکن وہ بھی غلط نہیں تھے۔

''ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کدھر چلا گیا۔ اس وقت کہاں ہے؟ اسے کس طرح ڈھونڈ کر لاؤں گا؟ کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ میں نے تو صورتِ حال کی مناسبت سے جو بہتر سمجھا وہ کہہ دیا۔'' ملک معظم کی آنکھوں میں جیسے دھندسی چھانے لگی تھی۔

''بھائی ابھی تو آپ نے جو مناسب سمجھا کہہ دیا لیکن دو دن بعد جب ماما کی آس دوبارہ ٹوٹے گی۔ دوبارہ سے انہیں ایسا جذباتی دھچکا لگا تو پھر شاید کوئی بہلاوہ بھی ان کے کسی کام نہ آ سکے۔'' شہسوار کے اس کڑوے سچ نے ملک معظم کے ذہن میں کلبلاتے اندیشوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ ان کی آنکھوں کی پتلیوں پر پھیلی دھند پانی بن کر بہہ نکلی۔ شہسوار کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ پھر جانے یکدم کیا ہوا تھا۔ ملک معظم نے آگے بڑھ کر یوں تڑپ کر شہسوار کو گلے سے لگایا تھا جیسے وہ بیٹے میں ماں سے بچھڑا ہوا کوئی معصوم بچہ ہو جو گھر کا راستہ بھی نہ جانتا ہو لیکن اس وقت دونوں کے دل جس دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب اُبھر رہے تھے۔ وہ دکھ اُن کی سوچ سے کہیں بڑھ کر تھا۔

''بھائی...... بھائی ہمارے پاس ماما کے سوا ہے ہی کیا؟ اگر یہ بھی چھن گئیں تو کیا بچے گا ہمارے پاس؟'' شہسوار آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کرتا ہوا ملک معظم سے الگ ہوا۔

''شاری...... ماما کو زندہ رہنا ہے ہماری خاطر...... غازی کی خاطر۔ پھر غازی کو اس کا حق بھی تو دلانا ہے۔ آج تک وہ جن حالات میں زندگی گزارتا رہا۔ اس میں ہمارا قصور نہ ہونے کے باوجود ایک احساسِ جرم ستاتا ہے کہ ہم نرم مخملیں بستروں پر سوتے رہے' مرغن کھانے کھاتے رہے اور وہ فاقوں میں مست سخت زمین پر سوتا رہا۔ شاید سویا بھی نہ ہو' اپنے نصیبوں پر شکوہ کناں رہتا ہو۔ ہمیں اس محرومِ محبت کو ماں سے ملانا ہے۔ غازی کے مجرموں کو سزا دلانی ہے شاری۔'' ملک معظم کے لہجے میں ڈٹ جانے والی سختی تھی۔

''ہاں بھائی...... آپ صحیح کہتے ہیں......'' شہسوار نے تائید کی۔

''بہر حال دیکھتے ہیں کہ کاتبِ تقدیر نے کیا سوچا ہے ہماری خاطر......؟ کیا غازی کی محرومیاں اور ہماری ماں کے آنسو اتنے ہی بے وقعت ہو سکتے ہیں کہ اوپر والا ان کی طرف نگاہ تک نہ ڈالے۔

قضا اتنی ظالم نہیں ہو سکتی کہ ماں اور بیٹے کی طویل جدائی کے بعد ملنے سے پہلے ہی ان کے سامنے جا کھڑی ہو۔ کسی ایک پر اپنا داؤ آزمائے۔ ماما کو کچھ نہیں ہوگا شاری۔ اب تو...... اب تو ان کی دعاؤں کے مقبول ہونے کا وقت ہے۔'' ملک معظم نے کہا۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور بہت کچھ ٹھیک کرنا پڑے گا شاری۔ جن لوگوں کی وجہ سے ہمارا گھر اُجڑا' ہمارے باپ کی زندگی تباہ ہوئی۔ ماں کے چودہ سال جس اذیت و کرب میں گزرے' جن کی وجہ سے بھائی ماں کی ممتا اور گھر کے سائبان سے محروم ہوا۔ ان کا بھی تو حساب چکتا کرنا ہے۔ جن لوگوں کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ میں اُن تک پہنچ چکا ہوں اور تم بھی یقیناً انہیں اچھی طرح جانتے ہو۔'' ملک معظم کی بات سن کر شہسوار چونک پڑا۔

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں بھائی...... ؟ کون ہے وہ؟''

''بتا دوں گا شاری۔ بتا دوں گا کیونکہ اب ہمیں ان کی زندگیوں میں زہر بھرنا ہے۔ اپنی تلخیوں اور اذیتوں کا مداوا کرنا ہے' قرض چکانا ہے مگر ابھی نہیں! مناسب وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ فی الحال یہ وقت یہ سب سوچنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔'' ملک معظم نے شہسوار کا کندھا تھپتھپایا۔ ''آؤ چلیں۔'' پھر وہ دونوں دروازے سے باہر نکل گئے۔

☆..........☆..........☆

حویلی کے مردان خانے میں اس وقت چوہدری الیاس اور حماد کے علاوہ سرفراز علی اور بلیک مین بھی موجود تھے۔ چوہدری الیاس کے انداز سے بے چینی اور اضطراب کے تاثرات مترشح تھے۔ وہ بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا اور سرفراز علی کبھی چوہدری الیاس کی طرف دیکھ رہا تھا تو کبھی لاپرواہی سے سگریٹ پھونکتے بلیک مین کو۔

''چوہدری صاحب! سٹریس لینا آپ کی صحت کے لیے مفید نہیں۔ سکون سے بیٹھ جائیں۔'' سرفراز علی کی آواز سے چوہدری ایک لمحے کو ٹھٹک کر رُکا۔ اُس نے ایک نظر سرفراز علی کی طرف دیکھا۔ پھر ہر چیز سے بے نیاز بیٹھے بلیک مین کو اور ہونٹ کاٹتے ہوئے دوبارہ ٹہلنے لگا۔ اس کی ذہنی حالت دگرگوں تھی۔ نس نس میں گویا جہنم کی سموم آگ دہک رہی تھی۔ کافی دیر یوں ہی گزر گئی۔ پھر حماد گویا ہوا۔

''بابا......! اگر ملک معظم نے آپ کے ہاتھ کاٹنے کے لیے بلیک مین کو پچاس کی آفر کی ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ بلیک مین کو ساٹھ لاکھ دیں اور ملک معظم کی گردن اُتروا دیں۔ آپ کے لیے یہ رقم کون سا بڑا مسئلہ ہے۔'' چوہدری الیاس رُک کر چند لمحے خاموشی سے حماد کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر دھیمے قدموں سے چلتا ہوا بلیک مین کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''حماد بالکل ٹھیک کہتا ہے چوہدری صاحب! بلیک مین عرصے سے آپ کے لیے کام کر رہا

ہے۔آپ کا آدمی ہے۔اب بھی اس نے آ کر ساری بات آپ کو بتا دی ہے۔آپ ملک کی گردن مروا دیں۔'' سرفراز علی کے لہجے میں لاپرواہی اور بے فکری تھی مگر چوہدری الیاس خاموش رہا۔روپیہ اس کے لیے مسئلہ نہ تھا۔مسئلہ وہ شرط تھی جو اس کام کی کرنے کے لیے بلیک مین نے رکھی تھی۔چوہدری اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

''روپے کا مسئلہ نہیں ہے سرفراز علی...... ملک معظم کی موت اور اس کی مل کی تباہی کے لیے میں بلیک مین کو منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں مگر لگتا ہے کہ بلیک مین کی نیت صاف نہیں ہے۔'' گئی چوہدری الیاس کا انداز تھی۔

''میری نیت صاف اور ٹھوس ہے چوہدری صاحب! آپ میری شرط پر غور کر لیں۔میرا خیال ہے کہ میری یہ شرط کوئی ایسی نامعقول بھی نہیں ہے۔'' بلیک مین نے ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری شرط بالکل فضول ہے۔تمہارا جو اصل مسئلہ ہے وہ بیان کرو۔اس طرح کی شرطیں درمیان میں رکھ کر حیل و حجت کرنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔سیدھی صاف بات کرو یہ کام کر سکتے ہو یا نہیں؟'' چوہدری کی بات پر بلیک مین نے ایک جھٹکے سے چوہدری کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی پھوٹ پڑیں۔

''چوہدری صاحب! بلیک مین کی کتاب زیست میں ناممکن نام کا لفظ نہیں ہے۔یہ بات اپنے دماغ میں بٹھا لیں۔مجھے آنکھیں بند کر کے شکار کرنے کی عادت نہیں ہے اور آپ اتنا بڑا کام میری آنکھوں پر لاعلمی کی سیاہ پٹی باندھ کر کروانا چاہتے ہیں۔یہ کسی طور پر ممکن ہی نہیں۔'' بلیک مین کے لہجے میں درندے کی سی غراہٹ تھی۔

''اور اگر میں تمہاری شرط نہ مانوں۔تمہیں کچھ نہ بتاؤں تو کیا تم یہ کام نہیں کرو گے؟'' چوہدری الیاس نے بلیک مین کو گھور کر چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں......ایسا ہی ہے۔پھر میں ملک معظم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔'' بلیک مین نے کہا تو چوہدری الیاس ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''تو ٹھیک ہے......تم کچھ نہ کرو۔'' چوہدری کے بولنے سے پہلے ہی سرفراز علی بول پڑا۔''ہم یہ کام خود کروا لیں گے۔'' پھر وہ چوہدری الیاس سے مخاطب ہوا۔''چوہدری صاحب! آپ بے فکر رہیں۔میرے پاس ایسے آدمی ہیں جو ملک معظم کے پورے خاندان کو نگل جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔'' چوہدری الیاس نے اطمینان سے گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے بلیک مین! آج سے ہمارا تمہارا واسطہ ختم۔ہماری طرف سے تم آزاد ہو۔جہاں چاہے جا سکتے ہو۔'' چوہدری نے پرسکون لہجے میں کہا تو بلیک مین کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ

طلوع ہو آئی۔اُس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور دوسرا سگریٹ ہونٹوں میں دبا لیا۔سگریٹ سلگایا' ایک گہرا کش لیا اور صوفے سے پشت ٹکا کر پورے اطمینان سے بیٹھ گیا۔سرفراز علی' چوہدری الیاس اور حماد اسے گہری سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ اسے اب اُٹھ کر چلے جانا چاہیے تھا جبکہ وہ صوفے پر اس طرح براجمان ہو گیا تھا۔ جیسے پوری زندگی یہیں گزارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

''چوہدری صاحب!'' بلیک مین کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اور اُس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔''میرے اور آپ کے تعلق کو پانچ سال گزر چکے ہیں۔ان پانچ سالوں میں آپ کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ میں اصولوں کے معاملے میں کس ذہن کا مالک ہوں اور اپنا کام کسی دیانتداری سے کرنے کا عادی ہوں۔میرا روزی رزق یہی ہے اور آتے ہوئے رزق کو ٹھوکر مارنے والے ناشکرے ہوتے ہیں۔آپ مجھ سے واسطہ ختم کر کے میرا روزی رزق بند کرنا چاہتے ہیں تو یقینی بات ہے کہ مجھے ملک صاحب سے واسطہ استوار کرنا پڑے گا اور ملک صاحب نے مجھے پچاس......لاکھ کی آفر کی ہے۔'' آخر میں بلیک مین کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔یکبارگی چوہدری الیاس کا چہرہ اس قدر سرخ ہو گیا جیسے اس کے پورے وجود کا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا ہو۔سرفراز علی کی بھی تیوریاں چڑھ گئیں۔حماد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اس کی پیشانی پر بھی بل پڑ گئے۔وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... ؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ ہمارے گھر میں بیٹھ کر ہمی کو دھمکی دے رہے ہو!''

''دھمکیاں بزدل دیا کرتے ہیں مسٹر حماد! میں تو آپ کی معلومات میں اضافہ کر رہا ہوں۔'' بلیک مین ہنوز پرسکون انداز میں گویا ہوا۔سرفراز علی نے اس کی جانب غصے سے دیکھا اور کرخت لہجے میں بولا۔

''برخوردار...... تم بہت زیادہ بہادر بننے کا تاثر دے رہے ہو لیکن احمق ہو کہ شیر کی کچھار میں بیٹھ کر اُسے ہی نوالہ بنانے کا سوچ رہے ہو۔ چند لمحوں میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں سے تمہاری آواز تک باہر نہ جا پائے گی۔''

''آپ کی سانسوں کی ڈور اتنی نازک ہے سرفراز علی! کہ اگر میں چٹکی بجاؤں تو لاتعداد ٹکڑوں میں بکھر جائے گی۔'' بلیک مین مسکراتے ہوئے سرفراز علی سے یوں گویا ہوا جیسے کسی بچے کو سمجھا رہا ہو۔اس کی بات سن کر سرفراز علی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

''ٹھیک ہے تم میری سانسوں کی ڈور توڑ دو۔میں بھی دیکھتا ہوں تمہاری آواز یہاں سے باہر کیسے جاتی ہے۔'' اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔سرفراز علی اور حماد دونوں ہی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔حماد نے ماحول کی کشیدگی کو محسوس کرتے ہوئے آواز دی۔

''مظہر خان' گل خان......'' باہر کھڑے دونوں گن مین پلک جھپکنے میں کمرے کے اندر آ گئے۔ ان کے چہرے پر ہڑبڑاہٹ کے تاثرات تھے۔ شاید انہوں نے حماد کی آواز سے کسی غیر معمولی صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ سرفراز علی بلیک مین پر پستول تان کر کھڑا تھا۔ حماد کی اضطراری نگاہیں کبھی سرفراز علی اور کبھی بلیک مین کی سمت اُٹھ رہی تھیں جبکہ چوہدری اس عرصے میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ماتھے پر سوچ کی شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔

بلیک مین کے ہونٹوں پر اسی طرح مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس ساری صورتحال سے محظوظ ہو رہا ہو۔ چوہدری نے اسے مخاطب کیا۔

''بلیک مین...... جب تک تم نے ہم سے رکھی۔ ہم نے تمہیں بہت اونچی پرواز دی لیکن لگتا ہے اب وقت آ گیا ہے کہ تمہارے پر قلم کر دیئے جائیں۔ بلکہ پر ہی نہیں تمہارا سر بھی قلم کر دیا جائے۔ بہت اونچا اُڑ لیے تم۔'' چوہدری کے لہجے میں سفاکی در آئی۔

بلیک مین نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ فضا میں دھوئیں کا چھلا چھوڑتے ہوئے اُس نے دزدیدہ نظروں سے چوہدری الیاس کی سمت دیکھا اور گویا ہوا۔

''چوہدری صاحب! زندگی اور موت کا تو کسی انسان کو پتہ نہیں ہوتا لیکن ہم جیسے جو لوگ ہوتے ہیں ناں' ان کی تو زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ کوئی خبر نہیں ہوتی کہ کب اگلا سانس بغاوت کر دے۔ جانے کس چوراہے پر زندگی ساتھ چھوڑ دے اور کفن دفن کی زحمت اُٹھانی پڑے۔'' اتنا کہہ کر اُس نے پینٹ کے دونوں پائنچے اُٹھا لیے۔ اس کی دونوں ٹانگوں کے ساتھ دو بم بندھے ہوئے تھے جن کی لمبائی چھ انچ اور چوڑائی ڈھائی انچ کے قریب ہو گی۔ کمرے میں موجود افراد بُری طرح چونک پڑے۔ چوہدری الیاس' حماد اور سرفراز علی کے چہروں کی رنگت متغیر ہو گئی۔ بلیک مین کی زیرک نگاہوں سے ان کے چہرے کے بدلتے رنگ نہ چھپ سکے تھے۔ اُس نے اپنی جیکٹ کی زپ کو ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''چوہدری صاحب! یہ دیکھ رہے ہیں یہ کوئی عام زپ نہیں ہے۔ صرف ایک انچ حرکت دینے کی ضرورت ہے پھر کفن دفن کی ضرورت آپ کی لاش کو بھی نہیں رہے گی۔''

اس کی بات سن کر ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ چوہدری اس اچانک پیش آنے والی صورتِ حال پر گھبرا گیا تھا۔ اُس نے تیزی سے آگے بڑھ کر سرفراز کا پسٹل والا ہاتھ تھام لیا۔

''سرفراز رکھو...... رکھو اسے جیب میں ڈالو......'' چوہدری نے سرفراز کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ ''چلو...... چلو تم باہر دفع ہو جاؤ۔'' اس کا اشارہ گن مینوں کی طرف تھا۔ وہ دونوں بھی ہڑبڑا کر باہر نکل گئے۔

''بیٹھو...... بیٹھ جاؤ تم......'' اُس نے سرفراز علی کو دھکا دے کر صوفے پر زبردستی بٹھا دیا۔ پھر

اُس نے بلیک مین کی طرف دیکھ کر ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ بکھیری۔

''یار بلیک مین...... تمہارا پتہ بھی بڑا گرم ہے۔ حوصلے سے ذرا...... ایسے انتہا تک نہیں جایا کرتے۔'' چوہدری کے انداز سے گھبراہٹ مترشح تھی لیکن کسی حد تک اُس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

بلیک مین نے ایک نظر چوہدری کی سمت دیکھا۔ پھر رُخ بدل کر سرفراز علی کی جانب متوجہ ہوا۔

''سرفراز صاحب! آپ کا ایک دوست تھا راحت آفندی' جو آج سے سولہ سال تین ماہ پہلے ملک ٹیکسٹائل مل میں لیگل ایڈوائزر تھا۔'' معنی خیز سے انداز میں اتنا کہہ کر اُس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ راحت آفندی کا نام بلیک مین کے منہ سے سن کر سرفراز علی اور چوہدری الیاس دونوں ہی بُری طرح چونک پڑے۔

''ت...... تم...... تم تک...... کیسے جانتے ہو؟'' سرفراز علی ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''تم تو اُس وقت بچے ہو گے۔ پھر تمہارا کیا تعلق ہے اس بات سے؟'' بلیک مین نے اس کا سوال جیسے سنا ہی نہیں۔ اس کی نگاہیں دھوئیں پر مرکوز تھیں جو اُس نے ابھی ابھی کش لے کر فضا میں چھوڑا تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

''ملک جلال حسین اس مل کے مالک تھے اور آپ کو وہ اپنا سب سے زیادہ مخلص اور بہترین دوست سمجھتے تھے۔ وہ کیونکہ ان پڑھ تھے اس لیے مل کے جی۔ ایم کی سیٹ پر انہوں نے آپ کو بٹھا دیا تھا۔ ان کے اعتبار اور اعتماد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے دوست راحت آفندی کے ساتھ مل کر آپ نے مل میں لاکھوں کروڑوں کے گھپلے کیے اور مل کا دیوالیہ نکال دیا۔ ملک جلال حسین کی آنکھوں پر اپنے خلوص اور بے لوث دوستی کی پُرفریب پٹی بندھے رہنے کی خاطر دھیرے دھیرے انہیں نشے کا عادی بنا دیا۔''

وہ بول رہا تھا اور چوہدری الیاس اور سرفراز علی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن وہ ان کی اس کیفیت سے بے نیاز بولے گیا۔

''مل کے دیوالیہ نکلنے کے بعد آپ نے تمام پیسہ سمیٹا اور لندن فرار ہو گئے اور مل کا بچا کھچا ڈھانچہ حسین بخش اور راحت آفندی کے حوالے کر دیا۔ اب آپ نے ایک طویل عرصے بعد دوبارہ یہاں سیٹل ہونے کا سوچا تو ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ ملک ٹیکسٹائل مل دوبارہ سے آپ کے کنٹرول میں آ جائے لیکن جب آپ چوہدری الیاس کے ساتھ کاٹن کے سلسلے میں وہاں گئے تو آپ پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ مل ملک جلال حسین کے بڑے بیٹے ملک معظم کی تحویل میں ہے۔ آپ کو بہت بڑا دھچکا لگا۔''

وہ بول رہا تھا اور اس کا ایک ایک لفظ جیسے ان کے دماغوں پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہا تھا۔ ان کے چہروں کی رنگت متغیر تھی اور آنکھیں حیرت سے پھٹی پڑی تھیں۔ اس لیے کہ یہ باتیں جو بلیک مین بتا رہا تھا۔ اندر کی باتیں تھیں ایسی باتیں جو ملک جلال کے علم میں بھی نہیں تھیں۔ پھر بلیک مین کا اتنی

تفصیل اور اس قدر وثوق سے یہ سب کہنا ان کے لیے اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ سرفراز علی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''بلیک مین...... تم...... یہ سب...... کک...... کیسے جانتے ہو؟'' سرفراز علی ہکلایا۔ مگر بلیک مین سنی ان سنی کرتے ہوئے اسی انداز میں بولتا رہا۔

''سرفراز صاحب' لوگوں کی محض قیاس آرائیاں تھیں کہ مل کے دیوالیہ ہونے اور ملک جلال حسین کے گھرانے کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا۔ اس سب کے کرنے دھرنے کے ذمہ دار آپ ہیں مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ آپ تو محض مہرہ تھے۔ آپ کے پیچھے دماغ کسی اور کا تھا۔'' بلیک مین نے ڈرامائی انداز میں رُخ بدل کر چوہدری کی جانب دیکھا۔ سرفراز علی اور الیاس دونوں کے چہرے فق ہو گئے۔ چوہدری بلیک مین کو اپنی جانب دیکھتا پا کر گڑبڑا سا گیا۔

''دماغ تو چوہدری کا تھا......!'' بلیک مین نے اپنی اُدھوری بات مکمل کی۔

''کیوں چوہدری صاحب ٹھیک کہا ناں میں نے؟'' وہ شرارتی نظروں سے چوہدری کو دیکھ رہا تھا یقیناً اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ سرفراز علی اور چوہدری الیاس دونوں ہی کی حالت متغیر تھی اور حماد سرفراز علی اور چوہدری الیاس کی صورت دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ کمرے کا ماحول یکدم یوں ہو گیا تھا جیسے کسی مرگِ ناگہانی نے ادھر کا رُخ کر لیا ہو۔

''کیوں چوہدری صاحب کیا سوچنے لگے؟'' بلیک مین نے سوال کیا تو چوہدری یوں چونک پڑا جیسے گہری نیند سے اُسے کسی نے جھنجھوڑ ڈالا ہو۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اس کی زبان گنگ ہو چکی ہے۔ وہ حیرت اور اچنبھے کی انتہائی صورتِ حال سے گزر رہا تھا۔

''اتنا تو میں جانتا ہوں کہ مل کیسے دیوالیہ ہوئی۔ جلال خاندان کس طرح برباد ہوا لیکن اس سب کے پیچھے وجہ کیا تھی؟ یہ آپ بتائیں گے؟'' بلیک مین نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''بکواس ہے یہ سب...... جھوٹ ہے...... کیا ہانک رہے ہو تم......؟'' چوہدری نے اپنے اعصاب پر قدرے قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نہیں مانیں گے تو پھر ٹھیک ہے۔ میرے پاس پروف ہیں مل کے گھپلوں کے۔ میں وہ سب پولیس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا وہ خود کھنگال لیں گے اور ہاں آپ کی معلومات میں ایک اور اضافہ کر دوں...... راحت آفندی آج کل میرے قبضے میں ہے۔'' اُس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور وہ تمام کچا چٹھا پولیس اور ملک معظم کے سامنے پیش کرنے کو بے چین ہے......!!'' اس کی باتیں تھیں یا چنگاریاں جنہوں نے سرفراز علی اور چوہدری الیاس کی سوچوں کو جھلسا کر رکھ دیا۔ وہ دونوں سکتے کے عالم میں یک ٹک دیکھ رہے تھے۔ گویا ان کے سامنے بلیک مین نہیں ملک الموت بیٹھا ہے۔ بلیک مین نے انتہائی پُرسکون انداز میں سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا اور سلگاتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔

''چوہدری صاحب فی الحال تو میں جا رہا ہوں۔ آپ کو چوبیس گھنٹے دیتا ہوں۔ مجھے اندر کی بات بتا دیجیے گا کہ ملک فیملی کے ساتھ یہ سب کس بات کا انتقام ہے؟'' بلیک مین اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''او کے چوہدری صاحب بائے......'' اُس نے قدم بیرونی جانب بڑھا دیے۔ سرفراز علی اور چوہدری الیاس مبہوت بیٹھے جاتے بلیک مین کو دیکھ رہے تھے۔ وہ مردان خانے سے باہر نکل گیا۔ وہاں موجود کسی شخص کی توجہ بھی ٹیبل پر پڑے سگریٹ کیس کی طرف نہیں گئی جو بلیک مین جان بوجھ کر وہیں چھوڑ گیا تھا۔

☆...... ☆........ ☆

بلیک کرولا اسٹارٹ کر کے حویلی کا پھاٹک کراس کرتے ہوئے بلیک مین نے پلٹ کر مردان خانے کے کھلے ہوئے دروازے کی سمت ایک نظر دیکھا اور پھر گاڑی حویلی سے باہر لا کر کچھ فاصلے پر روک دی۔ گاڑی کی ٹیپ کا پلے بٹن پش کر کے اس کے ساتھ منسلک ہیڈ فون کانوں پر لگا لیا۔ اس کے ہونٹوں پہ ایک شاطرانہ مسکراہٹ رقصاں تھی!

''چوہدری صاحب! یہ تو ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے!'' سرفراز علی کی آواز میں خوف اور پریشانی نمایاں تھی۔

''سیدھا تھن اپنی جگہ سرفراز! میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ آخر یہ اس مسئلے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے...... ؟ کیوں جاننا چاہتا ہے کہ میری ملک جلال سے کیا دشمنی تھی؟'' چوہدری اُلجھن آمیز لہجے میں بولا۔

''تو کیا آپ اسے نہیں بتائیں گے؟'' سرفراز نے استفسار کیا۔

''کوئی ہرج نہیں بتا دوں گا' مرنے سے پہلے اس کی آخری خواہش سمجھ کر ہی بتا دوں گا۔'' چوہدری کے لہجے میں سفاکی در آئی۔ یقیناً اس کے ذہن نے کوئی گھناؤنا فیصلہ کر لیا تھا۔ ''ان دونوں کی موت ضروری ہو گئی ہے سرفراز......! آج کیم ہے۔ مجھے ان کی موت چاہیے صرف دو دن کے اندر اندر میں ان کی لاشیں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس کے انداز میں بے چینی تھی۔

''ہو جائے گا چوہدری صاحب! کیوں تردّد کرتے ہیں جیسا کہیں گے اسی طرح ہو جائے گا۔'' سرفراز علی چوہدری الیاس کی اندرونی کیفیت سمجھ کر اسے اطمینان دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خیال رہے تین سے چار تاریخ نہیں ہونی چاہیے ورنہ ہمارے لیے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔''

بلیک مین نے ہیڈ فون کانوں سے اُتار کر ڈیش بورڈ پر رکھا۔ اس کے چہرے پر ایک گہری

زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اُس نے اگنیشن میں چابی گھمائی گاڑی سٹارٹ کی اور اگلے ہی پل ایکسیلیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔

☆..........☆..........☆

ملک لاج میں یکم کی شام کے دھندلکے رونق اور گہماگہمی لے کر آئے تھے۔ اسد کی امی یعنی آمنہ خالہ شاہین کو باقاعدہ اپنی بیٹی بنانے کے لیے آ گئیں۔ ماہ نور اور اماں اس وقت مسز جلال کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ پاس ہی ملک معظم بھی موجود تھے۔ شاہین' راحین' ماتین اور گڈو وغیرہ انیکسی میں تھے۔ آمنہ خالہ کو کوٹھی میں داخل ہوتے ہی خالہ زیتون باہر جاتی دکھائی دیں۔

''ارے بہن! کیا حال ہے تمہارا؟'' خالہ زیتون نے آگے بڑھ کر رسمی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا حالانکہ ان کا آمنہ خالہ سے پہلی بار سامنا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہوں! ماہ نور بیٹا اور اس کی اماں گھر پر ہیں کہ نہیں؟'' آمنہ خالہ نے پوچھا۔

''وہ تو بڑی بی بی کے پاس بیٹھی ہیں۔'' خالہ زیتون بتا کر آگے بڑھ گئیں۔ آمنہ خالہ نے اسد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا گویا پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ کہاں جائیں مسز جلال کی طرف یا پھر انیکسی میں جا کر انہیں وہاں بلوا لیا جائے۔ اسد ماں کی سوالیہ نظروں کا مفہوم سمجھ گیا۔

''امی! میرا خیال ہے رابعہ آنٹی کی طرف چلیں۔ اچھا ہے اُن سے بھی بات ہو جائے گی۔ میں اتنی دیر شاری بھائی کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھ جاؤں گا۔'' اسد نے یہ کہہ کر قدم آگے بڑھا دیئے۔ مسز ملک کے کمرے میں داخل ہوئے تو سب نے ہی بہت خوشدلی سے استقبال کیا۔ اسد تو دعا و پیار لے کر شہسوار کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جبکہ خالہ آمنہ وہیں بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر رسمی باتوں کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گئیں۔

''زرینہ! میں آج ایک خاص مقصد لے کر آئی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' اماں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ اتنا تو وہ بھی جان گئی تھیں کہ خالہ آمنہ بے مقصد نہیں آئی تھیں۔

''میں رسم کرنا چاہتی ہوں۔ دیکھو زرینہ ایک ہی ایک بچہ ہے میرا۔ میں اس کی خوشیاں جی بھر کے منانا چاہتی ہوں۔ شادی تمہاری مرضی سے ہو گی جب تم نے کہا لیکن منگنی میری مرضی سے' سنا!'' وہ بڑے مان سے کہہ رہی تھیں اور اماں کچھ نروس سی تھیں۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔

''ارے آمنہ! کیا غیروں سی باتیں کر رہی ہو بھلا رسم کی کیا ضرورت ہے جب زبان سے کہہ دیا تو تمہاری ہو گئی۔''

''نہیں زرینہ دنیا دکھاوا بھی تو کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات ہمارے تمہارے بیچ ہے۔ چار چھ لوگوں

کو علم ہو جائے تو اچھا ہے۔''

''پھر کب......؟''

''پرسوں رات۔ آج انگریزی مہینے کی یکم ہے اور چاند کی بارہ' ٹھیک چاند کی چودہ کو یعنی تین تاریخ کو۔''

''ارے...... ارے یہ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات ہوئی ناں۔ رابی تم ہی کچھ بولو۔ کم سے کم ایک دو مہینے تو ہوں بیچ میں کچھ تیاری کرنے کے لیے۔'' اماں کنفیوز سی بیٹھی تھیں۔ مسز ملک مسکرا کر کبھی اماں کی طرف تو کبھی خالہ آمنہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے کو ایک الوہی مسکراہٹ نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

''زری! اللہ کا شکر ہے جس نے خوشی کا یہ دن دیکھنا نصیب کیا۔ کوئی حیل و حجت نہ کرو۔ بھلا پریشانی کی کیا بات ہے؟ آمنہ کیا کوئی غیر ہے۔ آپس کی بات ہے۔ پھر ان تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟'' مسز ملک نے گویا خالہ آمنہ کی خواہش پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

''لیکن رابی...... کچھ تو......'' اماں متذبذب سی دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ ماہ نور اور ملک معظم اس تمام عرصے میں خاموش تماشائی بنے بزرگ خواتین کو دیکھ اور سن رہے تھے۔ اماں کو پریشان اور پُرتردد دیکھ کر ملک معظم بول پڑے۔

''خالہ جان! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ بے فکر ہو کر تاریخ دے دیں۔ شاہین میری بھی تو بہن ہے۔ اس کی منگنی کا سارا اہتمام آپ کے اس بیٹے کے ذمے رہا۔'' انہوں نے کالر اکڑا کر خوشدلی سے کہا۔ ماہ نور کی نظریں بے خیالی میں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن ذہن کے کسی نہاں گوشے میں خیالات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ ایک لمحے کو ماہ نور کو اپنی سوچوں اور خیالات پر شرم سی محسوس ہوئی۔ اس کے چہرے پر پھیلتا گلال ملک معظم کی نظروں کو اُفق کی سرخی کی یاد دلا گیا۔

''بس تو پھر اب کوئی آنا کانی نہیں۔ میں جانوں میرا کام جانے۔ پرسوں تین تاریخ کو ٹھیک رات آٹھ بجے منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے آ جاؤں گی اور زرینہ تم سن لو' تکلفات میں پڑی تو اچھا نہیں ہو گا۔'' خالہ آمنہ بہت اپنائیت سے کہہ رہی تھیں۔ ان کی بات ختم ہوتے ہوتے شہسوار اور اسد بھی وہیں آ گئے تھے۔

''چلو بھئی نوشہ میاں! تیاری کرو منگنی کی۔'' ملک معظم نے شوخ سے لہجے میں اسد کو چھیڑا۔ اُس نے جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

''نور بیٹا...... چائے پانی کا کوئی خیال نہیں۔'' مسز جلال نے ماہ نور کو یاد دلایا کہ خوشی کا موقع

ہے اس کی سیلیبریشن ہونی چاہیے۔ ماہ نور اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

''شہسوار سارا انتظام اب ہم نے کرنا ہے۔ شاہین ہماری بہن ہے اُسے یہ کمی محسوس نہیں ہونی چاہیے کہ اس کا کوئی بھائی نہیں یا اس کے والد حیات نہیں سنا۔'' ملک معظم سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے۔

''آمنہ خالہ! شاہین ہماری بہن اب اس گھر میں آپ کی امانت ہے۔ آپ پرسوں آ کر اُسے انگوٹھی پہنا دیجیے گا۔''

''زری..... کلثوم کو بلاؤ گی۔'' مسز جلال نے پوچھا۔

''ہاں..... اُس محلے میں سے چند خواتین کو بلانا ہے۔'' اماں نے کہا۔

''شاری! تم خالہ جان سے اُن خواتین کے ایڈریس وغیرہ پوچھ لینا اور انہیں پرسوں کا دعوت نامہ دے آنا۔'' ملک معظم نے شہسوار سے کہا۔

سب ہی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ماہ نور کی آمد نے چند سیکنڈ کے لیے کمرے کے ماحول میں ہلچل سی مچائی۔ باتوں کے ساتھ ساتھ سب نے چائے اور لوازمات سے انصاف کیا۔ حقیقتاً آج اماں کو لگا تھا جیسے دکھوں کی سیاہ رات کے پردے پر چاند کا نور پھیل گیا ہو۔ کچھ روشنی ہوئی تھی۔ ایک سکون تھا جو ان کے چہار اطراف پھیل گیا تھا۔ انہوں نے ایک نظر اپنے اردگرد خوشدلی سے باتیں کرتے افراد پر ڈالی اور سکون و طمانیت کی ایک لہر سی دل میں اُترتی محسوس کی۔ دل سے ایک دعا اُٹھی اللہ! میری نور کی پریشانیوں کا خاتمہ کر دے۔ اس کے نصیب میں ایسا بر لکھنا کہ تمام عمر اسے بھولے سے بھی گزرے دکھوں کی یاد نہ آئے۔ ہنستی ہوئی ماہ نور آج بھی ان کے لیے دعا بن گئی تھی۔ وہ بیٹا تھی اور اُس نے بیٹوں کی طرح ہر فرض نبھایا تھا۔ باقی تمام فرض تو اُس نے نبھائے تھے۔ اس کا فرض اماں کے کندھوں پر قرض کی مانند تھا۔ ماہ نور ابو جی کی سب سے زیادہ لاڈلی دُلاری بیٹی تھی۔ اس لیے اماں اس کی زندگی کے لیے بہترین فیصلہ کر کے ان کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتی تھیں لیکن شاید ابھی اس کا نصیب فرائض کی سرد برفیلی تہوں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ابھی دیر تھی۔

☆......☆......☆

رات کی نبض مدہم پڑتی جا رہی تھی اور ملک معظم کے ذہن میں سوچوں نے بھنور ڈال رکھے تھے۔ رات تقریباً گیارہ بجے اسد اور اس کی امی واپس گئے تھے۔ شاہین کی منگنی کی تاریخ طے پا گئی تھی۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ اپنے کمرے میں آئے تھے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک سوچوں کے سنگریزوں نے ان کے ذہن کو اس بُری طرح چھیل کر رکھ ڈالا تھا کہ خون کی گردش بھی ان کے دماغ میں گونج بپا کر رہی تھی۔ تین تاریخ کی رات آٹھ بجے منگنی کی تقریب ہونا قرار پائی تھی اور غازی کو ڈھونڈ کر لانے کی درمیانی معیاد کا جو وعدہ انہوں نے ماں سے کیا تھا۔ وہ بھی تین تاریخ کو ختم

ہو جانا تھا اور جب یہ جھوٹ ماں پر کھلنا تھا تو اس کے نتیجے میں ماں کے قلب و ذہن پر جو سنگین نتائج مرتب ہو سکتے تھے۔ اس کا بھی ان کو پوری طرح ادراک تھا۔ اُس مسرت کے موقع پر خوشیوں سے بھرے گھر میں صف ماتم بچھ سکتی تھی۔ دو دن کے اندر اندر غازی کو ڈھونڈ لانے کا بیڑہ تو انہوں نے اُٹھا لیا تھا مگر اب ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کہاں ڈھونڈیں؟ کیسے ڈھونڈیں اور کہاں سے لائیں؟

رات عمر کے آخری حصے میں تھی۔ کبھی وہ اُٹھ کر اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگتے اور کبھی سر تھام کر بیٹھ جاتے لیکن بیٹھنے سے جیسے کمرے کی فضا میں اردگرد منڈلاتے ہوئے سوچوں کے خون آشام پرندے اُن پر جھپٹ پڑتے۔ وہ پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگ جاتے۔ غازی کی کوئی تصویر ان کے پاس نہیں تھی کہ وہ اخباروں اور ٹی وی پر اشتہار دے دیتے۔ انہیں سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ ایسا کون سا طریقہ اپنائیں جس سے وہ لمحوں میں غازی کا سراغ پا لیں۔ وقت گزرتا رہا اور ان کی سوچیں ایک دائرے میں کچھ اس شدت سے گردش کرتی رہیں کہ انہیں یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے کسی بھی لمحے ان کی کنپٹیاں چٹخیں گی اور رگیں باہر اُبل آئیں گی!

ٹہلتے ٹہلتے ٹانگوں میں اینٹھن ہونے لگی تو وہ نڈھال سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ بالوں کو انہوں نے مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ سیاہ رات اپنی زندگی گزار چکی تھی۔ اچانک جیسے ان کے دماغ میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکا مگر اس کوندے کی رنگت سیاہ تھی۔ ملک معظم ایک جھٹکے سے سیدھے ہو بیٹھے۔

ناامیدی، مایوسی اور لاعلمی کے اندھیروں کے درمیان انہیں ایک روشن ستارہ دکھائی دیا۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے اُٹھ کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے اپنا موبائل اُٹھایا۔ وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گئے اور تیزی سے بلیک مین کے نمبر پریس کرنے لگے۔ دوسری طرف سے بیل کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ مضطربانہ انداز میں اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ موبائل ان کے کان سے لگا ہوا تھا اور وہ اضطراب کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹ رہے تھے۔

''کہیے ملک صاحب! کیا پریشانی سونے نہیں دے رہی؟'' اچانک ان کے کانوں سے بلیک مین کی گھمبیر آواز ٹکرائی تو وہ اس کی بات پر چونک پڑے۔ انہیں حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ بلیک مین کو کیسے علم ہو گیا کہ میں کسی پریشانی میں ہوں۔

''تمہیں کیسے علم کہ میں پریشان ہوں؟'' ان کی بات سن کر دوسری طرف شاید بلیک مین ہنسا تھا۔

''ملک صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ پریشان ہی نہیں بہت ہی زیادہ پریشان ہیں اور پریشانی بھی ایسی جس نے ساری رات آپ کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیا۔''

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟''

"اس لیے کہ ابھی کچھ تھوڑی بہت عقل میرے پاس بچی ہوئی ہے! سیدھی سی بات ہے کہ اس طرح رات کے آخری پہر آپ محض میرا حال چال پوچھنے کے لیے تو مجھے فون نہیں کر سکتے۔ یقینی بات ہے کہ کوئی ایسا مسئلہ ہے۔ جس نے آپ کو اس حد تک پریشان کر رکھا ہے کہ آپ ساری رات سوچتے رہے آپ کو حل سجھائی نہیں دیا۔ آپ شریف اور سیدھے سے بزنس مین ہیں۔ مسئلہ کوئی ایسا ہوگا جو مجھ جیسا ٹیڑھا آدمی کر سکتا ہوگا۔ سو آپ نے مجھے فون کر لیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ناں؟"

"نہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"تو پھر فرمائیے میرے لائق کیا خدمت ہے؟ میں کیا مدد کر سکتا ہوں آپ کی؟"

"بلیک مین...... وقت بہت کم ہے اور کام بہت مشکل۔ یوں سمجھ لو کہ تمہارے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔"

"ملک صاحب! میں نے پیدا ہو کر اس دنیا میں زندگی گزارنے کا چیلنج قبول کیا تھا اور گزار رہا ہوں۔ میرے لیے اس سے بڑا چیلنج اور کوئی نہیں ہو سکتا! آپ کام کی بات کریں۔"

"تو ٹھیک ہے کام کی بات سنو۔ مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔ چار تاریخ کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے مجھے وہ شخص چاہیے اور اس کام کی میں تمہیں منہ مانگی قیمت دوں گا!"

"منہ مانگی......؟ ملک صاحب! منہ مانگی قیمت کا مطلب سمجھتے ہیں ناں آپ! میرے جیسا شخص کیا کچھ مانگ سکتا ہے۔ کیا اس بات کا اندازہ ہے آپ کو؟"

"ہاں! مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے۔ میں اپنی سانسیں تک گروی رکھنے کو تیار ہوں۔"

"اوہ...... وری انٹرسٹنگ تو ایسی بات ہے۔ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین لگتا ہے۔"

"ایسی ہی بات ہے بلیک مین...... وہ شخص میرا بھائی ہے اور اس کی ذات کے ساتھ میری ماں کی سانسیں جڑی ہوئی ہیں۔ میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا ہے کہ میں دو دن کے اندر اندر بھائی کو اس کے سامنے لا کھڑا کروں گا اور اگر ایسا نہ کر پایا تو میری ماں کی سانسیں بکھر بھی سکتی ہیں۔"

"اگر معاملہ ماں اور بیٹے کا ہے تو میں یہ کام بلا معاوضہ کروں گا۔ محبتیں بانٹنے کی میں قیمت نہیں لیا کرتا۔"

"نہیں بلیک مین تم جو کہو گے جتنا کہو گے میں دینے کو تیار ہوں۔"

"ملک صاحب! ہر انسان کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ بغیر اصولوں کے گزاری جانے والی زندگی بے معنی اور فضول ہوتی ہے۔ میرے بھی کچھ اصول ہیں اور میں نے کبھی ان کو روند کر اونچا ہونے کی کوشش نہیں کی۔ آپ بتائیں کہ آپ کے پاس اپنے بھائی کی کوئی تصویر ہے؟" بلیک مین کا لہجہ قدرے جذباتی تھا۔

"نہیں، وہ آج سے پندرہ سال پہلے ہم سے بچھڑ گیا تھا۔"

"اوہ، پندرہ سال پہلے جو شخص آپ سے بچھڑ گیا۔ آپ کے پاس اس کی تصویر تک نہیں تو پھر ایسے شخص کو کس طرح ڈھونڈا جا سکتا ہے؟"

"بلیک مین تم اسے ڈھونڈ سکتے ہو۔ کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے، تم اسے جانتے ہو۔ کیونکہ تم اس پر ایک قاتلانہ حملہ کر چکے ہو! مظہر شاہ گزرا تھا۔ عامر، امجد اور ارشد تین قتل۔ چوتھا گولی لگنے کے باوجود اتفاق سے بچ گیا تھا۔ غیاث...... وہی میرا بھائی ہے اور تمہیں اسی کا سراغ لگانا ہے۔" ملک معظم نے گہرے سنجیدہ لہجے میں کہا تو دوسری جانب کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔ ملک معظم منتظر تھے کہ بلیک مین کچھ کہے گا مگر جب خلاف توقع دوسری جانب مکمل خاموشی رہی تو ملک معظم ہی گویا ہوئے۔

"کیا بات ہے بلیک مین تم اس طرح خاموش کیوں ہو گئے؟" بے چینی ان کا انداز تھی۔ پھر جب بلیک مین بولا تو اس کی گھمبیر آواز مزید گھمبیرتا لیے ہوئے تھی۔

"ملک صاحب...... میں اُسے تین تاریخ کا سورج غروب ہونے سے پہلے ڈھونڈ نکالوں گا مگر آپ کے لیے نہیں...... اپنے لیے۔ میں اسے ہلاک کرنے کی قیمت وصول کر چکا ہوں!"

"بلیک مین......" ملک معظم جیسے پھٹ پڑے۔ "کتنی قیمت لے چکے ہو تم اس کی موت کی دس لاکھ...... بیس لاکھ...... چالیس لاکھ...... اسی لاکھ...... میں اُس سے دُگنی دوں گا تمہیں اس کی زندگی کی! بولو جواب دو۔ کتنی قیمت لی ہے تم نے ایک انسان سے ایک انسان کی سانسیں چھیننے کی۔ ایک ماں سے کلیجے کا ٹکڑا کاٹ کر الگ کرنے کی۔ بولو۔ جواب دو۔ میں تمہیں روپوں میں تول دوں گا۔"

"ملک صاحب، آپ تو جذباتی ہو گئے۔ پر میرے پاس جذبات نام کی کوئی چیز نہیں۔ میں قیمت لے کر کھا چکا ہوں۔ اگر وہ پیسہ میرے پاس موجود ہوتا تو میں وہ واپس کر کے اس کی زندگی کے عوض آپ سے دُگنی قیمت وصول کر لیتا لیکن اب ایسا ممکن نہیں اور کھایا ہوا میں حرام نہیں کر سکتا۔ یہ میرا اصول ہے اور اصول بس اصول۔" اُس نے رابطہ ختم کر دیا۔

ملک معظم نے جذباتی انداز میں دوبارہ پھر سے وہ نمبر ملانے کی کوشش کی مگر بلیک مین کا موبائل آف تھا!

☆............☆............☆

پوری کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ مہمان آ چکے تھے۔ مہمانوں کی نشست اور ریفریشمنٹ کا سارا انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ کوئی زیادہ مہمان بھی نہیں تھے لیکن عجیب سی گہما گہمی تھی۔ شاید خوشیاں اسی طرح اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ خواہ مخواہ ہی ساری کائنات گنگناتی رقص کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خوشی آنکھوں میں ستارے بن کر جھلملاتی ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کلیاں کھلاتی ہے۔

یہ شام بھی ان سب کی آنکھوں کے لیے خوشیوں کے ستارے لے کر آئی تھی۔ مسز ملک ایک طویل عرصے بعد دل سے تیار ہوئی تھیں۔ لائٹ کالے بارڈر کی شیفون کی ساڑھی میں وائٹ گولڈ کا نازک سا سیٹ پہنے بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے وہ عام سی تیاری میں بھی بہت خاص لگ رہی تھیں۔ لان میں بچھی ہوئی کرسیوں پر وہ خالہ کلثوم اور اماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ آج وہ بہت زیادہ اداس نہیں تھیں لیکن ہمیشہ کی طرح اس خوشی کے موقع پر بھی غازی کا خیال ان کے ہم قدم تھا۔ دیگر مہمان خواتین بھی ایک دوسرے سے باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔ آمنہ خالہ منگنی کے لیے لایا گیا جوڑا، زیورات، میک اپ کا سامان ماہ نور کے حوالے کر کے اب خود بھی اماں وغیرہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ملک معظم اور شہسوار، اسد اور اس کے چند دوست لان کی دوسری سمت بچھے صوفوں پر براجمان تھے۔ حمد تمام مہمانوں کو کولڈ ڈرنکس سرو کر رہا تھا۔ ملک معظم نے اس کی آسانی اور مدد کے لیے تین چار ویٹرز بلوا لیے تھے۔ خالہ آمنہ اور اسد سے پوچھنے کے بعد متفقہ رائے یہ تھی کہ کھانا وانا کھانے کے بعد منگنی کی رسم ادا کی جائے۔ اسد گولڈن راسلک کے کرتے، سفید شلوار اور سلیم شاہی کھسوں کے ساتھ بہت منفرد لگ رہا تھا۔ شاہین کو اس کی ایک دوست تیار کر رہی تھی۔ ماہ نور نے تیاری کا سامان اس کے حوالے کیا اور خود لان میں چلی آئی۔ آج تو اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ لمبے سیاہ بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ سفید ابرق لگے کاٹن کے جدید تراش خراش کے سوٹ میں بڑا سا دوپٹہ بمشکل سنبھالتی وہ جھک کر اماں سے کوئی بات کر رہی تھی۔ ملک معظم کی نگاہیں اُس پر ٹکی رہ گئیں۔ جانے کیا بات تھی اس لڑکی میں کہ وہ انجانے میں ہی اس کے بارے میں سوچنے لگ جاتے تھے حالانکہ وہ کمٹڈ تھے۔ ماہ نور کے لیے ان میں محبت نہیں پسندیدگی کے جذبات تھے لیکن وہ ان جذبات کو فی الحال کوئی نام نہیں دے پائے تھے۔ ملک معظم کا ذہن ایک بار پھر بلیک مین اور غیاث کی جانب پلٹ گیا۔ وہ شدید ترین ذہنی دباؤ کا شکار تھے۔ وہ ماں کی طرف سے فکر مند تھے کہ انہوں نے آج کا وعدہ کیا تھا کہ وہ غازی کو لے کر آئیں گے۔ بلیک مین نے ان سے کہا تھا کہ تین تاریخ کا سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے غیاث کو ڈھونڈ نکالے گا۔ جانے وہ اُسے ڈھونڈ بھی پایا یا نہیں اور اگر اُس نے ڈھونڈ لیا تو... تو جانے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ انہوں نے کئی بار بلیک مین کو کال کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کا موبائل آف ہی ملا۔ ان کے ذہن میں اس وقت ایک ہی سوچ تھی کہ وہ اپنے وعدے کی پاسداری نہیں کر پائے۔ وہ غازی کو نہیں ڈھونڈ پائے تھے۔ ماں کی امید بھری نظروں میں انتظار کی جوت تو جگا دی تھی لیکن اس انتظار کو ختم نہیں کر پائے تھے وہ۔

''سر...... میرا اور اماں کا خیال ہے کہ کھانا سرو کر دیا جائے۔'' قریب سے ماہ نور نے انہیں چونکا دیا تھا۔

''تو ٹھیک ہے...... کھانا لگا دیا جاتا ہے۔ شہسوار، کھانا لگانے کا آرڈر کر دو۔'' انہوں نے پہلے ماہ نور کو جواب دیا۔ پھر شہسوار سے مخاطب ہوئے اور کچھ ہی دیر بعد ٹیبلوں پر کھانا چن دیا گیا۔ سب مہمان سرو کیے ہوئے کھانے کی سمت چل پڑے۔ اسد بمعہ اپنے دوستوں کے لان کے ایک نسبتاً خاموش گوشے میں لگے ٹیبل کے پاس کھڑا تھا۔ شہسوار آتے جاتے اُس پر فقرے کس رہا تھا۔

''یار ایک تھپڑ ہمیں بھی عنایت کر دو شاید ہمارے مقدر بھی سنور جائیں۔'' یہ اسد کا چلبلا دوست اظہر عباس تھا۔ اسد مسکرا رہا تھا۔

''ارے یار اظہر بور کے لڈو کھا کر پچھتانا ضروری ہے کیا؟ بگڑ گئے بے چارے کے مقدر۔'' عاطف مصنوعی افسوس سے چچ چچ کرتے ہوئے بولا۔

''اسد...... یار گناہ بخشوا لو فقیر سے، گھر تھانے میں بدلنے والا ہے تمہارا۔'' شہسوار ویٹروں کو ہدایات دینے کے بعد ان کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

''شاری بھائی...... کیوں ہماری بھابی کو تھانیدارنی کہہ رہے ہیں۔ سنا ہے بڑی بھولی ہیں وہ۔'' اظہر نے کہا۔

''شادی سے پہلے ساری لڑکیاں بڑی بھولی لگتی ہیں بچے۔ یہ تو جب گھر میں آتی ہیں تو پتہ چلتا ہے۔'' عاطف گویا اظہر کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ اسی طرح خوش گپیوں کے درمیان ڈنر اختتام کو پہنچا۔ پھر سارے مہمانوں نے لان کے اُسی حصے پر قبضہ جما لیا جسے مصنوعی طور پر منگنی کی رسم کے لیے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ اسد کو صوفے پر بٹھا دیا۔ ماہ نور اور راہین کے ہمراہ گولڈن آرگنزا کے حیدرآبادی کرتے، چوڑی دار پائجامے میں ملبوس شاہین شاہانہ انداز لیے آہستہ روی سے چلتی آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسد کی نگاہ بھٹکی وہ پھر جیسے آنے والی پر ٹھٹک کر مرکوز ہو گئی جو کائنات کی اپسراؤں کو بھی گویا مات دے رہی تھی۔ ماہ نور نے شاہین کو اسد کے قریب صوفے پر بیٹھا دیا۔ شاہین کی سہیلیاں اس کے قریب ہی کھڑی تھیں اور یقیناً زور و شور سے نئے جوڑے پر تبصرے کیے جا رہے تھے۔

''ارے یار اظہر... یہ جو دلہن کی سہیلیاں ہوتی ہیں بے چاریاں کیا سرد سرد سی آہیں بھرتی ہیں۔ یکدم یوں لگتا ہے گویا مری میں آ بیٹھے ہوں۔'' عاطف نے گویا اعلان جنگ کر دیا تھا۔

''تو آپ کیوں جلے ہوئے ہیں۔ حسرت کے ماروں کے منہ تو دیکھو ذرا۔'' شوخ نٹ کھٹ صبیحہ نے جوابی حملہ کیا تھا۔

''ارے آپ سے کون کہہ رہا ہے...... ہم تو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔'' عاطف نے براہ راست بات کرنے کی ٹھانی۔

''بس بس...... کول ڈاؤن...... جھگڑا ختم......'' مسز جلال نے آگے بڑھ کر سیز فائر کیا۔

شاہین کی سہیلیاں اس کے دائیں طرف کھڑی تھیں جبکہ بائیں طرف صوفے کے ساتھ اسد کے دوست کھڑے تھے۔ ملک معظم ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ ان کا ذہن بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ وہ اردگرد کی رونق، خوشیوں سے کھلکھلاتی چہکتی آوازوں اور زندگی کی حرارت سے بھرپور چہروں میں اُلجھ کر اپنا ذہن بٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سامنے اسد کے ساتھ صوفے پر شہسوار بیٹھا ہوا تھا۔ اسد کی کسی بات کے جواب میں مسکراتے ہوئے اُس نے نگاہیں سامنے ٹکا رکھی تھیں۔

اس کی نگاہوں میں مچلتا ایک انوکھا پیغام ملک معظم کو کچھ چونکا سا گیا۔ انہوں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا سامنے صوفے پر خالہ کلثوم کے دائیں جانب بیٹھی راہین پر ان کی نگاہ ٹھہر گئی۔ انہوں نے ایک بار پھر شہسوار کی طرف دیکھا۔ وہ بلاشک وشبہ راہین کی طرف ہی متوجہ تھا جبکہ راہین کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے کچھ کچھ دلچسپی کے امکانات موجود ہیں۔ وہ کھٹی کھٹی نروس نروس سی دکھائی دے رہی تھی۔ ملک معظم کے ذہن کے کسی گوشے میں طمانیت کی ایک لہر ہلکورہ لے کر بیدار ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں ایک خوشی سی محسوس کر رہے تھے۔ پھر ان کی نگاہ خالہ کلثوم کے بائیں طرف صوفے پر بیٹھی مسز جلال پر ٹک گئی۔ ایک طویل عرصے کے بعد انہوں نے اپنی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں خوف نہیں تھا آسودگی تھی۔ وہ خالہ کلثوم کے ساتھ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ نظر اُٹھا کر شاہین اور اسد کی طرف بھی دیکھ لیتی تھیں۔ ملک معظم ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔ انہیں ماں کے ہونٹوں پر بکھری یہ مسکراہٹ بہت قیمتی بہت انمول لگی۔ اس مسکراہٹ کو قائم رکھنے کی خاطر تو وہ کوئی بھی قربانی دے سکتے تھے۔ کچھ بھی کر سکتے تھے لیکن کچھ چیزیں ان کے اختیار میں نہیں تھیں۔ یہ مسکراہٹ بس کچھ دیر کی مہمان تھی۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔ اتنا تو وہ جانتے تھے کہ کچھ لوگوں کی زندگیوں کا محور صرف امید ہوتی ہے جب وہ امید ختم ہو جائے تو زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی ماں بھی ایک امید کے سہارے زندگی کے تلخ ایام گزارتی آئی تھی اور اب وہ امید لحہ بہ لحہ موت کی جانب عازمِ سفر تھی۔ ملک معظم کا دل خوف کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر اُبھرا۔ کہیں امید کا ٹوٹنا میری ماں کی زندگی ہی نہ چھین لے! وہ تڑپ کر رہ گئے۔

"نہیں...... ایسا نہیں ہوگا...... ایسا نہیں ہونا چاہیے......" وہ بے بس تھے اور شرمندہ بھی۔ ماں سے کیا گیا وعدہ پورا نہ ہو سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کا انتظار ختم نہ ہو سکا تھا اور یہی ان کی ناکامی تھی۔ ان کی نگاہ مسز جلال اور راہین کی دوسری سمت صوفے پر بیٹھی ماہ نور، اماں اور خالہ آمنہ کی جانب اُٹھ گئی جو کسی سنجیدہ موضوع پر محوِ گفتگو تھیں۔ ماہ نور سر جھکائے خاموشی سے اماں کی بات سن رہی تھی۔ یقیناً اماں اُس سے اس کی شادی سے متعلق ہی بات کر رہی تھیں۔ شاید لوگوں کی باتوں کا احاطہ کر رہی تھیں کہ

بڑی بیٹھی ہے اور چھوٹی کی منگنی کر دی۔ ملک معظم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

موبائل کے بزر نے ان کی سوچوں کے تسلسل کو توڑ دیا۔ انہوں نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ نمبر ان کے لیے اجنبی تھا۔ انہوں نے اُلجھن آمیز انداز میں موبائل آن کیا۔

"ہیلو......"

"کون...... ملک معظم......؟" دوسری طرف سے گویا تصدیق کی گئی۔

"جی ہاں...... میں بول رہا ہوں...... فرمائیے آپ کون صاحب؟" ملک معظم نے اپنے اسی شائستہ انداز میں جواب دیا۔

"مجھے ماں جی سے بات کرنی ہے۔" دوسری جانب سے دیا گیا جواب ملک معظم کے لیے غیر متوقع تھا۔

"جی...... جی کیا مطلب......؟ میں سمجھا نہیں...... کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟"

"مجھے مسز جلال سے بات کرنی ہے۔" اسی سپاٹ لہجے میں جواب دیا گیا۔

"آپ کون صاحب ہیں؟ اور کس سلسلے میں بات کرنی ہے اُن سے؟"

"یہ بھی انہی کو بتاؤں گا کہ میں کون ہوں اور مجھے کیا بات کرنی ہے۔"

"دیکھیے میں ان کا بڑا بیٹا معظم بات کر رہا ہوں۔ ہمارے گھر میں فنکشن ہے وہ اس وقت مہمانوں کے ساتھ مصروف ہیں۔ آپ نے جو بھی کہنا ہے مجھ سے کہہ سکتے ہیں۔" ملک معظم نے رسانیت سے کہا۔

"مجھے علم ہے کہ آپ کے ہاں کون سا فنکشن ہے اور کس قسم کی مصروفیت میں ہیں مگر مجھے جو بھی کہنا ہے انہی سے کہنا ہے۔ براہِ مہربانی آپ میری اُن سے بات کروائیں۔" لہجہ انتہائی شائستہ اور مہذب تھا۔

"دیکھیے محترم! آپ بتا دیجیے کہ آپ کون صاحب ہیں؟ میں بنا جانے بوجھے آپ کی ان سے کیسے بات کروا سکتا ہوں؟ بھلا میں انہیں کیا بتاؤں کہ کس کا فون ہے؟"

"معظم صاحب! میں آپ کو بھی بتا دوں گا کہ میں کون ہوں مگر ان کو بتانے کے بعد۔ باقی رہی بات ان کی تو آپ میری ان سے بات کروا دیں۔ میں خود ہی ان کو بتا دیتا ہوں کہ میں کون ہوں۔" وہ اسی طرح اپنی بات پر اَڑا ہوا تھا۔ ملک معظم تذبذب کا شکار ہو گئے۔

"اوکے...... آپ ذرا ہولڈ کریں!" ملک معظم نے جواب دیا اور مسز جلال کی جانب بڑھ گئے۔ ان کے چہرے پر قدرے اُلجھن کے آثار سمٹ آئے تھے۔

"ماما......!" قریب پہنچ کر ملک معظم نے باتوں میں مگن مسز جلال کو متوجہ کیا تو وہ ملک معظم

کے چہرے پر پھیلے ہوئے اُلجھن کے تاثرات دیکھ کر یک بہ یک سنجیدہ ہو گئیں۔

''ظومی! کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟''

''ماما کوئی شخص آپ سے بات کرنا چاہتا ہے!'' انہوں نے موبائل مسز جلال کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھ سے......؟ کون شخص ہے؟''

''معلوم نہیں' کہتا ہے کہ صرف آپ سے بات کرنی ہے۔ میرے لیے تو آواز اجنبی ہے!'' آنکھوں میں حیرت کے تاثرات سمیٹے انہوں نے ملک معظم کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

''ہیلو......'' انہوں نے استفہامیہ انداز میں کہا۔ مگر ان کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے کوئی آواز نہ اُبھری۔

''ہیلو......'' چند لمحے توقف کے بعد انہوں نے دوبارہ ہیلو کہا مگر اس بار بھی خاموشی ہی رہی۔ انہوں نے کچھ عجیب سی نظروں سے ملک معظم کی طرف دیکھا۔

''ہیلو......کون ہے؟'' وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ جواب میں اس بار بھی خاموشی تھی مگر سانسوں کی ہلکی ہلکی آواز سے محسوس ہو رہا تھا کہ دوسری جانب کوئی موجود ہے۔

''میں مسز جلال بات کر رہی ہوں...... اب بات کرو خاموش کیوں ہو؟'' دوسری جانب ہنوز خاموشی تھی۔ مسز جلال جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو گئیں۔

''اگر تم بات نہیں کرنا چاہتے تو میں بند کر رہی ہوں۔'' انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

''مم......مم...... مجھے بات کرنی ہے۔'' ایک لرزیدہ سی آواز سنائی دی۔ لہجہ اجنبی تھا مگر اس لہجے میں کچھ ایسا اضطراب' ایسی تشنگی' ایسی تڑپ اور ایسی التجا تھی۔ کچھ...... کچھ ایسا تھا اس لہجے میں کہ مسز جلال کا رواں رواں جھنجھنا کر رہ گیا۔ اس آواز میں جانے ایسا کیا تھا کہ چند لمحوں کو مسز جلال پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔ پلکیں ساکت ہو گئیں اور آنکھیں جیسے فضا میں کسی نادیدہ وجود کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔ ایک بے نام...... ایک انجانے جذبے نے ان کی پور پور کو سحر انگیز حصار میں جکڑ لیا۔ ان کے چہرے کے تاثرات میں کچھ ایسی تیزی سے تغیر رونما ہوا کہ ملک معظم جو ان کے سامنے کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں اندیشے کی ایک برقیلی سلاخ اُترتی چلی گئی۔ راہین اور خالہ کلثوم بھی پوری طرح ان کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ ملک معظم کرسی گھسیٹتے ہوئے ان کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

''ماما...... کیا بات ہے......؟ کون ہے؟'' ملک معظم نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا اور آگے کی جانب جھک کر انہیں بغور دیکھتے ہوئے بولے۔ خالہ کلثوم نے بھی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا انہیں اپنے ہونے کا یقین دلایا۔

''کیا بات ہے رابعہ؟ تم پریشان کیوں ہو گئی ہو......؟ خیریت تو ہے ناں؟'' وہ فکرمند لہجے میں بولیں۔

ملک معظم نے دوبارہ کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ مسز جلال نے سحر زدہ سے انداز میں ہاتھ بلند کر کے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ملک معظم سختی سے ہونٹ بھینچ کر رہ گئے۔ چند لمحے یونہی خاموشی میں گزر گئے۔ پھر مسز جلال کے قفل زدہ ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''کون......؟'' ان کے وجود میں سکوت اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ دوسری جانب سے لرزیدہ لہجے میں ملفوف ایک کپکپاتا ہوا لفظ ادا ہوا۔ مسز جلال کی سماعت سے ٹکرایا۔ اتنے زور کا چھناکا ہوا کہ ان کے وجود میں پھیلا سناٹا کرچی کرچی ہو گیا۔ ان کا رواں رواں لرز اُٹھا۔ وہ لفظ نہیں گویا بم تھا جو ان کے جذبات کی وادیوں میں کہیں پھٹا تھا۔ دل میں جیسے ایک زلزلہ جاگ اُٹھا۔ دھڑکنیں تلپٹ ہو کر رہ گئیں۔ نس نس میں اس ایک لفظ کی بازگشت گونجنے لگی۔

''ماں ......ماں...... ماں۔''

''ک...... کک...... کون؟ کون ہے......؟ کون بول رہا ہے؟'' بے چینی و بے قراری ان کے لہجے میں گھل کر رہ گئی تھی۔

''ماں......'' دوسری جانب سے جیسے کوئی بولا نہ ہو۔ درد کی شدت سے کراہا ہو۔

''کیا میری آواز بہت بدل چکی ہے؟ کیا گزشتہ پندرہ سالوں میں میرا ماں کہنے کا انداز بدل گیا؟ کیا میری پکار جذبات سے عاری ہے جو آپ سوال کر رہی ہیں؟''

دل تو ان کا پہلے ہی پنجرے میں قید پرندے کی طرح پھڑ پھڑا اُٹھا تھا۔ دھڑکنیں گواہی دینے لگی تھیں لیکن اس بار تو جیسے خون کا قطرہ قطرہ چیخ اُٹھا تھا۔

''غ...... غازی......غیاث...... غازی میرے بچے......'' مسز جلال کی آواز آنسوؤں سے بھرا گئی۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ مزید کچھ نہ کہہ پائیں۔ ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ بے چینی سے سیدھی ہو بیٹھیں۔ غیاث اور غازی کے نام پر ملک معظم' راہین اور خالہ کلثوم تینوں ہی چونک پڑے۔

''غیاث...... میرے بیٹے...... میرے بچے کہاں ہو تم؟ اس طرح فون پر بات کیوں کر رہے ہو؟ کہاں ہو تم؟ کیوں ہم سے دور بھاگ رہے ہو؟ کیوں چھپتے پھر رہے ہو ہم سے؟ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کیوں ہم سے دور رہ رہے ہو تم؟ کیوں سامنے نہیں آتے؟ تمہارے بھائی' تمہاری ماں تمہیں دیکھنے کے لیے' تمہیں ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ ہم سب تمہارے لیے تڑپ رہے ہیں۔ فون رکھو اور فوراً آ جاؤ۔ ان پندرہ سالوں میں تمہاری دوری کا جو عذاب کاٹ لیا ہے میں نے۔ اب مزید تکلیف نہیں دو۔ فون رکھو اور فوراً چلے آؤ۔ کہاں...... کہاں ہو تم بتاؤ؟ ہم خود آ رہے ہیں تمہارے پاس!''

''نہیں ماں...... میں نہیں آ سکتا۔ رہی بات یہ بتانے کی کہ میں اس وقت کہاں ہوں تو ایک مدت ہوئی مجھے خود علم نہیں کہ میں کہاں ہوتا ہوں۔'' غیاث کے لہجے میں ایسی شکستگی تھی کہ مسز جلال کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔

''غازی...... غازی میرے بچے...... میرے جگر کے ٹکڑے کیوں علم نہیں تمہیں؟ کیوں نہیں آ سکتے ہو تم؟ ان پندرہ سالوں میں کیا ماں کی محبت کی حدت سرد پڑ گئی یا دودھ کی تاثیر ختم ہوگئی۔ کون سی ایسی رکاوٹ ہے جو تمہارے یہاں آنے میں حائل ہے جو تمہیں ہم سے دور رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔'' جذبات کی شدت اور پندرہ سال سے جمع اذیت و کرب کا لاوا جیسے ان کا دل پھاڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ وہ چیخ پڑی تھیں ان کی آواز سن کر ماہ نور، اماں اور خالہ آمنہ بھی گھبرا کر ان کے پاس چلی آئیں۔

اماں انہیں دیکھ کر پریشان سی ہوگئیں۔

''کیا بات ہے رابی؟ کیا ہوا؟'' انہوں نے پوچھا لیکن ملک معظم اور خالہ کلثوم نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

''نہیں ماں...... نہ آپ کی محبت کی حدت سرد ہوئی ہے نہ دودھ کی تاثیر ختم ہوئی ہے بلکہ پچھلے پندرہ سالوں میں یہ میرے وجود میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتی رہی ہے۔ سرد راتوں میں اسی حدت نے آغوش میں چھپائے رکھا۔ بھوک نے جب فاقوں کی صورت دیکھی تو اسی دودھ کی تاثیر نے صبر اور برداشت کا قرینہ سکھایا۔ یہی تو میرے جینے کا حوصلہ رہیں ماں۔ اسی محبت کی شدت اور تڑپ نے ہی مجھے مجبور کیا کہ میں آپ سے بات کروں۔ ورنہ شاید...... شاید تمام عمر غیاث کو کوئی نہ پا سکتا لیکن اسی محبت کی حدت نے میرے اندر خواہش کا الاؤ جلایا کہ ملنا تو شاید کاتب تقدیر نے نصیب میں لکھا ہی نہیں۔ رکاوٹوں کے سنگریزے اس نے یوں میرے پیروں تلے بکھر دیئے ہیں کہ جب میں انہیں روند کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں، اپنے پیاروں کے پاس آنا چاہتا ہوں تو وہ چٹانوں کی طرح بلند ہو کر میری راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ان سے ٹکرا گیا تو میرا وجود پاش پاش ہو جائے گا۔ ملنا تو نصیب میں نہیں ہے ماں لیکن بات تو کر سکتا ہوں۔ سو میں نے فون کر دیا کہ کم سے کم آپ پر اپنی ذات تو واضح کر دوں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام عمر ماں کی نظروں میں مجرم بنا رہوں۔'' غیاث کی آواز بھی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''غازی...... ٹھیک ہے تم نہیں آ سکتے ناں ہمارے پاس۔ تمہارے راستے میں رکاوٹیں حائل ہیں تو بتاؤ کہاں ہو تم؟ میں آتی ہوں...... میں اسی وقت تمہارے پاس آؤں گی۔ بتاؤ مجھے تم کہاں ہو......؟ تمہارے راستے میں تو رکاوٹیں آ سکتی ہیں لیکن ماں کی محبت کے سامنے تو کوئی

رکاوٹ نہیں آ سکتی ناں۔ میں تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ رکاوٹیں خود راستہ چھوڑ دیں گی۔'' مسز جلال باقاعدہ رونے لگیں۔ دوسرے مہمان بھی موجودہ صورتِ حال سے گھبرا گئے تھے۔ وہ سب ان کے اردگرد جمع ہوگئے۔ سبھی کے چہروں پر پریشانی کھنڈ گئی۔

''ماں...... روئیں نہیں...... آپ کی آنکھ سے بہنے والا ایک ایک آنسو میرے دل و دماغ پر، میرے ضمیر پر منوں وزن ڈال دے گا۔ پندرہ سالوں کی اس دوری نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔ اتنا وزن سہار نہیں پاؤں گا۔ پس کر رہ جاؤں گا اس بوجھ تلے۔ میں نے آپ کو رلانے کے لیے نہیں، آپ کی دعائیں لینے کے لیے فون کیا ہے تاکہ باقی کے جو دن زندگی کے ہیں سکون سے کٹ جائیں۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے میں نہیں روتی۔'' مسز جلال نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔ ''مگر تم بتاؤ تو سہی کہ تم کیوں نہیں مل سکتے؟ کیوں نہیں ملنا چاہتے؟ کیا...... مسئلہ کیا ہے؟ مجبوری کیا ہے؟ کون سی رکاوٹ تمہارے آڑے آ رہی ہے؟''

''قسمت مسئلہ ہے، تقدیر رکاوٹ ہے اور نصیب مجبوری ہے ماں!''

''صرف ایک بار شکل دکھا دو اپنی...... پندرہ سال میں بہت تڑپی ہوں غازی...... اب صبر کا یارا نہیں رہا...... ایک بار، صرف ایک بار اپنی شکل دکھا دو۔ میں اور کچھ نہیں مانگتی تم سے۔'' مسز جلال کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ملک معظم کا ضبط جواب دے گیا۔ انہوں نے ماں کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔ ماہ نور، اماں اور خالہ کلثوم نے مسز جلال کو صوفے پر بٹھایا اور رابین کو پانی کے لیے بھیجا۔ اسد، اس کے دوست اور شہسوار ملک معظم کے قریب حیران و پریشان کھڑے پچویشن پر غور کر رہے تھے۔

''بھائی، ایک بار غازی بھائی سے پوچھ لیں کہ وہ ہیں کہاں ہم یوں ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔'' شہسوار چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

''ہیلو...... غیاث......'' ملک معظم موبائل کان سے لگاتے ہوئے گویا ہوئے۔

انہیں یوں احساس ہوا جیسے غیاث اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھ رہا ہو۔

''غیاث بات کرو......'' ملک معظم قدرے بے چین سے ہوگئے۔

''بھائی...... اب تو بتانے کی ضرورت نہیں ناں کہ میں کون ہوں؟ آپ کے بے حد اصرار کے باوجود میں نے آپ سے بات نہیں کی۔ اس لیے کہ سب سے پہلے میں ماں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ان کا حق پہلا تھا بہر حال پھر بھی میں اپنی اس حرکت کی معافی چاہوں گا آپ سے۔''

''غازی...... یوں اجنبیوں کی طرح مت بات کرو مجھ سے۔ تم نے جو کیا میں نے اُسے مائنڈ نہیں کیا۔ اس لیے معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کیوں نہیں آنا چاہتے یہاں؟ کیوں دور رہنا چاہتے ہو ہم سے؟'' ملک معظم مضطرب لہجے میں سوال کر رہے تھے۔

''بھائی...... بھائی میں سبز قدم ہوں۔ میرے قدم جہاں پڑتے ہیں وہاں مصیبتیں اور تباہیاں جنم لیتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ سب محض ایک میری ذات کی وجہ سے مشکلوں کے گرداب میں پھنس جائیں۔''

''غازی...... میرے بھائی یہ سب تمہارا وہم ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''بھائی...... ایک اندھے کو دن اور رات میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ وہ نہیں جان سکتا کہ روشنی کیا ہے اور اندھیرا کیا لیکن میں اندھا نہیں ہوں۔ آنکھیں رکھتا ہوں اور میری آنکھوں کے سامنے آگ اگلتا سلگتا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دہک رہا ہے۔ پھر میں اس کو کیسے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دوں۔'' غیاث اسی طرح اپنے فیصلے پر جما ہوا تھا۔

''غازی! ہر اندیشہ' ہر سوچ' ہر پریشانی چھوڑ کر ہمارے پاس چلے آؤ۔ ہم اس سورج کی تمازت سے تمہیں بچا لیں گے۔ یقین جانو اس کی ہلکی سی حرارت بھی تمہیں چھو نہیں پائے گی۔'' ملک معظم کے ایک ایک لفظ سے بھائی کی محبت کا جذبہ جھلک رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں سے اُسے پکڑ کر اپنے' سب کے درمیان لا کھڑا کریں۔

''بھائی! اگر صرف میری ذات ہوتی تو میں اسے نظر انداز بھی کر دیتا لیکن آپ سب کے پاس آنا ہے' میں آپ کو کیسے نظر انداز کر دوں؟ کیسے......؟ میرے پاؤں کے ساتھ بھنور بندھے ہیں بھائی...... مصیبتیں' رسوائیاں میرے سائے سے چمٹی ہوئی ہیں۔ بہت سے داغ ہیں دھبے ہیں ان کی سیاہی کے چھینٹے آپ کے اُجلے بے داغ دامن پر نہیں دیکھ سکتا میں۔ جہاں میرے پاؤں پڑتے ہیں وہاں طوفان جنم لیتے ہیں۔ میں ان طوفانوں کو آپ لوگوں کی پُرسکون زندگی کا راستہ نہیں دکھا سکتا۔''

''غازی...... کوئی بات نہیں ہے آنے دو ان طوفانوں کو تمہارے بھائی ابھی اتنے کمزور نہیں ہوئے کہ ان طوفانوں کے ریلوں میں خار و خس کی طرح بہہ جائیں گے یا بے حقیقت پتوں کی طرح بکھر جائیں گے۔ یہ طوفان ہم سے ٹکرا کر خود اپنا راستہ موڑ لیں گے۔'' ملک معظم جذباتی لہجے میں بولے۔

''آپ کے اُجلے دامن کا کیا ہوگا بھائی؟ جس پر میرے گناہوں کی سیاہی کے بدنما داغ تمام آپ کو منہ چھپانے پر مجبور کر دیں گے۔''

''ہماری سفید پوشی' بھائی اور ماں کے جذبات' ان کی محبت سے زیادہ اہم تو نہیں۔ ہم چھینٹے ہی نہیں سیاہ لبادہ بھی پہن لینے کو تیار ہیں۔'' ملک معظم جیسے مصمم ارادہ کر چکے تھے کہ اُسے لاجواب کر دیں گے۔

''آپ جذبات میں آ کر بول رہے ہیں بھائی۔ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں ناں تو

زندگی بوجھ بن جاتی ہے۔ سانسیں شہ رگ پر خنجر کی طرح چلتی ہیں۔ جینا عذاب ہو جاتا ہے اور میں نے پچھلے پندرہ سالوں میں یہ عذاب بھوگا ہے۔ اس تلخی اس اذیت کا مجھ سے زیادہ تجربہ نہیں ہے آپ کو۔'' غیاث کے لہجے میں دُکھ ہی دُکھ تھا۔ کرب آشنائی اس کے ایک ایک لفظ سے عیاں تھی۔

''یہ تمہارے اپنے مفروضے ہیں غازی! تمہارا اپنا دل ہی مطمئن نہیں کہ تم ہم سے ملو۔ ہم سب کے درمیان رہو' ہمارے سامنے آؤ۔'' ان کی بات سن کر دوسری جانب پل بھر کو خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ اتنا دردناک تھا کہ ملک معظم کو اپنا دل دُکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا محسوس ہوا۔

''ہاں بھائی۔ یہ میرے مفروضے ہیں۔ پندرہ سال' جس ماں کی آغوش اور لمس کے لیے میں تڑپا' جسے یاد کر میری آنکھیں ایسے برستی رہیں جیسے انہوں نے کبھی خشک ہی نہ ہونا ہو۔ وہی ماں اب میرے سامنے ہے تو میں ملنا نہیں چاہتا۔ وہ بھائی جن کے ساتھ میں اپنا بچپن نہ گزار پایا' جن کے ساتھ کھیلنے' سکول جانے' ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے اور اماں سے کہانیاں سننے جیسے ننھے ننھے خواب دیکھے تھے۔ آج وہ بھائی میرے اتنے قریب ہیں کہ ہاتھ بڑھاؤں تو چھولوں لیکن اُن سے بھی میں ملنا نہیں چاہتا کیونکہ ان سب سے زیادہ اہم میرے مفروضے ہیں۔''

''تو پھر غازی ایسی کون سی کمزوری ہے جو تم ہم سے مل نہیں سکتے؟''

''کوئی کمزوری نہیں ہے بھائی! مجھے میرے ضمیر نے کمزور کر رکھا ہے۔ میں چاہوں تو پانچ منٹ سے کم اندر اندر آپ کے سامنے آ جاؤں۔ آپ سب سے ملوں' آپ کے ساتھ باتیں کروں۔ اپنی باقی ماندہ زندگی آپ کے درمیان گزاروں لیکن بھائی میرا داغ دار ماضی میرے ساتھ ساتھ رہے گا۔ میرے ضمیر پر میرے سیاہ اعمال کا بوجھ رہے گا۔ مجھے سونے کے لیے نرم مخملیں بستر تو میسر ہوگا لیکن ضمیر کی چبھن مجھے سونے نہیں دے گی۔ احساسِ جرم مجھ پر سانسیں تنگ کر دے گا۔ میرا دامن گناہوں کی سیاہی سے لتھڑا ہوا ہے بھائی۔ میں ایسی پُرسکون محبتوں بھری زندگی گزارنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں آ تو جاؤں گا آپ کے پاس' رہ بھی جاؤں گا آپ سب کے بیچ لیکن قطرہ قطرہ اندر سے مرتا رہوں گا۔ اب تک کی زندگی میں جو کچھ میں نے کیا۔ اس کی سزا مجھے ملنی چاہیے۔ میں پہلے وہ سزا بھوگوں گا۔ زندگی رہی تو باقی کے چار دن آپ کے ساتھ گزارنے کی سوچوں گا۔ ویسے زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اسی لیے ایک بار آپ سب سے بات کرنا ضروری جانا۔ اس لیے کہ اگر زندگی ختم بھی ہو جائے تو کم سے کم منوں مٹی تلے جاتے ہوئے یہ احساس تو سکون دیتا رہے گا کہ میرے کچھ اپنے ہیں۔ بے ریا...... بے لوث...... بے غرض محبت کرنے والے اپنے۔ کہ آج تک جس سے بھی واسطہ پڑا اُسی نے پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ ایسے میں اپنوں کے ہونے کا احساس ہی جاں فزاء ہوگا۔'' وہ کہہ رہا تھا

اوراس کا ایک ایک لفظ گویا ملک معظم کی سماعت کو چھیدتا ہوا ان کے ذہن پر نقش ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی نظریں سامنے صوفے پر ساکت بیٹھی مسز جلال پر ٹکی ہوئی تھیں جو اس طرح نڈھال نظر آ رہی تھیں جیسے اپنی زندگی کا کل سرمایہ کل متاع لٹ چکی ہوں۔ خالہ کلثوم اماں خالہ آمنہ اور ماہ نور ان کے پاس ہی موجود تھیں۔ ماہ نور کی نظریں ملک معظم پر تھیں لیکن ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات چکرا رہی تھی کہ اگر وہ.....غیاث سے کہہ دے.....اگر وہ غیاث سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ ان سب سے آ کر مل لے تو یقیناً وہ آ جائے گا۔ یہ اس کے دل میں چھپے جذبے تھے جنہیں غیاث پر مان تھا کہ جو اُس کی محبت میں جانے کب سے خاک چھان رہا تھا۔ اس کی کسی بات کو کبھی ٹال ہی نہیں سکتا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ ایک جھجک آڑے آ گئی۔

”پگلی کس رشتے سے.....؟ کس ناطے سے.....؟ کیا ہے وہ تیرا.....؟ کیا بتائے گی لوگوں کو۔“

وہ خود ہی اپنی پل بھر پہلے والی سوچ پر شرمندہ سی ہو گئی۔

”ٹھیک ہے۔ تم جو کہہ رہے ہو ہم مان لیتے ہیں لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک دن صرف ایک دن کے لیے تم آ جاؤ ہم سب کے پاس؟ ایک دن گزارو ہمارے ساتھ۔ تب تو تمہارا ضمیر کچھ نہیں کہے گا ناں۔ میں پوری زندگی کی بات نہیں کر رہا غازی۔ تم سے صرف تمہاری زندگی کا ایک دن مانگ رہا ہوں۔“ ملک معظم بولے تو ان کے لہجے میں یقین تھا اعتماد تھا کہ اب غیاث ان کی بات نہیں ٹال سکے گا۔ ایک دن کوئی بہت طویل مدت تو نہیں۔

”آپ اگر مجھے دیکھنا چاہتے ہیں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ کو چل کر میرے پاس آنا پڑے گا۔ میں خود نہیں آ سکتا۔“ اس کی بات سن کر ملک معظم کی آنکھوں میں امید کی جوت جاگ اُٹھی۔ ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ کھل گئی۔

”ٹھیک ہے.....تم بتاؤ کہاں ہو؟ ہم خود چل کر تمہیں ملنے آ جاتے ہیں۔“

”ابھی نہیں بھائی.....میں خود کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ایک آدھ دن صبر کر لیں سب کچھ خود بخود سامنے آ جائے گا۔ میری صورت دیکھنے کی آپ کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ بھائی.....موبائل شیری کو دیں۔ میں اُس سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔“ ملک معظم نے موبائل شیری کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود مسز جلال کے قریب بیٹھ گئے جن کی بھیگی آنکھیں اور اُترا ہوا چہرہ ان کے اندر کی متلاطم کیفیت کی عکاسی کر رہا تھا۔ شہسوار کے بعد اُس نے کچھ دیر خالہ کلثوم سے بات کی۔ پھر ماہ نور کی اماں سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ خالہ کلثوم نے موبائل ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے موبائل تھام لیا۔

”ہیلو.....غیاث بیٹا۔“ اماں کے لہجے میں ماں جیسی محبت در آئی تھی۔ شاید ذہن کے کسی

گوشے میں غیاث کا بچپن دکھائی دے گیا تھا یا پھر کچھ عرصہ قبل اس کا کیا ہوا احسان ان کے لہجے میں محبت بن کر اُتر آیا تھا۔ شاہین کی عزت بچا کر اُس نے ان کے خاندان بھر کو ذلت و رسوائی کے گہرے کنوئیں میں گرنے سے بچایا تھا۔

”خالہ جان.....آپ کو مجھ سے کچھ شکایتیں ضرور ہوں گی لیکن اُن میں میں کس قدر قصوروار ہوں یہ میں بعد میں واضح کروں گا۔ ابھی وقت کم ہے۔ آپ سے ایک دو ضروری باتیں کرنا تھیں۔“

”تو کرو ناں بیٹا.....خاموش کیوں ہو گئے؟ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے تو خواہ مخواہ دل پر بار مت لو۔ بولو.....کیا کہنا ہے تمہیں؟“ اماں نے نرم شائستہ لہجے میں اُسے مزید بولنے کا حوصلہ دیا۔

”شاہین میری بہنوں جیسی ہے۔ اسد کے ساتھ اس کی ساتھ شادی کا آپ کا فیصلہ بالکل درست ہے۔ اسد بے حد اچھا لڑکا ہے۔ یقیناً اس فیصلے پر آپ کو پچھتانا نہیں پڑے گا۔ آپ سے ایک التجا کرنی ہے۔ اپنے گھر کا دوسرا پھول ہمارے گھر کے آنگن میں کھلا دیجیے۔“ اماں غیاث کی بات سن کر حیران رہ گئیں۔

”کیا مطلب بیٹا.....؟ میں سمجھی نہیں۔“ اماں نے واقعی اس کی بات نہیں سمجھی تھیں۔

”راہین کو شہسوار کی امانت سمجھیں.....“ غیاث نے کہا تو ایک لمحے کو اماں خاموش سی ہو گئیں۔

”خالہ جان! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟“

”راہین.....اور شہسوار.....“ اماں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر ارد گرد موجود افراد کو کسی حد تک بات کی سمجھ آ گئی تھی۔ شہسوار نے انکھیوں سے راہین کی سمت دیکھا۔ وہ شرمائی شرمائی سی سمٹی سمٹی سی جیسے سب سے اپنا آپ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مسز جلال کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک لمحے کو خوشی کی ہلکی سی رمق ان کے دلِ مضطرب میں جاگی تھی۔ اماں کا جواب مثبت پا کر اُس نے چند لمحے مزید اماں کے ساتھ گفتگو کی۔ پھر اسد سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسد ان سب سے قدرے ہٹ کر دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اماں نے اسے آواز دے کر بلایا۔

”اسد بیٹا! غیاث تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ اسد نے آگے بڑھ کر موبائل اماں کے ہاتھ سے لے لیا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اُس نے خاموشی سے موبائل ماہ نور کی طرف بڑھا دیا۔

”آپی.....غیاث بھائی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”م.....مجھ سے.....مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟“ اتنے لوگوں کے درمیان وہ کچھ کنفیوز سی ہو گئی تھی۔ اسد کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ ماہ نور نے موبائل اس کے ساتھ سے لے کر کان سے لگایا۔

”ہیلو.....!“ اس نے جھجکتے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

جواب میں کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی۔ پھر نہایت نرم اور شائستہ آواز اُبھری۔

''کیسی ہیں آپ نور......؟''

''ٹھیک ہوں...... آپ...... آپ کیسے ہیں؟'' جھجکتے ہوئے ماہ نور بولی تو جواب میں وہ ہولے سے ہنس دیا۔

''کیسا ہونا چاہیے......؟ بہر حال ٹھیک ہوں میں بھی۔''

''آپ...... آپ گھر کیوں نہیں آ رہے؟'' ماہ نور نے وہی سوال کیا جو اس سے پہلے مسز جلالی' ملک معظم' خالہ کلثوم' اماں اور اسد پوچھ چکے تھے۔

''اس لیے نور کہ میرا آنا شاید ان سب کے لیے کوئی ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن جائے۔ میں جب تک ان سب سے دور ہوں۔ ان کی زندگیاں پُرسکون ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ وہ اسی طرح مطمئن زندگی گزارتے رہیں۔ اس لیے' محض اس لیے میں ان سے دور ہوں۔ ورنہ نور جس طرح وہ میرے لیے مچل رہے ہیں' میں بھی پندرہ سال ان کی جدائی سے تڑپا ہوں۔ لیکن میں اپنی تڑپ کو دیکھ کر خود غرضی کا مظاہرہ کیسے کروں؟'' اُس نے اپنے نہ آنے کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ بس ایک تمہید باندھی تھی جس سے نور نے کوئی مطلب اخذ نہیں کیا تھا۔

''لیکن وجہ تو آپ نے ابھی تک نہیں بتائی کہ آخر یہاں آنے میں کیا چیز مانع ہے؟ پلیز بتائیں تو سہی۔''

''میں نے وجہ کسی کو نہیں بتائی۔ تمہیں ضرور بتاؤں گا لیکن اس سے پہلے میں اپنے دل کی کچھ باتیں تم سے کرنا چاہتا ہوں اگر تم...... بُرا نہ مانو تو......'' غیاث کا لہجہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتا محسوس ہوا۔ جیسے اس کے ذہن میں یہ بات ہو کہ شاید ماہ نور اس کی باتوں کو مائنڈ کر جائے یا پھر شاید وہ اس کی باتوں کو مائنڈ نہ بھی کرے۔

''کہیے......'' ماہ نور نے دھیمے سروں میں کہا۔ جانے کیوں اس کا دل یکدم غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔ سانسیں گواہی دینے لگیں کہ ضرور وہ کوئی غیر معمولی بات کرنے والا تھا۔ کوئی ایسی بات جو اس کی دھڑکنوں کو ایک نیا عنوان دے دے یا پھر اس کی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ روشن کر دے۔ ماہ نور کی طرف سے اجازت پا کر غیاث ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ پھر اس کی آواز اُبھری۔

''نور...... بہت سی باتیں تو اسد نے بھی بتا دی ہیں آپ کو۔ مگر کچھ باتیں ان کہی ہیں۔ میں وہ سب باتیں جو ایک طویل عرصہ اپنے دل میں چھپا کر رکھیں۔ آپ کو بتا دینا چاہتا تھا لیکن کبھی ہمت ہی نہ ہوئی۔ مجھے آپ سے نہیں آپ کی عزت سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے ہمیشہ آپ کو ایک بہترین کردار کا حامل دیکھا۔ دوسری بات جو میں نے محسوس کی تھی وہ یہ تھی کہ مجھے دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ ناپسندیدگی کا تاثر اُبھرتا تھا۔ سو اس خوف سے کہ کہیں آپ مجھے دھتکار نہ دیں' میں نے کبھی آپ کی

سمت پیش قدمی کی ہمت ہی نہیں کی۔ آپ سن رہی ہیں ناں؟'' پل بھر کو رُک کر اس نے سوال کیا۔

''جی...... سن رہی ہوں...... آپ کہیے!'' ماہ نور نے کنکھیوں سے اردگرد دیکھا۔ تقریباً وہاں موجود سبھی افراد اسی کی جانب متوجہ تھے۔ ملک معظم گہری نگاہوں سے اس کے چہرے پر پھیلتے سمٹتے رنگوں کو دیکھ کر کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''نور...... میں نے کبھی خود کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ آپ سے آپ کو مانگ سکوں۔ اسی لیے جب اسد نے آپ کو میرے بارے میں بتایا تو میں نے اُسے ڈانٹا بھی اور اس سے ناراض بھی ہوا لیکن اُس نے بتایا کہ آپ سے جو باتیں بھی اُس نے کیں۔ آپ نے ان باتوں کا بُرا نہیں مانا لیکن پھر بھی میرے دل نے کسی خوش فہمی' کسی امید کا دامن نہیں تھاما۔ اسد نے بتایا تھا کہ آپ کا رویہ مثبت ہے۔ اُس وقت میں نے سوچا تھا کہ میں شاید اب تک مفروضوں پر قائم رہا لیکن ذہن میں یہ سوچ اُبھری کہ یہ بھی تو ممکن تھا کہ اگر میں پہلے آپ سے یہ کہتا تو آپ کا جواب' آپ کا رویہ کچھ اور ہوتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' غیاث نے پوچھا۔

''آپ آگے کہیے!'' ماہ نور اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ آج اس کے سینے میں مدفون تمام راز اگلوانا چاہتی تھی۔

''نور...... آنکھوں میں کسی کا خواب سجا لینا یا کسی کو دل میں بسا لینا آسان ہوتا ہے لیکن اس کے سامنے اپنے ان جذبوں کا اظہار بہت مشکل۔ میں اس مشکل کو آسان نہ کر سکا اور یہ کام اسد نے کر دیا۔ تو میری باتیں آپ کو بُری تو نہیں لگ رہیں......؟ خدا اگر ایسی بات ہے تو بتا دیجیے میں مزید کچھ نہیں کہوں گا۔'' غیاث کے لہجے میں اضطراب گھلا ہوا تھا۔

''نہیں...... مجھے آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں۔'' ماہ نور نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''میری یہ تمہید باندھنے اور اتنی تفصیل سے بات کرنے کا مقصد اور محرک صرف یہ ہے کہ آئندہ زندگی میں شاید پھر کبھی بات کرنے کا موقع نہ مل سکے یا زندگی ہی وفا نہ کرے۔ اس لیے میں ہر بات پوری سچائی اور دیانتداری کے ساتھ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں تاکہ ذہن میں کوئی خلش' کوئی کسک باقی نہ رہے۔'' چند لمحوں کے لیے غیاث خاموش ہوا تو لاشعوری طور پر ماہ نور کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی غیاث کوئی بہت بڑی بات کرے گا۔

''نور......! کچھ اُلجھنیں آپ کے ذہن میں ہوں گی اور کچھ بوجھ میرے دل و دماغ پر بھی ہے۔ میں یہ بوجھ بھی سر سے اُتار پھینکنا چاہتا ہوں تاکہ باقی کی سانسیں کچھ سکون کی ہوں۔ روح کی صلیب پر نہ لٹکتی رہے۔ جب اپنے گناہ کا' اپنے جرم کا اعتراف کر لیا جائے...... اعتراف...... اور وہ بھی کسی بہت اپنے کے سامنے تو ضمیر کی گرفت قدرے ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور میں اپنے گناہوں کا' اپنے

جرائم کا اعتراف آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس جسارت کی اجازت دیں گی؟'' غیاث کے لہجے میں ایک تڑپ تھی' ایک سوال تھا' اضطراب' امید اور ایک التجا تھی۔ اس کے لہجے میں کتنے ہی رنگ آ گھلے تھے۔ ماہ نور اس کی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اُس نے کچھ اُلجھن آمیز انداز میں کہا۔

''میں سمجھ نہیں پائی! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟ کون سے گناہ' کون سے جرائم کی بات کر رہے ہیں آپ؟ صاف صاف بتائیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی' گہری خاموشی۔ پھر اُس نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''میرا پہلا گناہ' میرا پہلا جرم سیٹھ حبیب الرحمٰن! میرا دوسرا گناہ' دوسرا جرم میڈم نغا مالی! تیسرا گناہ چار لاکھ اور فلیٹ کی چابی! چوتھا جرم عامر' ارشد اور امجد کی موت!'' لفظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ جو اس کے کانوں کے راستے سارے وجود میں سرایت کر کے اس کی روح تک جھلسا گیا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ چمکتی ہوئی آنکھوں میں جوت ماند پڑ گئی۔ چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ اردگرد موجود افراد نے اس کے چہرے سے مترشح تاثرات کو جانچ لیا تھا اور اب وہ یہ جاننے کو بے چین تھے کہ اصل حقیقت حال کیا تھی۔ ماہ نور کے وجود پر ایک جامد چپ نے حصار باندھ دیا تھا۔ موبائل کانوں سے لگائے وہ یوں ساکت بیٹھی تھی کہ اگر ذرا سی بھی جنبش کی تو جانے کتنے بڑے حادثے کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ غیاث اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا۔

''بہت سمجھایا تھا ان تینوں کو...... بہت روکا تھا لیکن جانے کیوں نہیں سمجھ آئی انہیں۔ نہیں باز آئے اپنی حرکتوں سے اور میں برداشت کی کڑی منزلوں پر پہنچ چکا تھا۔ اس سے آگے صبر کا یارا نہ رہا اور وہ تینوں میرے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گئے۔'' اس کے سرد لہجے میں جیسے سارے جہان کی کرختگی سمٹ آئی تھی۔

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......؟ وہ...... وہ سب کچھ تو بلیک مین نے '' ماہ نور کی بات اُدھوری تھی۔ پرت پرت جیسے حقیقت کھل رہی تھی۔ روشنی سی ہو رہی تھی اور ہر چیز واضح نظر آنے لگی تھی۔ کتنے رُخ' کتنے روپ تھے اس شخص کے۔ کون سا روپ اصل تھا اور کون سا بہروپ۔ وہ جان نہیں پا رہی تھی۔

''نور...... میری زندگی کا یہی رُخ تو آڑے آ گیا جو میں آپ سب کے سامنے نہیں آ سکتا۔ بہت سے گناہوں کی سیاہی ہے ان ہاتھوں پر۔ یہ ماں کے مقدس آنچل' اس کے پاکیزہ قدموں کو چھونے کے قابل نہیں ہیں۔ نور میں تو خود کو آپ کی محبت کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔ نہ ہی آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں۔ بس کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ بہت لمبا سفر ہو اور تم...... صرف تم میرے ساتھ

پھر کتنے خار چبھیں' کتنے آبلے پھوٹیں' میں انہیں تمہاری آنکھوں کی چمک کے آگے ماند سمجھوں۔ بس تم ہو جو میری راہ کو روشن کر دو۔ میں نور میں نہا جاؤں' ذرے سے آفتاب ہو جاؤں۔'' وہ جذبات کی شدت میں آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ ماہ نور دم سادھے سنے جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ یہ ہونٹ ایک سوال اُچھالتے رہیں اور وہ اس کی آواز کے طلسم سے اپنی سماعت کا پیالہ بھرتی رہے۔ کہیں کوئی شور نہ ہو۔ پھر ایک آواز گونجے۔

''میں ہوں نا تمہارا۔ پورے کا پورا تمہارا۔'' دل تو بس اس اقرار پر ہی مر جایا کرتا ہے۔ اسے اس سے پہلے جینے کی ہوک ہوتی ہے۔ اس لمحہ خوش آگیں کے بعد جینے کی ہوس۔ زندگی بس وہی لمحہ بن جایا کرتی ہے۔ محبت قطرہ قطرہ زندگی بن کر اس میں گرنے لگی۔ جیسے اس کا وجود کوئی صحرا ہو اور بھولا بھٹکا بادل قطرہ قطرہ دعا کے عوض خاک پر گرے۔ خاک ہو جائے پیاس پیاس پکارنے لگے۔

''نور...... تم بولو ناں کچھ ایسا جس میں تم نظر آؤ' تم جھلکو۔''

''میں...... میں کیا بولوں؟'' ماہ نور جھجکتے ہوئے بولی۔ سارے وجود کا خون جیسے اس کے چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ اسے لگا اردگرد موجود بھی ان دونوں کی بیچ کی گفتگو سن رہے ہیں۔ وہ سب سے اپنا آپ چھپانے کی کوشش میں خود میں سمٹنے لگی۔

''نور...... کچھ سیاہیاں ہم خود اپنے بھاگوں میں لکھ لیتے ہیں۔ پھر زندگی بھر انہیں اچھائی کے سبز رنگ سے دھونے کے باوجود روح کے لباس پر سے ان کے دھبے نہیں جا پاتے۔ میرے وجود پر بھی جرم و گناہ کے ایسے بے شمار داغ ہیں جو ابھی مجھے دھونے ہیں۔ زندگی رہی تو عمر کے توشہ خانے سے چند سانسیں چرا لوں گا تمہاری خاطر۔ نور پتہ نہیں...... یہ زندگی کیا ہے۔ زندگی...... زندگی اگر آنکھ ہے تو میرے لیے اس میں سوائے انتظار کے کچھ نہیں تھا۔ خواہش کی دہلیز پر جمی آنکھ' ایک ساعت محبوب کی صورت کے بصرت سے لپٹی اور ہجر کے سم سے مرتی آنکھ' ایک بار دیکھ کر پھر ساری عمر اسی منظر سے جی بڑھاتی' اسی منظر میں رنگ بھرتی آنکھ!

کہاں پہ جا کے رُکیں گے یہ بھاگتے ہوئے دن
یہ گرد بادِ تمنا میں گھومتے ہوئے دن
تمام عمر میرے ساتھ ساتھ چلتے رہے
تجھے پکارتے' تجھ کو تلاشتے ہوئے دن''

ماہ نور کے ایک دوسرے میں پیوست لب کانپ گئے۔ اس نے ایک نظر اردگرد دیکھا۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ لفظ اس کے اندر بن ادا ہوئے مرنے لگے ہیں۔

''نور...... کچھ کہو...... تم خاموش کیوں ہو......؟''

"کیا کہوں.....؟" اُس نے بے بسی سے پوچھا۔

"کچھ اچھی باتیں..... جو زادِ راہ ہوں اور جن سے عمر کا تنہا سفر آسانی سے گزر جائے۔" غیاث کی بات سن کر اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

"تو کیا آپ..... آپ اب کبھی بھی....." لفظ جیسے ٹوٹ کر اس کے اندر بکھر گئے تھے۔ وہ جملہ پورا نہ کر سکی۔ اُسے لگا اس کا سارا وجود آنکھ بن گیا ہے۔ ایسی آنکھ جس کا تم شام کے رنگ میں ایسے ملتا کہ نکھر جاتا۔ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے وہ کاسہ بدست فقیر ہے جو دنیا کی ہوک بھر کے نکلے۔ مانگ نہ سکے تو اس کے خالی کاسے میں لوگ خالی خولی تسلی شکن حوصلے کے سکے اُچھالیں۔ دوسری طرف شاید غیاث نے رابطہ ختم کر دیا تھا۔ ماہ نور کی پلکوں پر ٹکی نمی آنسوؤں میں ڈھل کر رخساروں کو تر کرنے لگی تھی۔ اس نے موبائل ملک معظم کی طرف بڑھا دیا۔ سب افراد پریشان سے صورتِ حال دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جہاں چہار سو خوشیاں ہی خوشیاں تھیں' ہر چہرے پر کھلتی مسکراہٹ میں بہاروں کی ساری تازگی کے سمٹ آنے کا گمان ہو رہا تھا۔ وہاں اب اُداسی کی ساحرہ نے اپنی سیاہ گھور چادر پھیلا کر ماحول کی ساری کھلکھلاہٹوں کو اپنی تیرگی میں چھپا لیا تھا۔

☆..........☆..... .....☆

رات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ چوہدری الیاس اور سرفراز علی مردان خانے میں شطرنج کھیلنے میں مصروف تھے۔

"دیکھیے چوہدری صاحب! اپنے بادشاہ کو بچا لیجیے اگر بچا سکتے ہیں تو' میرے فیل کی زد میں ہے۔" سرفراز علی مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارے ایسی کی تیسی تمہارے فیل کی! یہ لو....." چوہدری نے ایک خانہ بادشاہ کو چلا دیا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں..... چوہدری جی نے وزیر کو مات دے دی۔" سرفراز علی مسکرایا۔

"بڑی بُری چال چلے ہو تم سرفراز علی! تمہاری یہی عادت تو پسند ہے مجھے کہ ایسی جگہ سے وار کرتے ہو جس طرف انسان کا ذہن تک نہیں جا سکتا۔ کھیل تو تم نے آدھا ختم ہی کر دیا۔"

اسی دم فون کی بیل بج اُٹھی۔ چوہدری نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔

"ہیلو....."

"بلیک مین.....!" دوسری جانب سے تعارف کروایا گیا۔ چوہدری کے چہرے پر خشونت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ آنکھیں کھنچ گئیں۔

"کہو..... کیا بات ہے؟"

"اپنے سوال کا جواب چاہیے تھا مجھے۔ چوبیس گھنٹے پورے ہو چکے ہیں۔"

"کون سا سوال.....؟ اچھا ملک جلال اور اس کے خاندان سے متعلق....." چوہدری کو جیسے یاد آ گیا تھا۔

"بتائے دیتا ہوں..... ملک جلال کے ساتھ میری ملاقات سرفراز کے گھر پر ہوئی تھی۔ یہ اپنا پرانا یار بیلی تھا۔ سو اس کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ پھر ملک جلال کے شوق بھی کچھ ہمارے ہی جیسے تھے۔ شراب و کباب' شباب کی محفلیں۔ یوں اس کے ساتھ بھی ہمارا کچھ دوستانہ ہو گیا۔ پھر ایک بار سرفراز کے گھر کسی تقریب میں ملک جلال' اپنی بیوی کے ہمراہ آیا۔" چوہدری سانس لینے کے رُکا تھا یا پھر شاید ماضی میں جھانکتے ہوئے اُس منظر کی جزئیات کو یاد کرنے لگا۔

"پھر.....؟" بلیک مین نے اس کی توجہ دوبارہ سے اس موضوع کی طرف مبذول کروائی۔

"اس کی بیوی بڑی ہی خوبصورت اور طرحدار عورت تھی۔ میں نے سب کے سامنے اس کی تعریف کر دی۔ تم تو جانتے ہو کہ ہمارا مزاج کچھ عاشقانہ ہے۔ عورت کی تعریف کی جائے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی۔ پر اس عورت کو اپنے اوپر کچھ زیادہ غرور تھا۔ اس نے ملک جلال سے شکایت کی اور اُس نے بھری محفل میں میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اُس محفل میں بہت بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے تھے جن کے درمیان میری عزت تھی' وقار تھا۔ سب خاک میں مل گیا۔ آج تک میں اس تذلیل کو نہیں بھول سکا۔" چوہدری کے لہجے میں تپش نکلنے لگی تھی۔

"ٹھیک چوہدری صاحب! اس کا بدلہ تو آپ نے لے لیا تھا۔ ملک جلال کا خاندان تو تباہ ہو ہی چکا تھا۔ پھر..... پھر اب دوبارہ اس خاندان کو تختۂ مشق بنانے کی وجہ کیا ہے؟"

"بلیک مین! تم نہیں سمجھو گے' ہم جیسے لوگ قبر تک انتقام لیتے ہیں' اپنے دشمن کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ چاہے بدلہ لینے میں عمر بیت جائے' لے کر رہتے ہیں۔ پھر میں یہ کیسے برداشت کر لوں کہ جس شخص نے میری بے عزتی کی۔ اس کا خاندان عزت و رتبے میں میرے برابر آ جائے۔" چوہدری کے لہجے میں حسد کی بو آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب! آپ کی مرضی..... بہرحال میرے نزدیک تو یہ بات غیر اخلاقی ہے۔" بلیک مین نے کہا۔

"دیکھو بلیک مین! جنگ اور محبت میں سب جائز ہے اگر اخلاقیات کو دیکھا جائے تو پھر مخالف کے حملے سے بچاؤ ممکن نہیں ہوتا۔ جہاں تم کمزور پڑو گے' مخالف کا کاری وار تمہیں ختم بھی کر سکتا ہے۔" چوہدری ایک شاطر آدمی تھا۔ ہر چال چلنے کا اور مات دینے کا فن جانتا تھا۔

"اب بتاؤ..... کیا فیصلہ ہے تمہارا؟" چوہدری الیاس نے پوچھا۔

"میں ملک معظم کو بے قصور سمجھتا ہوں۔ اس لیے پیسوں کی خاطر میں اُسے کوئی نقصان نہیں

پہنچاؤں گا۔'' بلیک مین نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے...... خدا حافظ۔'' چوہدری نے فون بند کر دیا۔

''کیا کہہ رہا تھا بلیک مین......؟'' سرفراز نے پوچھا۔

''اس شخص کی آخری خواہش بھی پوری کر دی میں نے۔ دن گن رہا ہے۔ جلد ہی جان جائے گا موت کا کیا ذائقہ ہوتا ہے؟'' چوہدری کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک تھی اور ہونٹوں پر کرخت سی مسکراہٹ۔ سرفراز علی بھی اس کی بات سمجھ کر ہنس دیا۔ ان لوگوں کے لیے بھلا انسانی جان کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی جو زندگیوں کو روپوں کے عوض خریدتے اور بیچتے تھے۔

☆..........☆..........☆

انہوں نے فائل بند کی...... قلم ہولڈر میں لگایا اور ریوالونگ چیئر کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کل رات غیاث کے فون کے بعد ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ منگنی کی رسم بھی کچھ بے دلی سے ادا کی گئی۔ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد بھی رات گئے تک گھر کے افراد مسز جلال کے کمرے میں جمع رہے جو کچھ ہوا تھا' ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تمام رات سب کے کمروں کی روشنیاں جلتی رہیں' کوئی بھی سو نہیں سکا تھا۔ ملک معظم صبح آفس چلے آئے تھے لیکن ذہن میں اُلجھنوں کا ایک بحرِ بیکراں تھا۔ ان کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی اُداسی اور پژمردگی کا شکار تھے ان کے تمام احساسات۔ کچھ دیر یونہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد انہوں نے چپڑاسی کو بیل دے کر بلایا اور اُس سے بلیک کافی لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد بلیک کافی کے ساتھ ساتھ اخبار بھی آ گیا۔ انہوں نے کافی کا مگ میز پر رہنے دیا اور اخبار اُٹھا لیا۔ اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے اچانک ایک سرخی پر ان کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ کرسی پر سیدھے ہو بیٹھے۔

''کل رات چوہدری الیاس کو ان کی حویلی میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے ہمراہ سرفراز علی جو کہ حال میں ایک طویل عرصے بعد لندن سے پاکستان سیٹل ہوئے تھے اور چار سکیورٹی گارڈز کی لاشیں پائی گئیں۔ قاتل نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ قاتل وہی بدنامِ زمانہ گینگسٹر ہے جو ایک طویل عرصے سے بہت سارے جرائم میں ملوث رہا اور پولیس کے لیے معمہ بنا رہا۔ جرم کی دنیا میں وہ بلیک مین کے نام سے جانا جاتا ہے جبکہ عام زندگی میں وہ غیاث کے نام سے محلہ شاہو گڑھی میں پچھلے چھ سال سے سکونت پذیر رہا۔'' خبر تھی یا کوئی تیز دھار دہکتی ہوئی سلاخ تھی جو ان کے دماغ کے اندر اُتر گئی تھی۔ ان کی آنکھوں کے آگے پل بھر کو سیاہ دھند کی دبیز چادر تن گئی۔

''تو یہ بات تھی غازی...... جو تم بتا نہیں رہے تھے...... لیکن میں تمہیں یہ کڑی سزا بھگتنے نہیں دوں گا۔ میں اپنی ذات بیچ کر بھی تمہاری زندگی کی سانسیں خرید لوں گا۔ تمہیں ہمارے پاس آنا ہے ہر

قیمت پر۔ جو طوفان تمہیں اپنی لپیٹ میں لینے کو بڑھا آ رہا ہے ناں میں اُس سے ٹکرا جاؤں گا مگر تمہیں اس کے حوالے نہیں کروں گا۔'' ملک معظم کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ابھی تک یہ خبر گھر والوں کو نہیں ملی ہو گی۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے ٹیبل کی دراز سے گاڑی کی چابی نکالی۔ ذہن میں گزرے کل کا ایک ایک لمحہ روشن ہو گیا۔

''بھائی ...... دیکھیں ناں چڑیا کا بچہ پنکھے سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ اس کی بینڈیج کریں ناں۔'' خوبصورت مخمور سیاہ آنکھوں میں نمی لیے وہ چڑیا کا گھائل بچہ ہاتھ میں لیے ان کے پاس کھڑا تھا۔

''غازی ...... کیا حماقت ہے......؟ کیسے بینڈیج کروں اس کی؟ یوں بھی یہ ختم ہو جائے گا ایک دو منٹ میں۔'' اس نے بے توجہی سے کہا اور دوبارہ ہوم ورک کرنے میں لگ گیا۔

''لیکن بھائی جب تک یہ زندہ ہے تب تک تو اسے کچھ سکون ملے گا ناں۔'' اس کی بات سن کر وہ مجبور ہو گیا تھا اور اُس نے اُس ننھے سے چڑیا کے بچے کی مرہم پٹی کر دی تھی اور آج وہی بچہ وہی غازی قاتل تھا۔ کئی افراد کی ہنستی مسکراتی زندگیوں کو تہہ خاک کر دینے والا' معاشرے کا' انسانیت کا مجرم' جانے کتنی عورتیں بیوہ ہوئیں' کتنے بچے یتیم ہوئے' کتنی آنکھیں اشکبار ہوئیں' اس کے پستول سے نکلنے والی اندھی گولیوں نے جانے کس کس کی سانسوں کو چاٹا ہو گا۔'' ملک معظم کا دل دُکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا لیکن اس سب کے باوجود وہ ان کا بھائی بھی تو تھا۔ وہ سب کا مجرم ہو گا لیکن ان کے تو وجود کا حصہ تھا۔ انہوں نے پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالی اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے مل کی پیچ در پیچ عمارت سے باہر لے آئے۔ ان کا رُخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا جہاں ان کا بھائی' ان کا غازی...... جانے ان کا منتظر تھا یا شاید نہیں تھا۔ پھر بھی ان کا دل اس کے دیکھنے کو تڑپ رہا تھا۔ ان کی ایک ایک سانس اس کے لیے دعا گو تھی۔ اُسے کچھ نہیں ہونا چاہیے' اس کی سانسوں کے ساتھ کے ماما کی سانسیں جڑی ہوئی ہیں۔ یا اللہ تو اس مشکل وقت میں میری رہبری فرما۔ وہ تھانے پہنچے تو تھانے میں اچھی خاصی گہما گہمی تھی۔ چند پریس والے بھی موجود تھے وہ اس تاک میں تھے کہ کوئی نئی بات ملے تو وہ اسے اخبار کی سرخی بنا سکیں۔ تھانے میں کئی سینئر آفیسر موجود تھے۔ ایک ایسا مجرم جو ایک طویل عرصے سے پولیس کے لیے چیلنج بنا ہوا تھا۔ اس کا تازہ ترین چھ قتل کر کے ازخود' خود کو پولیس کے حوالے کر دینا تہلکہ خیز بات تھی۔ پچھلے کئی برسوں سے مسلسل کوششوں کے باوجود پولیس والے اس کی خاکِ پا تک نہیں پا سکے تھے۔ وہ ایسا ہی شاطر اور بیدار حواس کا مالک تھا کہ آج تک اُس نے اپنے پیچھے کوئی ثبوت چھوڑا ہی نہیں تھا اور آج اس نے ازخود تمام ثبوت پولیس کو فراہم کر دیئے۔ ملک معظم نے بڑی کوشش کی کہ وہ کسی طرح ایک بار بلیک مین سے مل لیں مگر انہیں روک دیا گیا۔ آفیسران کا کہنا تھا انہیں شبہ ہے کہ اس کے پیچھے پورا گینگ ہے۔ اسے قتل کرنے کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے تا کہ یہ

گینگ کے متعلق کچھ اُگل نہ دے۔ لہٰذا وہ کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتے۔ ان کے پاس اوپر سے آرڈر تھے کہ بلیک مین سے کسی بھی شخص کو ملنے نہ دیا جائے۔ ملک معظم بلیک مین سے ملنے کے لیے تین دن تک بھاگ دوڑ میں رہے۔ انہوں نے ایک ایڈووکیٹ کو ساتھ لے کر بھی بلیک مین سے ملنے کی کوشش کی مگر آفیسرز ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ان کا کہنا تھا...... کہ ہمیں اوپر سے اجازت نہیں اور وہ اس معاملے میں کسی بھی قسم کا رسک نہیں لے سکتے۔ تیسرے دن شام کو ان سے کہہ دیا گیا کہ اگلے دن بلیک مین کو عدالت میں پیش کیا جانا ہے۔ وہ چاہیں تو وہیں اُس سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ ہم ملاقات کی اجازت دینے کے مجاز نہیں اور ملک معظم لوٹ آئے۔ غیاث کے لیے انہوں نے فہیم حسن جیسے قابل اور زیرک وکیل کو ہائر کر لیا تھا۔ فہیم حسن نے تمام کیس کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ملک معظم سے صاف صاف کہہ دیا کہ غیاث کے بچنے کی چانسز بہت کم ہیں لیکن میں اپنی تمام تر کوشش کروں گا کہ اسے کم سے کم سزا ہو۔ ان تین دنوں میں ملک معظم کے اعصاب بُری طرح تھک چکے تھے۔ گھر کا ماحول ویران ویران سا تھا۔ ماہ نور نے مسز جلال کو بتا دیا تھا کہ غیاث نے اس کے ساتھ کیا باتیں کیں۔ غیاث نے ایک نہیں کئی قتل کیے ہیں۔ یہ سننے کے بعد وہ بُری طرح بیمار پڑ گئی تھیں۔ شہسوار اور اسد ملک معظم کے ساتھ بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔ کل کا دن ان سب کے لیے فیصلہ کن تھا۔ مسز جلال کی لڑکھڑاتی زبان پر ایک ہی دعا کا ورد جاری تھا۔

''یااللہ! میرے غازی کو مجھے لوٹا دے...... میری ممتا کا اور کتنا صبر آزمائے گا......؟ کتنے امتحان باقی ہیں ابھی......؟ تجھے سانسیں ہی چاہئیں ناں! تو کیا ضروری ہے کہ وہ حرماں نصیب غازی کی ہی ہوں! تو میری جان لے لے مولا اسے کچھ نہ ہو۔'' مسلسل گریہ وزاری سے ان کی آنکھیں متورم اور سوج گئی تھیں۔ انیکسی کا ماحول بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔

اماں کا دل مسز جلال اور غیاث کے لیے دعائیں کرتے نہ تھک رہا تھا اور نور...... کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کے دل کا کیا حال ہے!

''اے محبت! تو کتنی بدذات ہے! پندارِ نفس کو توڑ پھوڑ کر فقیر کر دیتی ہے۔ ایک سکّہ، اپنی چاہ کا ایک سکّہ...... ایک کرن...... تہی داماں فقیر جس پر جیون ہار دے۔''

وہ جانتی تھی کہ اس کے دل نے بے منزل کے مسافر کی چاہ کی ہے وہ شخص اس کا کچھ نہیں تھا۔ چند باتیں ہی تو کی تھیں اُس نے۔

ایسے ہی جیسے کوئی مسافر شب بسر کرنے کو کہیں پڑاؤ ڈالے۔ اُس نے اسے بھی پڑاؤ سمجھا۔ جوگی منش یا کسی بنجارے کا پڑاؤ مگر جہاں آگ دہکی جہاں آس جلی جہاں رات نے نیند سے سپنے

بنے، شگن اُٹھائے، منت مانی اس پڑاؤ، اس جگہ کا دُکھ کون پائے اور بس یہ دُکھ وہ پا گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں نمی تیر جاتی۔ ہر دُکھ کی پہلی کسک تکلیف دیتی ہے، تڑپاتی ہے، وقت گزرتا ہے تو اس دُکھ پر وقت کی گرد جمتی چلی جاتی ہے۔ وہ بھی اس پہلے دُکھ کی تازہ تازہ کسک سے ادھ موئی سی ہو گئی تھی۔ وہ جان گئی تھی یہ کسک تا عمر اس کے سنگ سنگ رہنی ہے۔

''کاش ہم لوگ کسی ناول کے کردار ہوتے تو کوئی ہمارے من چاہے انجام لکھتا، ہمارے من چاہے انجام جن میں ہجر نہیں ہوتا۔ مسافت بے انت مسافت سے کانٹے نہیں چبھتے، پیروں میں کوئی آبلہ نہیں پھوٹتا اور صرف خوشی مقدار ہوتی۔ کہانی کے آخری پیراگراف میں تقدیر سے بچ کر اپنی مرضی سے کوئی کہانی کار سب اچھا ہے کا خواب بنتا۔ درد نہ ہوتا، نہ جوکھم کی محبت۔ میں اور غازی اور ہم جیسے اور محبت کرنے والے سب۔ محبت میں دیوار گریہ کے سوا کچھ نہیں۔ جہاں محبت سر پٹخ پٹخ کر روتی ہے۔ محبت کی سرزمین پر صرف دُکھ کی فصل اُگتی ہے لیکن محبت کے بیج بو کر ہر دل گلاب موسموں کا منتظر ہوتا ہے۔ جانے کیوں محبت ہر دل کو خوش فہمیوں کے دھوکے میں رکھتی ہے۔ کسی اچھے اور ہر کہانی کے انجام سے بہت مختلف انجام ہونے کے خواب دکھاتی ہے۔''

ماہ نور کے اندر جیسے خاموشی سی بھر گئی تھی۔ آج غیاث کو عدالت میں پیش کرنا تھا۔ ملک معظم کے ساتھ ساتھ گھر کے کچھ افراد بھی عدالت جا رہے تھے۔ ابھی جج نہیں آیا تھا۔ مسز جلال کی نگاہیں غیاث کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائیں۔ اسے یوں اپنے ناتواں بازوؤں میں چھپا لیں کہ پھر زمانے کی سرد و گرم ہوا تک اس کے لمس سے محروم رہ جائے لیکن بے بسی ان کے پاؤں میں زنجیر بنی ہوئی تھی۔ غیاث نے پل بھر کو نگاہیں اُٹھا کر اُن سب کو دیکھا تھا۔ وہ جو اس کے اپنے تھے، جن کے ساتھ جینے کے، جن کے سنگ رہنے کے خواب دیکھے تھے اُس نے۔ وہ سامنے اس کی ماں کھڑی تھی جو پندرہ سال اس کی آنکھوں میں خواب بن کر رہی تھی اور اب جب تعبیر کی صورت سامنے موجود تھی تو وہ اسے پا نہیں سکتا تھا۔ اپنے بھائیوں کی طرف دیکھ کر ایک لمحے کو اُس کی دھڑکنوں نے جیسے بغاوت کی تھی۔ خون میں جوش پیدا ہوا۔ بازو انہیں خود میں سمونے کو مچلے لیکن وہ آزاد نہیں تھا۔ لوہے کے زیور سجے تھے اس کے وجود پر۔ پھر نگاہ بھٹکی...... اٹھارہ سال جس کی محبت کو امانت سمجھ کر دل میں چھپائے رکھا۔ آج اس کی آنکھوں میں محبت کی جوت جلتی دکھائی دے رہی تھی لیکن وائے ری قسمت۔

مرے دل سے لے کر ترے سنگ دل تک
گماں کی چٹان اور حقیقت کی سل تک
جو آنکھوں سے میری ترے کالے تل تک

بنا تھا محبت کی مکڑی نے جالا
زمانے کے ہاتھوں نے وہ تارِ اُلفت
یہاں سے وہاں تک سبھی نوچ ڈالا

ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے مجروح لبوں کو چھوگئی۔ جج آ گیا تھا۔ غیاث کو کٹہرے میں بلالیا گیا۔ وکیل استغاثہ نے ایف۔ آئی۔ آر اور غیاث کے بیان کی کاپی جج کے سامنے پیش کر دی۔ بارہ قتل کوئی معمول بات نہیں تھی اور ان تمام قتلوں کا اقبال اُس نے خود کیا تھا۔

''جج صاحب! ہمارے مذہب میں کہا گیا ہے ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ یہ شخص جو اس وقت کٹہرے میں کھڑا ہے۔ بارہ انسانوں کی زندگیاں اس کے ہاتھوں خاک تلے جا سوئیں۔ یہ شخص کسی رو رعایت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ میری درخواست ہے کہ اس مجرم کو کم سے کم تین بار پھانسی کی سزا سنائی جائے۔'' وکیل استغاثہ نے اپنی جرح مکمل کرنے کے بعد جج کو تجویز دی اور اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ایڈووکیٹ فہیم حسن غیاث کے کٹہرے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

''جس وقت تم اپنی ماں' اپنے خاندان سے بچھڑے تھے اس وقت کیا عمر تھی تمہاری؟'' انہوں نے اُس سے سوال کیا۔

''تقریباً نو سال......''

''تمہارے والد تمہارے ساتھ رہتے تھے؟''

''جی ہاں!''

''کیا وہ نشے کے عادی تھے؟''

''جی ہاں......! وہ بہت زیادہ نشہ کرتے تھے۔ نشے کی زیادتی سے انہیں پھیپھڑوں کا کینسر ہوا تھا۔''

''یور آنر...... پروسیکیوٹر صاحب نے میرے مؤکل کو تمام انسانیت کا قاتل قرار دیا۔ بجا! لیکن میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک نو سال کا بچہ جو گھر اور ماں سے جدا ہو گیا۔ وہ عمر جس میں بچے کے جذبات و احساسات' اس کی شخصیت کی تعمیر ہو رہی ہوتی ہے۔ اُس عمر میں جو بچہ گھریلو ماحول سے دور سڑکوں' ہوٹلوں میں کام کرے' لوگوں کی گاڑیاں صاف کرے' اخبار بیچے' سارا دن محنت مزدوری کر کے جب گھر واپس جائے تو اس کی خون پسینے کی کمائی وہ چند نوٹ باپ اپنے نشے کی خاطر چھین لے۔ فاقے جس کا مقدر کر دیے جائیں وہ بچہ چور نہیں بنے گا تو اور کیا بنے گا؟ وکیل استغاثہ نے بہت آسانی کے ساتھ میرے مؤکل کے لیے سزا بھی تجویز کر دی لیکن کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت جو مجرم کٹہرے میں کھڑا ہے کیا یہ پیدائشی مجرم ہے؟ اسے اس حد تک لانے کا ذمہ دار کون ہے؟ آپ' میں' معاشرہ اور یہ نام نہاد انسانیت؟ اُس وقت یہ انسانیت کہاں تھی سر جب یہ بچہ تین تین دن

تک بھوکا پیاسا محنت مزدوری کرتا تھا؟ کیا کسی نے اسے دو وقت کی روٹی دی؟ کسی نے اس کا تن ڈھانکا؟ کسی نے سر پر سائبان کرنے کی کوشش کی کہ حالات کی تیز دھوپ میں جھلسا ہوا اس کا وجود چند لمحوں کو سکون پا سکے؟''

''آبجیکشن یور آنر! وکیل صفائی جذباتی باتیں کر کے خواہ مخواہ ایک خطرناک مجرم کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' وکیل استغاثہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آبجیکشن اوور رولڈ...... فہیم صاحب! آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔'' جج نے انہیں بات کرنے کی اجازت دے دی۔

''ٹھیک یور آنر! میں یہ نہیں کہتا کہ یہ شخص مجرم نہیں ہے۔ نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ اسے سزا نہیں ملنی چاہیے۔ اسے اس کے جرائم کی سزا ضرور دی جائے لیکن آج کے قاتل کو سامنے رکھ کر نہیں' اُس نو سال کے بچے کو ساتھ رکھ کر۔ جرم تو اس نے اب کیے ہیں لیکن بنیاد تو بہت پہلے رکھ دی گئی تھی اور بنیاد اس نے خود نہیں رکھی تھی۔ معاشرے نے رکھی تھی۔ پھر اس نے خود اپنے آپ کو قانون کے حوالے کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ابھی انسانیت زندہ ہے۔ یہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے اور یقیناً ایک بہتر انسان بننے کا خواہش مند ہے۔ اس لیے میری آپ سے گزارش ہے کہ ملزم غیاث کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس کے جرائم کا فیصلہ کیا جائے۔'' وکیل صفائی فہیم حسن بات ختم کر کے اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئے۔ عدالت میں گہری خاموشی طاری تھی۔ اتنی خاموشی کہ سوئی گرتی تو اس کی بھی صدا آتی۔ صرف ریڈر کی انگلیاں ٹائپ رائٹر پر چل رہی تھیں۔ اس سناٹے میں جج کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔

''ملزم غیاث نے اگرچہ بارہ افراد قتل کیے لیکن ان سب کی وجوہات اپنے بیان میں لکھوا دی ہیں جو کہ ٹھوس اور حتمی ہیں۔ اس سب کے باوجود قتل جیسے جرم میں ملوث ہونے کی وجہ سے وہ سزا سے بچ نہیں سکتے۔ اسے اس جرم کی پاداش میں چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی جاتی ہے۔''

جج کے منہ سے آخری الفاظ ادا ہوئے تھے اور مسز جلال کی آنکھیں برسنے لگیں۔ ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ کلیجہ جیسے کٹ کٹ کر آنکھوں کے رستے باہر آنے لگا۔ وہ تیزی سے بھیڑ کو چیرتی غیاث کی طرف بڑھی تھیں جو سر جھکائے دو سپاہیوں کے ہمراہ کٹہرے سے نکل کر عدالت سے باہر جا رہا تھا۔

''غازی......'' تڑپتی مچلتی آواز پر غیاث کے قدم ٹھٹک کر رُک گئے۔ اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔ ماں اُس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھا تھا اور ماں کے ناتواں بازوؤں کے حصار میں سمٹ گیا تھا۔ ملک معظم' اماں اور ماہ نور بھی ان کے پاس آ گئے تھے۔

مسز جلال غیاث کو بانہوں میں چھپائے سسک سسک کر رو رہی تھیں اور وہ اونچا لمبا شخص پوری دنیا کے لیے جس کا نام دہشت کی علامت تھا۔ نو سال کا بچہ گیا تھا' وہی غازی بن گیا تھا جو ماں کو روتے دیکھ کر آنسو بہانے لگ جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ماں کے مہربان سینے کی گہرائیوں میں گم ہو رہے تھے۔

''ماں...... ماں...... ایسا مت کریں...... میرا صبر جواب دے جائے گا...... میرا حوصلہ ٹوٹ جائے گا۔''

''غازی...... تم...... تم کیا صرف انتظار کرنے اور انتظار دینے کے لیے آئے تھے۔ دم پروردگار کیا چاہتا ہے ہم سے......؟ کب ختم ہوں گی یہ آزمائشیں؟'' انہیں کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ دونوں کچھ دیر یونہی ایک دوسرے میں سمٹے روتے رہے۔ ملک معظم نے آگے بڑھ کر غیاث کو کندھے سے پکڑ کر الگ کیا اور پھر اسے گلے سے لگا لیا۔

''غازی! تم فکرمند نہ ہونا...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہاری خیر خبر رکھیں گے۔'' ملک معظم نے کہا۔

''ارے یار! دل کیوں چھوٹا کرتے ہو! چودہ سال کی سزا میں دن اور رات شمار کر کے سات سال بنتے ہیں۔ قیدی کا گڈ ریکارڈ دیکھ کر اس سزا میں تخفیف بھی ہو سکتی ہے۔ پانچ چھ سال کوئی اتنی بڑی مدت تو نہیں۔'' فہیم حسن نے جیسے انہیں حوصلہ دیا۔

ملک معظم کے بعد وہ شہسوار سے گلے ملا تھا۔ اس کا دل اپنے چھوٹے بھائی کی محبت سے معمور ہو گیا۔ آنکھیں لاکھ ضبط کے باوجود چھلک پڑیں۔

''بھائی! جب تک آپ سب سے ملا نہیں تھا۔ میرے لیے یہ سزا کاٹنی مشکل نہیں تھی۔ میں تو باہر بھی سزا ہی کاٹ رہا تھا۔ سو میرے لیے ایک برابر تھا لیکن اب...... اب ایک ایک لمحہ مشکل سے کٹے گا بھائی...... اب یہ سزا بہت طویل' بہت صبر آزما ہو گی میرے لیے۔ یہی اذیت ضمیر کا بوجھ کم کرے گی۔''

''ہاں غازی! میں جانتا ہوں یہ وقت تمہارے لیے بھی اور ہمارے لیے صبر آزما ہو گا لیکن یہ سزا بھگت کر جب تم باہر آؤ گے تو صرف ہمارے غازی ہو گے۔ اُجلے اُجلے' کسی جرم کی سیاہی تمہارے دامن پر نہیں ہو گی۔ کسی گناہ کا بوجھ تمہارے ضمیر پر نہیں ہو گا۔'' ملک معظم کے لہجے میں محبت بھری تسلی تھی۔

''غازی بھائی! میں جلدی جلدی ملنے آیا کروں گا آپ سے۔'' شہسوار نے آگے بڑھ کر غیاث کا بازو تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے سینکڑوں چراغ جل اُٹھے۔ غیاث ابھی تک مسز

جلال کو بازو کے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔

''ماما...... آپ گھر چلیں۔ مطمئن رہیے گا۔ بالکل اُداس نہ ہوئیے گا جہاں پندرہ سال انتظار میں کاٹے ہیں کچھ عرصہ اور سہی۔ کم سے کم آپ کو یہ شرمندگی تو نہیں ہو گی ناں اور آپ کا بیٹا مجرم ہے' قصوروار ہے۔ اپنی غلطیوں کی سزا بھوگ کر آؤں گا تو سر اُٹھا کر جی سکوں گا۔ آپ بس میرے لیے دعا کیجیے گا کہ یہ صبر آزما وقت آپ کی محبت کے سہارے کاٹ سکوں۔'' مسز جلال نے پلکوں پر اٹکے آنسو صاف کیے۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ تھاما اور اس کی پیشانی چوم لی۔ غیاث کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے رُخ موڑ کر دوسری جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ شاید وہ انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ سبھی نے باری باری اُسے گلے سے لگایا تھا۔ ملک معظم وکیل کے ہمراہ آگے بڑھ گئے۔ شہسوار' مسز جلال' اور اماں نے ان کے پیچھے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ غیاث آگے بڑھنے لگا تھا کہ یکدم اس کا ہاتھ نرم مس لمس سے آشنا ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ماہ نور اس کے قریب کھڑی تھی اُسے پلٹتا دیکھ کر ماہ نور نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''غازی...... سب کو ہی آپ نے حوصلہ دیا۔ سب کو انتظار کا کہا۔ میرے لیے آپ کے پاس کوئی لفظ نہیں۔ میرے ساتھ آپ نے کوئی بات نہیں کی۔'' وہ سر جھکائے آہستہ آواز میں کہہ رہی تھی۔ غیاث کے لبوں پہ جاندار سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تنہائیاں اُداسیاں نہ سجا سکوں کبھی جسم و جاں کے مزار پر
نہ دیئے جلیں میری آنکھ میں مجھے اتنی سخت سزا نہ دے
میرے ساتھ چلنے کے شوق میں بڑی دھوپ سر پہ اُٹھائے گا
ترا ناک نقش ہے موم کا کہیں غم کی آگ گھلا نہ دے''

گمبھیر لہجے میں وہ جیسے اسے سرزنش کر رہا تھا۔ انتظار کی تمازت سے ڈرا رہا تھا۔

''غیاث صاحب! کبھی کبھی موم نظر آنے والے بڑے سخت جان ثابت ہوتے ہیں۔ انتظار عذاب جاں سہی لیکن دل کی راحت کا سامان بھی ہے اور محبت کا انتظار تو زندگی کے آخری لمحوں تک کیا جاتا ہے۔ پھر یہ تو کوئی مدت ہی نہیں۔''

''نور...... تم نے میری تنہائی کے اس سفر کو آسان کر دیا۔ کیا میں یہ امید رکھوں کہ مقدر کی سیاہ رات کے بعد جب سویرا ہو گا تو صبح کی پہلی کرن میرے درِ دل پر تمہارے نام کی دستک بن کر اُترے گی؟ کیا میں یقین رکھوں کہ آزادی کا پہلا سانس لیتے ہوئے تمہاری محبت کا احساس بھی میری رگ و پے میں اُترے گا؟'' غیاث گہری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں لو دیتے جذبے ماہ نور کے چہرے پر گلال بکھیر گئے۔ اُس نے محجوب سی ہو کر پلکیں جھکا لیں۔

’’چلیں بھئی...... ہمارے انتظار میں نور بھی شامل ہو گئیں۔‘‘ ملک معظم کی شوخ سی آواز پر دونوں نے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں شرارت بھرے اُن دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ غیاث اور ماہ نور دونوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ غیاث نے سپاہیوں کے ہمراہ قدم آگے بڑھا دیئے اور ماہ نور ملک معظم کے ہمراہ چل پڑی۔

ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہوتا ہے

☆...... ......☆............☆

سطر سطر سسپنس اور ہر صفحے پر بکھرے ہوئے تحیر و اسرار نئے رنگ

ساحر جمیل سید کا شاہکار ناول

سیاہ دھند

(شائع ہو گیا ہے)

قیمت 200/ روپے

تحیر و اسرار کی دھند میں لپٹی ایک ایسی کہانی جو آپ کو مدتوں یاد رہے گی

سیاہ دھند — وہ ستاروں کی چالیں دیکھ کر خود چلتا تھا۔

سیاہ دھند — ہاتھوں کی لکیروں میں وہ مستقبل کی جھلک دیکھ لیتا تھا۔

سیاہ دھند — علم قیافہ میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ چہرے دیکھ کر وہ انسان کی فطرت جان لیتا تھا۔

سیاہ دھند — نفسیات کا ماہر اور فلسفہ میں یکتا۔

سیاہ دھند — ایک ایسے شخص کی کہانی جو ہپناٹزم، مسمریزم، تھاٹ ریڈنگ اور پامسٹری کا ماہر تھا۔

سیاہ دھند — ایک ایسی کہانی جس میں آپ کو سیاہ علوم کا فلسفہ بھی ملے گا اور حسن و عشق کی چاشنی بھی۔

سیاہ دھند — ایک ایسی کہانی جو آپ پر سوچوں کے نئے در کھولے گی۔

آفتاب پبلیکیشنز
کمرہ نمبر 4 فرسٹ فلور، راجپوت مارکیٹ
اردو بازار لاہور
Aftabpublication@hotmail.com
Ph:7311965